غلو في الدين

حقیقت - اسباب اور صورتیں

مؤلف

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی ومہتمم الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم، بنگلور

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

نام کتاب : غلو فی الدین حقیقت - اسباب اور صورتیں

مصنف : حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم
بانی ومہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم ، بنگلور
وخلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

صفحات : ۴۵۸

تاریخ طباعت : صفر المظفر ۱۴۳۷ھ مطابق دسمبر ۲۰۱۵ء

ناشر : مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

موبائل نمبر : 9036701512 \ 9634307336

ای۔میل : maktabahmaseehulummat@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اقتبــــاس

”اگر عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا بنالیا، تو اسی غلو کے سبب بنایا، اگر یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا، تو اسی غلو کی بلا سے قرار دیا، اگر مشرکینِ عرب یا دیگر اہلِ کفر و شرک نے بتوں کی عبادت کا سلسلہ جاری کیا، تو اسی غلو کا نتیجہ تھا، اگر بعض فرقوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت کو خدائی کے مقام تک بڑھایا تھا، تو اسی غلو کی کرشمہ سازی تھی، اگر لوگ ولیوں و شہیدوں کو حاجت روا و مشکل کشا سمجھتے اور ان سے اپنی حاجت کا سوال کرتے اور مشکل کشائی کی گزارش کرتے ہیں، تو اسی غلو کے مرض کا اثر ہے، اگر اہل اللہ کی مزارات پر طواف و سجدے کیے جاتے ہیں، تو اسی غلو کی دَین ہے، اگر خوارج نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو کافر قرار دیا، تو اسی غلو کے زیر اثر تھا، اگر ”قدریہ“ و ”جبریہ“ فرقوں نے مسئلۂ تقدیر میں بندے کی قدرت کے بارے میں دو متقابل راستے اختیار کیے تھے، تو غلو ہی اس کا بھی سبب تھا، اگر ”مجسمہ“ و ”معطلہ“ فرقوں نے خدا کی ہستی کے بارے میں جسمیت و تعطیل کے دو متضاد نقاطِ نظر اختیار کیے تھے، تو اس کا باعث بھی یہی غلو تھا۔ اہلِ بیت کرام و ائمہ عظام کے بارے میں

اہلِ تشیع کا عقیدۂ عصمت اور ان ہی کے بارے میں ناصبیوں نے کفر و فسق کے فتوے لگائے تھے، تو وہاں بھی یہی غلو کار فرما تھا۔ الحاصل ہر بدعت و گمراہی و بدعقیدگی و بد عملی کے پیچھے غور کیا جائے، تو اس کا اصل سبب و باعث یہی غلو فی الدین نظر آتا ہے۔

لہٰذا اسلام نے غلو سے سختی سے منع کر دیا؛ تا کہ یہ غلو اگرچہ کہ بہت معمولی لگتا ہو اور لوگ اس کو کچھ زیادہ اہمیت نہ دیتے ہوں؛ مگر یہ انسان کو صراطِ مستقیم سے بہت دور کر دیتا ہے؛ لہٰذا ہر قسم کے غلو سے اسلام نے منع کر دیا۔‘‘

فہرس

تقریظات اکابر

حضرت مولانا ابوالقاسم صاحب نعمانی دامت برکاتہم

شیخ الحدیث مفتی سعید احمد صاحب پالن پور دامت برکاتہم

ادیب شہیر حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی دامت برکاتہم

حضرت مولانا عقیل الرحمان صاحب دامت برکاتہم

حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی صاحب دامت برکاتہم

حضرت مفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی دامت برکاتہم

حضرت مولانا سلمان الحسینی ندوی صاحب دامت برکاتہم

حضرت مولانا محمد انور صاحب گنگوہی دامت برکاتہم

شیخ الحدیث حضرت وسیم احمد صاحب دامت برکاتہم

التقریظ

عالم ربانی حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب دامت برکاتہم
(مہتمم دارالعلوم دیوبند)

''غلو فی الدین- حقیقت- اسباب اور صورتیں'' یہ نام ہے حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم کے تازہ علمی شاہکار کا، حضرت مفتی صاحب ان باتوفیق علمائے کرام میں سے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے بہ یک وقت، متنوع علمی و دینی خدمات کے لیے منتخب فرمالیا ہے۔

چناں چہ ''الجامعة الإسلامية مسيح العلوم ،بنگلور'' جیسے ادارے کے منصبِ اہتمام کی ذمے داریوں کے ساتھ تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی برابر جاری رہتا ہے، ان کے قلم سے اب تک اردو اور عربی میں متعدد کتابیں، مختلف فقہی و علمی موضوعات پر تیار ہو کر اہلِ علم کے درمیان مقبولیت حاصل کرچکی ہیں، پیشِ نظر کتاب بھی ایک اہم موضوع ''غلو فی الدین'' سے متعلق ہے؛ بلاشبہ غلو فی الدین وہ فکری و عملی بیماری ہے، جس کے نتیجے میں انسان صراطِ مستقیم سے ہٹ کر مختلف قسم کی کجروی اور بدعملی کا شکار ہو جاتا ہے۔

مفتی صاحب نے اس کتاب میں غلو فی الدین کی حقیقت، اس کے اسباب اور اس کی صورتوں کے تعارف کے سلسلے میں سیر حاصل گفتگو کی ہے اور آخر میں اس کے تدارک اور علاج کے سلسلے میں بھی اظہارِ رائے فرمایا ہے۔

امید ہے کہ یہ کتاب بھی، مؤلف محترم کی دیگر تصانیف کی طرح، اہلِ علم سے دادِ قبول حاصل کرے گی اور ملت کو اس سے خوب خوب نفع پہنچے گا۔

ابوالقاسم نعمانی غفرلہ

التقریظ

محدثِ کبیر استاذ الاساتذہ حضرت مفتی **سعید احمد** صاحب پالن پوری
دامت برکاتہم
(شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند)

بسم اللہ توکلت علی اللہ

''غلو فی الدین'' حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب، مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور کی وقیع کتاب ہے۔ ''غلو'': مصدر ہے، اس کے لغوی معنے ہیں: حد سے زیادہ ہو جانا اور مبالغہ کرنا۔ دین: عقائد و اعمال کے مجموعے کا نام ہے۔ اور غلو کے اصطلاحی معنے ہیں: افراط و تفریط اور کمی و زیادتی۔ دین مکمل ہے، اس میں دونوں کی گنجائش نہیں، دونوں سے دین کا حلیہ بگڑ جاتا ہے؛ مگر لوگ باز کہاں آتے ہیں! افراط و تفریط میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس سے گمراہ فرقے وجود میں آتے ہیں اور آتے رہتے ہیں، نبوی پیشین گوئی کے مطابق ان کی تعداد بے حد ہو جاتی ہے، پس ضروری ہے کہ امت کو دین کی حدود سے واقف کیا جائے اور غلو فی الدین کے منفی پہلو سے امت کو آشنا کیا جائے؛ تاکہ لوگ صراطِ مستقیم پر گامزن رہیں، اس سے نہ ہٹیں۔ ارشادِ پاک ہے:

﴿ وأن هذا صراطي مستقيماً فاتبعوه ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله ذلكم وصاكم به لعلكم تتقون﴾ (یہ دین میرا راستہ ہے، جو بالکل سیدھا ہے، پس اس کی پیروی کرو اور دیگر راہوں پر مت چلو، وہ تمھیں اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گے، یہ تمھیں تاکیدی حکم دیا جاتا ہے؛ تاکہ تم غلط راہوں پر نہ پڑ جاؤ۔

اسلام میں اہلِ سنت والجماعت کا طریقہ ہی اللہ کا سیدھا راستہ ہے، غیرِ اسلام اور گمراہ فرقوں کی راہیں اللہ کا راستہ نہیں ہیں، وہ ان کی اپنی راہیں ہیں، جن کا منتہی دوزخ ہے، حدیث میں ہے کہ بہتر فرقے جہنم رسید ہوں گے؛ کیوں کہ وہ جس راہ پر گامزن ہیں، وہ راہ جنت تک نہیں پہنچتی؛ اس لیے ہر مسلمان کو چھان بین کر کے اہلِ سنت والجماعت کی راہ اپنانی چاہیے۔

اس کے بعد جاننا چاہیے کہ اسلام کے مزاج میں اعتدال ہے اور ''غلو'' اعتدال کے منافی ہے اور عقائد کی خرابی، اعمال کی خرابی سے ناشی ہوتی ہے، جس طرح عملِ صالح سے ایمان کو جلا ملتی ہے، اسی طرح اعتدال سے ہٹے ہوئے اعمال سے- اگر چہ وہ اعمال صالحہ ہوں- ایمان کو گھن لگ جاتا ہے اور وہ دن بہ دن کمزور ہوتا جاتا ہے؛ تا آں کہ وہ دائرۂ ایمان سے بالکل نکل جاتا ہے۔ جیسے قادیانی، غالی شیعہ اور منکرینِ حدیث وغیرہ فرقے حدود پار کر گئے ہیں اور ان کا اسلام سے کچھ تعلق باقی نہیں رہا اور اسلامی فرقے اور جماعتیں اگر چہ حدود میں ہیں؛ مگر ان کا اپنے عقائد و اعمال میں غلو، کسی دن ان کے لیے وبالِ جان بھی بن سکتا ہے، مصنف نے ایسے فرقوں اور جماعتوں کے غلو پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

میں نے یہ کتاب پوری پڑھی ہے، اس میں کوئی بات حد اعتدال سے ہٹی ہوئی نہیں ہے، اس میں تبلیغی جماعت کے غلو کا بھی بیان ہے اور مصنف مد ظلہ کو شاید اسی وجہ سے کتاب کی اشاعت میں تردد تھا اور شاید اسی وجہ سے انھوں نے چاہا کہ میں اسے طباعت سے پہلے پڑھوں؛ چناں چہ میں نے اس کو پڑھا اور بہ نظرِ غائر پڑھا، مجھے کتاب میں کوئی بات خلافِ واقعہ نظر نہیں آئی اور اپنوں کی غلطی اپنے بتائیں؛ یہ اس سے بہتر ہے کہ پرائے پکڑیں! اس لیے میری ناقص رائے میں اس کتاب کو ضرور شائع ہونا چاہیے، اس سے اصلاح کی امید ہے۔

یہاں ایک سوال ہے کہ جماعت کا غلو جماعت کے بڑوں کو سمجھانا چاہیے، اس کو پبلک کے سامنے نہیں رکھنا چاہیے، اس کا جواب یہ ہے کہ پانی سر سے گذر گیا ہے، اب جماعت کے عوام وخواص" أنا أنا ولا غيري "کے زعم میں مبتلا ہو گئے ہیں؛ پس جب بات خواص تک محدود نہیں رہی، تو قضیہ عوام کے سامنے رکھنا ضروری ہے، شاید اتر جائے لوگوں کے دل میں مصنف کی بات؛ اور درد پنہاں کا مداوا ہو جائے، والسلام۔

کتبہ

سعید احمد غفرلہ پالن پوری

خادم دار العلوم دیوبند

۱۵/۷/۱۴۳۵ھ

عالم جلیل، ادیب شہیر، ممتاز صاحبِ قلم:

حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب دامت برکاتہم

(رئیس التحریر: "مجلۃ الداعی" واستاذ ادب عربی دار العلوم دیوبند)

کا

"غلو فی الدین"

پر محققانہ تبصرہ اور صاحبِ کتاب کو دادِ تحسین و مبارک باد

کرناٹک کے صدر مقام "بنگلور" کے مشہور و معتبر مدرسہ "جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم" کے بانی و مہتمم جناب مولانا مفتی شعیب اللہ خان مفتاحی مدظلہ کی گراں مایہ وضخیم تصنیف "غلو فی الدین: حقیقت، اسباب اور صورتیں" کے تفصیلی مطالعے سے یہ راقم بہرہ ور ہوا۔ کتاب کے قیمتی مشمولات اور اس کی طباعت و ظاہری شکل و صورت، کاغذ کی عمدگی اور مجموعی اشاعتی ہنر مندی نے متاثر کیا۔ عموماً علمائے دین کی دینی موضوعات پر شائع شدہ کاوشیں اردو زبان میں عصرِ حاضر میں برتی جانے والی املائی خوبیوں اور علامتوں سے بے نیاز ہوتی ہیں؛ موصوف کی اس کتاب میں ان خوبیوں اور علامتوں کو برتنے کی خاصی کوشش کی گئی ہے، جس سے اس راقم کو ذاتی طور پر بہت خوشی ہوئی؛ کیوں کہ یہ ان کے استعمال کا قول و عمل سے ہمیشہ داعی رہا ہے۔

حضرت مولانا مفتی شعیب اللہ خان صاحب علوم شریعت کے علمائے ماہرین میں شمار ہوتے ہیں، اسی کے ساتھ وہ صاحبِ حال و قال، صالح عالم و مفتی ہیں۔ جنوب

کے علاقے کے مسلمانوں میں انہیں بڑی مقبولیت ومحبوبیت حاصل ہے اور عوام کا ان کی طرف رجوع عام ہے۔ انہوں نے عربی اور اردو میں اسلامی موضوعات پر چھوٹی اور بڑی متعدد کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، جو وقت کی ضرورت ہونے کی وجہ سے عوام وخواص میں بے حد مقبول ہیں۔ ان کی تصنیفات ان کی علمی گیرائی وگہرائی، شرعی بصیرت، فقہی ادراک، دینی فہم اور اسلامی غیرت کی غماز ہیں۔ ان کی تحریریں ان کی سنجیدہ شخصیت، متوازن طبیعت، دینی رسوخ اور استقامتِ فکر کا عکس جمیل ہے۔ وہ جو کچھ سوچتے اور لکھتے ہیں، اس میں امت کی بہی خواہی، ہم دردی اور اس کی اصلاح کا جذبۂ بے پناہ ہر ہر سطر میں کارفرما نظر آتا ہے۔ آج تحریر وتالیف اور ابلاغ ودعایہ کا زمانہ ہے۔ شہرت ونام وری وجاہ طلبی کی خواہش سے شاید و باید ہی کوئی خالی نظر آتا ہے۔ علما وصلحا کا طبقہ بھی اس فتنے سے مغلوب نظر آتا ہے؛ اس لیے تحریر وتقریر کا سیلِ بے پناہ امت کی اصلاحِ حال میں کوئی کردار نہیں ادا کر پاتا۔ مولانا شعیب اللہ خاں جیسے چنیدہ علما اپنے کردار وگفتار کی روشنی میں اس فتنے سے محفوظ محسوس ہوتے ہیں؛ اسی لیے وہ جو کچھ کہتے اور لکھتے ہیں اس میں برکت وتاثیر ونافعیت ہے؛ لہٰذا وہ مقبولِ عام ہے۔

اس سے قبل بھی ان کی کئی کتابیں راقم نے پڑھی ہیں، جن میں متعلقہ موضوعات پر بھرپور مواد ومعلومات کے ساتھ نہ صرف مذکورہ بالا خوبیاں نظر آئیں؛ بل کہ اردو زبان کی چاشنی بھی محسوس ہوئی اور ایسا لگا کہ یہ کتابیں محض لسانی حس سے عاری کسی مولویانہ قلم کی تخلیق نہیں؛ بل کہ کسی بیدار مغز اور شعور زبان کے حامل عالم اہل قلم کا نتیجۂ فکر ہیں۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے بہ خوبی واضح ہے، غلو فی الدین کی حقیقت، اس کی تعریف اور عمل میں آنے والی اس کی صورتوں اور مصداقوں کو بتانے کے لیے لکھی گئی

ہے۔ کتاب کے از اول تا آخر مطالعے سے محسوس ہوا کہ مصنف نے واقعی موضوع کا حق ادا کیا ہے اور موضوع کے متعلقات کے کماحقہ مطالعہ کے بعد کتاب لکھی ہے۔ حال آں کہ یہ کتاب علمی موضوع کی حامل ہے، جس کی بنیاد ہی مطلوبہ معلومات کی فراوانی پر ہے؛ لیکن زبان کی سادگی، بات کو پیش کرنے میں منطقی ترتیب وسہولت اور عام مسلمانوں کے فہم کے معیار کو سامنے رکھنے کی وجہ سے یہ عوام کی کتاب بھی بن گئی ہے، کوئی بھی عام پڑھا لکھا آدمی اس کے مشمولات سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور علما اور اہلِ علم ودانش پڑھیں گے، تو انھیں بڑی آسانی محسوس ہوگی۔

کتاب کے شروع میں آٹھ بڑے بڑے علما کی تقریظات ہیں، جنھوں نے کتاب، مؤلفِ کتاب اور کتاب کے مضامین کو سراہا ہے اور مؤلف کو اتنی اچھی کتاب لکھنے پر مبارک باد دینے کے ساتھ پرخلوص دعا دی ہے۔

کتاب چھ فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں غلو کی تعریف کی گئی ہے اور اس کا لغوی وشرعی مفہوم بتایا گیا ہے؛ دوسری فصل میں غلو فی الدین کی حرمت کو قرآن وحدیث کی روشنی میں اجاگر کیا گیا ہے؛ تیسری فصل میں تاریخِ مذاہب میں غلو کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی پر گفتگو کی گئی ہے؛ چوتھی فصل میں غلو فی الدین کے اسباب پر بحث کی گئی ہے، جس میں جہالت اور اس کی فتنہ انگیزی، جاہلی تعصب اور اس کی خطرناکی، عقل پرستی اور اس کے نتائجِ بد، تقلیدِ آبا اور مروّجہ عاداتِ دیرینہ کی پیروی وغیرہ پر سیر حاصل گفتگو شامل ہے؛ پانچویں فصل میں غلو فی الدین کی قسمیں یعنی غلو فی العقیدہ اور غلو فی العمل کو بیان کیا گیا ہے؛ چھٹی فصل میں دین میں غلو کی مختلف صورتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

اس کتاب کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں مذکورہ بنیادی بحثوں کے ضمن میں بہت سی جماعتوں، تنظیموں اور فرقوں کی خامیوں یا شر انگیزیوں کی بھی بصیرت مندانہ نشان

دہی اور عالمانہ ردّیا مخلصانہ اصلاح کی تدبیر بروے کار آ گئی ہے، جو خاصے کی چیز ہے۔ توقع ہے اس سے ان جماعتوں سے وابستہ افراد کی اصلاح روبہ عمل آنے کی راہ ہم وار ہوگی اور شر انگیز فرقوں کے شرور وفتن سے بچاؤ یا ان کی ہدایت کی راہ بھی ان شاء اللہ پیدا ہوگی۔ جو جماعتیں اور تنظیمیں دین ودعوت کا کام کر رہی ہیں، وہ بھی اپنا محاسبہ کرنے اور اپنے اندر راہ پا جانے والی خرابیوں کو دور کرنے پر مجبور ہوں گی۔ مثلاً ص ۱۱۸ تا ۱۲۰ پر ''تبلیغی جماعت'' کی جن کوتاہیوں کی طرف ہم دردانہ اشارہ کیا گیا ہے، توقع ہے کہ وہ اپنی ثمر آوری کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے انہیں دور کرنے کی کوشش کرے گی۔ ص ۱۱۶-۱۱۷ پر بے جا تعصب کی وجہ سے ''تبلیغی جماعت'' کو گم راہ ثابت کرنے کی جو کوشش کی جاتی ہے، اس کتاب میں اس کے عالمانہ رد کی وجہ سے تعصب پیشہ افراد اور گروہوں کی ان شاء اللہ ہدایت ہوگی۔ اسی طرح ص ۱۳۱ تا ۱۳۵ پر ''ہویٰ پرستی'' کے بیان کے ضمن میں اہلِ بدعت کا مدلل رد بھی مذکور ہوگیا ہے، جو چشم کشا بھی ہے اور بصیرت افروز بھی۔ ص ۱۳۵ تا ۱۴۳ پر غیر مقلدین کی کج بحثی وہ کج روی کا عالمانہ جواب آ گیا ہے؛ کیوں کہ وہ بھی ہوا پرستی کی وجہ سے احکامِ شرعیہ کو اپنے نفس کے تابع بنا لیتے ہیں اور ائمۂ کرام کی تقلید کو حرام قرار دے کر اپنے خیال میں دین وشریعت پر عمل کرتے ہیں اور قرآن وحدیث کے نصوص کی من مانی تاویلیں کرتے ہیں۔ ص ۲۱۰ تا ۲۱۲ پر ''تفریط'' کی بحث کے تحت غیر مقلدین کی طرف سے ائمۂ کرام کی توہین اور ان کی تقلید کو شرک اور کفر قرار دینے کا مدلل رد مذکور ہوا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ غیر مقلدین بھی مختلف حوالوں سے کسی نہ کسی کی تقلید ہی کرتے ہیں، جیسے احادیث کی صحت وضعف کے سلسلے میں محدثین کی تقلید کرتے ہیں۔

تفریطی غلو کے ضمن میں مدارسِ اسلامیہ سے معاندانہ سلوک رکھنے والوں کی ص ۲۱۵ تا ۲۳۸ پر نشان دہی کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ ان میں دو قسم کے لوگ ہیں، کچھ

تو وہ ہیں جو مغربی تہذیب وتمدن سے مرعوبیت کی حد تک متاثر ہیں اور دوسرے قسم کے لوگوں کا تعلق اسلام دشمن مغربی طاقتوں سے ہے، جو ہمیشہ اسلام کی بیخ کنی کے درپے رہتے ہیں، مدارسِ اسلامیہ چوں کہ اسلام کی بقاو حفاظت کا ذریعہ ہیں؛ اس لیے اسلام دشمن طاقتیں مدارس کی شبیہ کو بگاڑنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائے رہتی ہیں۔ اس سلسلے میں مختصراً مدارس کے اکتسابات اور کارناموں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور مدارس کے تعلق سے ممتاز حقیقت پسند اسلامی دانش وروں کی آرا بھی ذکر کی گئی ہیں اور مغرب زدہ مسلمانوں کی طرف سے مدارس کے خلاف پیدا کیے گئے شبہات کا بھی تشفی بخش جواب دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں جو کچھ بھی تحریر کیا گیا ہے، وہ بہت خوب ہے اور ہر مسلمان کے مطالعے کے لائق ہے۔ کتاب اللہ اور رجال اللہ میں تفریق اور ان دونوں میں سے ایک کو ماننے اور دوسرے کا انکار کرنے سے جو فتنہ پیدا ہوا، اس کے تحت ص۲۸۲ سے ۲۲۸ تک منکرینِ حدیث اور ان کی حماقتوں وگم راہیوں کو مفصل طور پر ذکر کر کے عقلی اور نقلی طور پر اس کا مسکت جواب دیا گیا ہے۔ یہ بحث بھی بڑی پرمغز اور مزے دار ہے، ہر ایسے مسلمان کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے، جس کے دماغ کے کسی گوشے میں یہ خناس بھرا ہوا ہے کہ قرآن پاک جو نصِ قطعی ہے، اس کے بعد حدیث کی جو نص ظنی ہے کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟ منکرین حدیث نے اصطلاحاتِ شرعیہ سے کس طرح کھلواڑ کیا ہے؟ اس کے کئی نمونے مؤلف نے پیش کیے ہیں۔ اسی ضمن میں قادیانیوں کی ختم نبوت میں تحریف پر بھی مختصراً لیکن جامع بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اصطلاحاتِ شرعیہ مفاہیم کی تبدیلی کفر اور ناقابلِ معافی جرم ہے۔

الغرض! یہ کتاب اپنے مرکزی موضوع غلو فی الدین کے سلسلے میں کافی اور شافی ومکمل ومدلل بحث کے ساتھ ساتھ غلو فی الدین کے بہت سارے دُوررس نتائج واثرات

سے بحث کرتی ہے اور بنیادی موضوع کا حق ادا کرتے ہوئے بہت سے متعلقہ ذیلی موضوعات کا بھی خوب صورت نتیجہ خیز اور معلومات افزا انداز میں احاطہ کرتی ہے۔

مصنف کی دیگر نفع بخش اور گراں قدر کتابوں میں یہ کتاب اپنی افادیت، جامعیت اور انتہائی ضروری موضوع یعنی غلو فی الدین پر ہونے کی وجہ سے جو بے شمار بے اعتدالیوں، گمراہیوں، کج رویوں کا ذریعہ بنتی ہے؛ ممتاز اضافہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مصنف کے لیے اس کو دنیا میں ہر طرح کی بھلائی اور حسنِ تذکرہ و دعا کا اور آخرت میں نتائج اور ترقی درجات کا ذریعہ بنائے۔

نور عالم خلیل امینی

استاذ ادب عربی ورئیس التحریر الداعی عربی دار العلوم دیوبند

۵ ½ بجے شام بروز یک شنبہ

۵/شعبان ۱۴۳۶ھ - ۲۴/مئی ۲۰۱۵ء

التقریظ

نمونۂ اسلاف حضرت مولانا عقیل الرحمان صاحب دامت برکاتہم

(استاذِ حدیث جامعہ مفتاح العلوم جلال آباد، یو پی)

الحمد لله و كفى و سلام على عباده الذين اصطفى أما بعد:

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿و كذلك جعلناكم أمة وسطاً لتكونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيداً﴾ (البقرۃ: ۱۴۳)

(اور ہم نے اسی طرح تم کو بالکل درمیانی امت بنایا ہے؛ تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔)

حضرت مجدد تھانوی نور اللہ مرقدہ، اس آیت کا ماقبل سے ربط بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''قبولِ احکامِ شرعیہ میں جس چیز کو صراطِ مستقیم فرمایا گیا ہے، چوں کہ جماعتِ محمدیہ نے اس کو بے چوں و چرا اختیار کرلیا؛ اس لیے آیت آئندہ کے آغاز پر بہ طورِ جملۂ معترضہ اس جماعت کی مدح وفضیلت بیان فرماتے ہیں۔''

عبارتِ مذکورہ سے ایک تو یہ بات معلوم ہوئی کہ صراط مستقیم پر چلنے کا یہ عظیم صلہ ملا کہ گذشتہ امتوں کے حق میں اس امت کو شہید اور گواہ بنایا گیا؛ پھر اس کے صلے میں ''امتِ وسط'' کا بھی اس کو تمغہ ملا اور ''وسط'' نام بالکل درمیانی چیز کا ہے،: وہ خط جو کسی سطح پر بالکل بیچ میں ہو کہ اس خط سے داہنی اور بائیں جانب دو خط کھینچے جائیں، تو مقدار میں بالکل برابر ہوں، ایسے بیچ کو ''وسط'' کہتے ہیں، وسطیت کا نام ہی عدل واعتدال ہے ﴿إنما يأمركم بالعدل﴾ میں اسی عدل کا حکم کیا گیا ہے، اس حدِ اعتدال سے آگے بڑھنا افراط ہے اور پیچھے رہ جانا تفریط ہے، اسی افراط وتفریط کا نام

’’غلو فی الدین‘‘ ہے؛ گو عام محاورے میں غلو افراط کو کہا جاتا ہے۔

بندے کو یہ علم تو تھا کہ مکرم و محترم مولانا شعیب اللہ صاحب بنگلوری (فاضل مفتاح العلوم) تدریس وافتا کے ساتھ مصنف بھی ہیں کہ ان کے رسائل اور کتابیں بہ طور ہدیہ، بندے کے پاس آتی رہتی تھیں اور بندہ حسب فرصت ان کا مطالعہ بھی کرتا تھا؛ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مولانا کا قلم معتدل ہونے ساتھ گہرائی اور گیرائی کو بھی لیے ہوئے ہوتا ہے۔

بندہ کا جب بنگلور کا سفر ہوتا تھا، تو بعض احباب سے معلوم ہوتا تھا کہ افتا کے سلسلے میں عامۃ المسلمین کا رجوع مولانا کی طرف ہوتا ہے، جس سے بندے کو اس لیے بھی مسرت ہوتی تھی کہ مفتاح العلوم کا ایک فاضل اُس مقام پر فائز ہے، جس کو سر کرنا اس زمانۂ حریت اور مطلق العنانی میں محال نہیں؛ تو مشکل ترین ضرور ہے، مسلکِ تھانوی جو اپنے اعتدال اور گیرائی و گہرائی میں مشہور عام وخاص ہے؛ مولانا اس کے سچے ترجمان ہیں؛ پھر مولانا نے ایک اور چھلانگ لگائی اور لسانِ عربی میں بھی آپ کی وقیع تصنیف شائع ہوئی، اس کے مطالعے سے بھی معلوم ہوا کہ مولانا معتدل اہلِ حق کے مسلک پر ہی جمے ہوئے ہیں؛ ورنہ بعض اوقات ایسا مقبول آدمی اس کا مصداق ہوجاتا ہے۔ كما قال مولانا الرومي:

او جو بیند خلق را سر مشت خویش
از تکبر می رود از دوست خویش

چند روز قبل مولانا جلال آباد تشریف لائے اور اپنی وقیع تصنیف: ’’غلو فی الدین: حقیقت، اسباب اور صورتیں‘‘ کا مسودہ بندے کے سپرد کیا اور دبی زبان سے یہ بھی فرمایا کہ اس پر بہ طور تقریظ کچھ لکھ دیا جائے۔ حضرت والا مولانا مسیح اللہ خان صاحب نور اللہ مرقدہ خلیفۂ خاص حضرت مجدد تھانوی نور اللہ مرقدہ، مہتمم اول مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد کے طرز پر، بندہ کسی تصنیف پر تقریظ یا پیش لفظ لکھنے سے

احتراز کرتا تھا، اول تو اس لیے کہ تقریظ کے لیے جس علم وفہم کی ضرورت ہے، بندہ خود کو اس سے عاری پاتا ہے، دوم اس لیے کہ آفتاب آمد دلیل آفتاب؛ اگر کتاب لائق استفادہ ہے، تو اہلِ نظر خود اس کی وقعت جان لیں گے؛ ورنہ مردہ سہارا دینے سے کہیں کھڑا ہو سکتا ہے؟ لیکن مولانا کی وہ دبی فرمائش نے بندے پر یہ اثر کیا کہ اسی دن سے وقت ملنے پر مسودے کا مطالعہ شروع کر دیا، جس عنوان کو پڑھتا تھا بے ساختہ قلب کہتا تھا:

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

اور صرف زورِ قلم ہی نہیں حقیقت رسی بھی۔

مولانا نے بڑی جاں فشانی سے امتِ مسلمہ کے حالات کا مطالعہ فرمایا اور بارہ عنوان قائم کر کے غلو کے جتنے طبقات ہیں، ان کا بہت عمدہ معتدل قلم سے جائزہ لیا ہے، غلو کی تحقیق میں ایک مبسوط تمہید لکھی، جس میں غلو کی حقیقتِ لغویہ اور شرعیہ کو واضح فرمایا گیا ہے، پھر بہ طور تتمہ اور خلاصے کے غلو کے چھ سبب آخر میں بیان کیے، جس میں پوری کتاب کا مطمحِ نظر سامنے آجاتا ہے۔

بندے نے غلو فی الدین کے بارے میں اب تک ایسی جامع اور مستند تصنیف نہیں دیکھی، حق تعالیٰ مولانا کی کاوش کو درجۂ قبولیت عطا فرمائیں اور امت کو بہ نظرِ انصاف اس سے بھرپور استفادے کی توفیق عطا فرمائیں۔

تمام مسودے کا مطالعہ تو اپنے مشاغل تدریسی کی وجہ سے نہیں کر سکا؛ مگر نصف سے کچھ کم حصے کا پورا مطالعہ کیا اور پھر ہر جگہ نظر ڈالی، ماشاء اللہ تعالیٰ ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کا مصداق پایا، و آخر دعوانا الحمد للہ رب العالمین.

کتبہ العبد عقیل الرحمان

خادم حدیث وافتا جامعہ مفتاح العلوم جلال آباد، ضلع شاملی، یوپی، الہند

مؤرخہ: ۲۳/ جمادی الأخری/ ۱۴۳۵ھ: موافق ۲۴/ اپریل/ ۲۰۱۴ء

التقريظ

قدوۃ العلماء حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی صاحب دامت برکاتہم

(صدر مسلم پرسنل لاء بورڈ و ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

الحمد لله رب العالمين، والصلوٰة والسلام علىٰ سيد المرسلين وخاتم النبيين محمد بن عبدالله الأمين، وعلىٰ آله وصحبه أجمعين، ومن تبعهم بإحسان، ودعا بدعوتهم إلىٰ يوم الدين، وبعد:

اسلام کو اللہ تعالیٰ نے ''دینِ وسط'' قرار دیا ہے، ''وسط'' سے مراد اعلیٰ معیار کے بھی ہوتے ہیں اور درمیانی اور معتدل معیار کے بھی، یہ دونوں خصوصیتیں اسلام میں دوسرے ادیان کے مقابلے میں اللہ رب العزت کی طرف سے رکھی گئی ہیں اور اس کی بنیادی خصوصیات میں شمار کی جاتی ہیں، اعتدال ہر چیز میں اچھے اثرات اور اچھے نتائج پیدا کرتا ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے ''خیر الأمور أوساطها'' ہمارے علمائے کرام اور مجتہدینِ عظام نے شریعت کی خصوصیات کی وضاحت میں اس پہلو کو مدنظر رکھا ہے اور اس کے سبب یہ دین اپنی صحیح حالت پر قائم ہے، درمیان درمیان میں اس میں ایسی تحریکیں پیدا ہوئیں، جو دین کو اس کے اعتدال سے ہٹانے کا باعث ہو سکتی تھیں؛ لیکن دین کی صفتِ وسطیت کو ضروری سمجھنے والے حضرات نے ان کو پھیلنے اور عام ہونے نہیں دیا؛ لیکن ایسی تحریکیں اور اقدامات پیش آتے رہے، جو دراصل مبالغہ پسند ذہنوں کی پیداوار ہوتے ہیں، ان کی یہ مبالغہ پسندی دین کے بعض بنیادی مسئلوں میں غلو اختیار کر لینے کی وجہ سے ہوتی ہے، جس

کے نتیجے میں عقائد کے اندر بھی غلو پیدا کرنے کی کوششیں سامنے آئیں اور ان سے فرقِ باطلہ بنے۔ عقائد میں غلو کا عمل کسی عقائدی مسئلے میں ہوا، تو اس کو اپنی جگہ سے ہٹادینے کا سبب بنا، چناں چہ فرقِ باطلہ میں شمار کیے جانے کے لائق ہو گیا۔

اس طرح تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے مزاج میں غلو پسندی کا بھی رجحان ہوتا ہے؛ یہ رجحان جب زور پکڑتا ہے، تو دین کی وسطیت اور اعتدال پسندی متاثر ہوجاتی ہے؛ یہ ایک ایسی خرابی ہے کہ اگر اس کا تدارک نہ کیا جائے تو دین کو بہت زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے۔ قرآنِ مجید میں جگہ جگہ دین کی اس وسطیت پر توجہ دلائی گئی ہے اور غلو سے بچایا گیا ہے، حدیث شریف میں بھی متعدد جگہوں پر غلو سے منع کیا گیا ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ تین صحابی آپ کے یہاں حاضر ہوئے تھے اور ہر ایک اپنے عمل میں غلو کا ارادہ کر رہا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " لن يشاد الدين أحد إلا غلبه "(جس نے بھی دین میں شدت اختیار کیا، تو دین ہی اس پر غالب ہوا) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ کے ذریعے نمونہ پیش کیا، لہٰذا علمائے امت کی ذمے داری بنتی ہے کہ غلو کے ہر پہلو پر نظر رکھیں اور دین کو اس خطرے سے بچائیں۔

جناب مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی، جو ایک بڑے عالمِ دین اور بنگلور میں علومِ دینیہ واصلاحِ امت کا کام انجام دے رہے ہیں اور کئی اہم علمی کتابوں کے مصنف ہیں، انھوں نے غلو کے مسئلے پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کا قرآن وحدیث کی روشنی میں جائزہ لیا ہے اور بے اعتدالیوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کی مناسب وضاحت کی ہے، اس طرح یہ کتاب "غلو فی

الدین، حقیقت، اسباب، صورتیں" بہت مفید اور اصلاح پسند مقصد کی حامل ہوگئی ہے، اس کو دیکھ کر دین کی حفاظت کا جو سلسلہ قائم ہے، یہ کتاب بھی اس سلسلے کی اہم کڑی بنتی ہے، ہم اس تحقیقی اور اصلاحی عمل کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کرتے ہیں اور اس کی افادیت کی امید کرتے ہیں۔

محمد رابع حسنی ندوی
۲۷/شعبان/۱۴۳۵ھ مطابق ۲۶/جون/۲۰۱۴ء
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

التقريظ

حضرت مولانا مفتی محمد حبیب الرحمان صاحب خیر آبادی دامت برکاتہم
(صدر مفتی دارالعلوم دیوبند)

الحمد لله رب العالمين ، والصلوٰة والسلام علىٰ سيدالأنبياء و المرسلين ، وعلىٰ آله و صحبه أجمعين ، أمابعد :

دنیا میں ہر انصاف پسند افراط وتفریط کو ناپسند ----اور اعتدال کو ہر شخص پسند کرتا ہے، جہاں کسی چیز میں افراط وتفریط آیا یا غلو آیا، وہیں اختلاف، لڑائی جھگڑے، پارٹی بندی شروع ہو جاتی ہے،عقائد میں بگاڑ آ جاتا ہے، یہاں تک کہ لوگ ہلاکت کے گڑھوں میں جا گرتے ہیں۔جس قدر انبیائے کرام اور عقلا و حکما دنیا میں تشریف لائے، اعتدال اور میانہ روی کو پسند کیا اور اس کی تعلیم دی اور غلو فی الدین کو مذموم بتایا۔قرآنِ پاک میں بھی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا﴿قل يا أهل الكتٰب لا تغلو في دينكم غير الحق﴾اور کہیں اس طرح فرمایا﴿يا أهل الكتٰب لا تغلو في دينكم و لا تقولوا علىٰ الله إلا الحق﴾ کہیں ارشاد فرمایا﴿ تلك حدود الله فلا تعتدوها﴾.

خود نبیٔ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بھی غلو سے بچنے کی ہدایت فرمائی ہے،ارشاد نبوی ہے:"يا أيها الناس ! إياكم والغلوفي الدين، فإنه أهلك من كان قبلكم الغلو في الدين" (ابن ماجہ)ایک جگہ ارشاد ہے" إلاهلك المتنطعون".

ان آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ سے صاف پتا چلتا ہے کہ اعتدال سے ہٹنا اور دین میں غلو اختیار کرنا امت کی ہلاکت و بربادی کا ذریعہ ہے،آج دین کا کام کرنے

والوں میں، مختلف شعبوں میں، مختلف حیثیتوں سے غلو پیدا ہو گیا ہے اور معاملہ اتنا آگے بڑھ چکا ہے کہ جاہلوں نے دین کے بعض شعبوں پر ایسا تسلط جمالیا ہے کہ وہ دین کے ٹھیکیدار اور جنت و دوزخ کے ٹھیکیدار بن گئے ہیں، جوامت میں انتشار وافتراق کا باعث بن گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے حضرت مولانا محمد شعیب اللہ خان صاحب کو کہ انھوں نے اس اہم اور ضروری موضوع پر قلم اٹھایا اور بڑی احتیاط کے ساتھ صراطِ مستقیم کے طریقہ کار کو اجاگر کیا اور افراط وتفریط اور غلو فی الدین کے نظریے کی خوب بیخ کنی کی، اللہ ان کو بہت بہت جزائے خیر عطا فرمائے، انھوں نے امت کی صحیح نبض پکڑی اور ان کی رشد وہدایت اور ان کی اصلاحِ باطن کی طرف صحیح رہنمائی فرمائی۔ اگر یہ کتاب تعصب کی عینک اتار کر، اعتدال اور صراطِ مستقیم کی عینک لگا کر پڑھی گئی، تو قوی امید ہے کہ امت کے اندر سے آدھا بگاڑ ختم ہو جائے گا اور لوگ اعتدال کی صحیح، صاف اور سیدھی سڑک پر آ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ مصنف موصوف کی اس کاوش کو قبول فرمائے اور امتِ مسلمہ کی ہدایت کا ذریعہ بنائے، آمین۔

حبیب الرحمٰن خیر آبادی عفا اللہ عنہ

مفتی دارالعلوم دیوبند

۲۳؍شعبان ۱۴۳۵ھ

التقریظ

علامہ جلیل حضرت مولانا سید سلمان الحسینی ندوی صاحب دامت برکاتہم

(استاذِ تفسیر و حدیث دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ)

الحمدللّٰہ رب العالمین ، والصلوٰۃ و السلام علیٰ سید المرسلین و خاتم النبیین و بعد:

اسلام اللہ کا ازلی اور ابدی دین ہے، یہ اللہ کی بندگی کے نظام کا اصطلاحی نام ہے، اللہ عادل و منصف ہے، اس کا نظام بھی عادلانہ اور منصفانہ ہے، عدل حقوق کی صحیح بنیادوں پر ادائیگی کا نام ہے، معاملات میں افراط وتفریط ظلم ہے، عدل اس کے بالکل مقابل ہے۔

اسلام میں اعتقادی، فکری، نظریاتی، اخلاقی، معاشرتی، معاملاتی اور دیگر تمام شعبہ ہائے حیات میں افراط وتفریط کی گنجائش نہیں ہے، اس کے عادلانہ نظام میں ترازو کی صحیح تول کا حکم ہے۔ اس نے اپنے راستے کو درمیانی راستہ قرار دیا ہے؛ یہی صراطِ مستقیم ہے؛ یہی سواء السبیل ہے؛ یہی دینِ قیم ہے۔

اس نظام کے اختیار کرنے اور اس کے نفاذ کی جدوجہد کرنے کے لیے جس امت کو تیار کیا گیا، اس کو درمیانی امت کہا گیا۔

﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا ﴾ (البَقَرَة :۱۴۳)

آخری نبی حضرت محمد ﷺ کا جس مقام سے انتخاب فرمایا گیا اور جہاں سے انسانی قافلے کے سالار حضرت آدم علیہ السلام نے جس نظام عبودیت کا روئے زمیں پر آغاز کیا تھا، اس کو درمیانی مقام قرار دیا گیا، جو آباد دنیا کے بیچ میں

واقع ہے۔

درمیانی مرکز سے، درمیانی نظام، درمیانی امت کو سونپا گیا اور سستی کاہلی، کسلمندی، غفلت، نکمے پن اور تفریط وتقصیر کی جہاں ممانعت فرمائی گئی، وہیں شدت، تعدی، زیادتی، ظلم اور غلو، افراط اور انتہاپسندی سے منع کیا گیا۔

افراط وتفریط کی ان دوانتہاؤں یا دونوں کناروں کے بیچ میں رہنے کا حکم دیا گیا ہے: "القصد، القصد تبلغوا" (بخاری:۶۴۶۳)

"سددوا وقاربوا" (ترمذی:۲۱۴۱)

اسلام کی وسطیت، اس کے اعتدال اور اس کی میانہ روی کا ہر حال میں خیال رکھنا چاہیے؛ لیکن اس کا ادراک ہر شخص کے بس میں نہیں، اس کے لیے وسیع النظر، عالی دماغ، کشادہ دل، متکلم فقیہ کی ضرورت ہے۔

مجھے بڑی مسرت ہے کہ مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان مفتاحی نے اس خلا کو پر کیا ہے، ان کی کتاب "غلو فی الدین حقیقت، اسباب، صورتیں" نہ صرف دینی انتہا پسندی، مزاجی تشدد اور افراط کی شکلوں کی نشاندہی کرتی ہے؛ بل کہ اسلام کی وسطیت اور اعتدال کا روشن مینار بھی تعمیر کرتی ہے۔

انھوں نے غلو (حدود سے تجاوز اور تشدد وزیادتی) کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے مذاہب میں انتہاپسندی کی تاریخ کا جائزہ بھی لیا ہے، اس کے اسباب پر بحث کی ہے، اس کے انواع واقسام کا تذکرہ کیا ہے اور اس کی مختلف صورتوں کو بھی واضح فرمایا ہے۔

اسلام کی وسطیت کا تقاضہ تھا کہ دوسری انتہاپسندی کا بھی جو تفریط وتقصیر کی شکل میں سامنے آتی ہے، جائزہ لیا جائے اور انبیائے عظام، صحابۂ کرام، اولیائے محترمین، علمائے مکرمین اور دینی مدارس اور اداروں وجماعتوں کے ساتھ تفریط کی انتہاپسندانہ

شکلوں کونمایاں کیا جائے۔

مولانا نے بدعت کی حقیقت کو بھی سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ دینی احکام میں ترجیحات اوران کی صحیح ترتیب، کتاب اللہ اور رجال اللہ میں تفریق، شریعت کے ظاہر و باطن کی حقیقت، منصوص وغیر منصوص میں فرق، وسائل ومقاصد کی تمیز، مختلف دینی کاموں اور دینی شعبوں کے درمیان ربط وتعلق، متشابہات سے گریز، اصطلاحاتِ شرعیہ کی رعایت، مسلکی اختلافات کی اخلاقیات اور وسعت قلبی، تشدد کے مظاہر اور الہام وخواب وکشف کی حقیقت، جیسے موضوعات پر بڑی مبصرانہ، فقیہانہ اور دردمندانہ گفتگو کی ہے۔

جدید تعلیم یافتہ حضرات اور عام اردو قارئین کے علاوہ یہ مباحث طلبائے مدارس کے لیے بڑے چشم کشا اور بصیرت افروز ہیں، ذمے دارانِ مدارس کی خدمت میں عرض ہے کہ اس کتاب کو طلبائے مدارس کے مطالعے کے کورس میں داخل کریں اور آج کے اس دورِ انتشار میں، افراط وتفریط میں مبتلا امت کے لیے صراطِ مستقیم کے نشانات روشن کردیں۔

دست بہ دعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا محترم زیدت امجادہ کی اس کوشش کو قبول فرمائے اور اس سے امت کو زیادہ سے زیادہ مستفید فرمائے۔ آمین

سید سلمان الحسینی ندوی
استاذ تفسیر وحدیث دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ

التقریظ

منبع العلوم حضرت مولانا **محمد انور** صاحب گنگوہی دامت برکاتہم

الحمد لله رب العالمين ، والصلوٰة و السلام علىٰ سيد الأنبياء والمرسلين ، وعلىٰ آله وصحبه أجمعين ، أما بعد :

حامداً ومصلياً ، أما بعد:

عزیزِ مکرم ''جناب مولانا مفتی شعیب اللہ صاحب مفتاحی زید کرمہٗ'' ایک مشہور ومعروف، سلیم الطبع ، جید الاستعداد عالمِ دین ہیں، جومحتاجِ تعارف نہیں، مدرسہ مسیح العلوم، بنگلور کی بنا ،اس کا اہتمام وانتظام ،اصلاحی وارشادی بیانات وخطابات، علمیات ،عملیات ،دینیات واخلاقیات وغیرہ موضوعات پر تصنیف و تالیف کی بے شمار نمایاں خدمات ہی آپ کا تعارف ہے۔اسی سلسلۂ تصنیف کی ایک کڑی ''غلو فی الدین'' آپ کے ہاتھوں میں ہے،جس میں موصوف نے نہایت خوش اسلوبی، تحقیق ووضاحت اور وثوق واعتماد کے ساتھ مضامین جمع کیے ہیں، جن کی خوبی اور افادیت کا اندازہ ،مطالعے سے ہی ہوسکتا ہے،قلتِ فرصت کی وجہ سے بندہ بالاستیعاب تو مطالعہ نہیں کرسکا؛البتہ چیدہ چیدہ مقامات میں سے جہاں سے بھی، جس مضمون کو پڑھا دل باغ باغ ہوگیا!اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ !اللھم زد فزد!

امتِ مسلمہ کے عوام وخواص کا معاشرہ اور معاملہ غلو فی الدین کے سلسلے میں انتہائی افسوس ناک مرحلے تک پہنچا ہوا ہے، اس موضوع پر ایسی کتاب کی اشد ضرورت تھی،حق تعالیٰ شانہ جزائے خیر دے موصوف کو کہ انھوں نے اس پر قلم اٹھا کر

امتِ مسلمہ پر ایک احسانِ عظیم فرمایا۔ خداوندِ قدوس موصوف کی اس کاوشِ عملی؛ نیز دیگر جملہ خدماتِ علمیہ و دینیہ کو بے حد، بے حد قبول فرمائے، پوری امتِ مسلمہ کے لیے نافع و مفید بنائے، مزید کام کرتے رہنے کی توفیق بخشے۔ آمین۔

محمد انور گنگوہی

۲۷؍ رجب ۱۴۳۵ھ

التقريظ

محدثِ جلیل حضرت مولانا وسیم احمد صاحب دامت برکاتہم

(شیخ الحدیث اشرف العلوم، گنگوہ، یو پی)

الحمد لله و كفىٰ و سلام علىٰ عباده الذين اصطفىٰ . أما بعد:

عزیز محترم جناب مولانا مفتی شعیب اللہ سلمہ وحفظہ اللہ نے تازہ ترین تالیف کا مسودہ ارسال فرمایا، بندہ اپنی علالت اور مسلسل بیماری کی وجہ سے بالاستیعاب تو نہ دیکھ سکا؛ البتہ جستہ جستہ مقامات دیکھ کر بہت خوشی ہوئی؛ کیوں کہ غلو فی الدین ایسی مہلک بیماری ہے، جس سے اہلِ کتاب اور امت کا ایک بڑا طبقہ برباد ہوا؛ اسی لیے قرآن و حدیث میں اس کی بڑی مذمت بیان کی گئی ہے، ''امام بخاری رحمہ اللہ'' نے بھی اس کی قباحت سے باخبر کیا ہے اور ''شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ'' نے تو مختلف کتب میں اس کی مذمت بیان کی ہے، موجودہ دور میں خواص اور عوام اس میں مبتلا ہو کر بدعات کا شکار ہو رہے ہیں؛ اس لیے اس موضوع پر کتاب کی اشد ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ مؤلف کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے بروقت کتاب لکھ کر امت پر احسانِ عظیم فرمایا ہے، مؤلفِ کتاب کثیر التصانیف مؤلف ہیں، جن کے قلم سے مختلف موضوعات پر مشتمل کتب منظرِ عام پر آ کر مقبولِ خواص وعوام ہو چکی ہیں؛ اس لیے یہ کتاب محتاجِ تعارف نہیں ہے، جو کچھ لکھا وہ تعمیلِ حکم میں لکھ دیا ہے، بندہ دل سے دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی دیگر تصنیفات کی طرح قبول فرمائے اور مزید خدمات کی توفیق نصیب فرمائے اور ہمارے لیے صدقۂ جاریہ بنائے۔ والسلام۔

وسیم احمد غفرلہ -- ۲۱/شعبان ۱۴۳۵ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ، وَ الصَّلَاۃُ وَ السَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ ، وَ عَلٰی آلِہٖ وَ صَحْبِہٖ أَجْمَعِیْنَ ، أَمَّا بَعْدُ :

اربابِ علم و اصحابِ دانش سے پوشیدہ نہیں کہ مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ ہر دور میں اہلِ اسلام کے اندر سوءِ اعتقاد و فسادِ عمل کے جراثیم مختلف وجوہات واسباب کی بنا پر پھیلتے رہے ہیں، کبھی حکومت وشہنشاہیت کے کروفر اور قانون وطاقت کی وجہ سے ایسا ہوا، تو کبھی عجمی و یونانی علوم وفنون نے یہ صورتِ حال پیدا کردی، کبھی غیر اقوام کے ساتھ آزادانہ اختلاط اس کا سبب بنا، تو کبھی قومی یا ملکی رسومات ورواجات نے اپنا اثر ڈالا، کبھی فاتح قوموں کی تہذیب وتمدن اس کا باعث ہوا، تو کبھی نئے نئے فلسفوں اور ازموں کے غلبے نے اپنا اثر دکھایا اور دین میں رخنے ڈالنے اور اس کی اصلی وحقیقی صورت سے اس کو ہٹانے کا کام انجام دیا اور کبھی " غلو في الدين " کے خطرناک جراثیم نے روحانیت کے لحاظ سے بیمار ذہنیتوں کو اس حال میں پہنچا دیا کہ انھوں نے کلام اللہ کی تحریف اور دین کے حلیے کو بگاڑنے کا کام وسیع پیمانے پر کیا۔ اس طرح مختلف اسباب و بواعث کے نتیجے میں گزشتہ ادوار میں متعدد قوموں نے "راہِ استقامت" کو چھوڑ دیا تھا۔

اور ان اسباب میں سے آج کے دور میں خاص طور پر "غلو فی الدین" کی بیماری نے ایسی ہی صورتِ حال پیدا کردی ہے اور یہ مرض آج ایک وبائے عام کی شکل

اختیار کر گیا ہے، جس کی وجہ سے شرعی حدود پامال ہوتے اور مختلف قسم کے غیر شرعی امور جنم لیتے اور پھیلتے جارہے ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زیادہ تر بدعات و خرافات کی پیداوار بھی اسی ''غلو فی الدین'' کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ امت میں بگاڑ کے اسباب میں سے اہم اور بڑا اسبب یہ ''غلو فی الدین'' ہے۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ ''غلو فی الدین'' کی بیماری اگر چہ کہ جہلا اور بے دین قسم کے لوگوں میں بھی ہوتی ہے؛ مگر زیادہ تر ان لوگوں میں ہوتی ہے، جو دین دار کہلاتے یا دین سے وابستہ ہونے کے مدعی ہوتے ہیں اور ان میں افراد بھی شامل ہیں اور جماعتیں بھی، طبقات بھی داخل ہیں اور فرقے بھی اور اسی لیے اس راہ سے آنے والا بگاڑ گہرائی و گیرائی دونوں طریقوں سے، امت میں بڑے پیمانے پر پھیل جاتا اور لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

یہ صورتِ حال اس بات کی متقاضی تھی کہ قرآن و حدیث اور اقوالِ صحابہ و ائمہ و علما کی روشنی میں ''غلو فی الدین'' کی حقیقت و ماہیت، اس کی مذمت و ممانعت، اس کے اسباب و بواعث؛ نیز اس کی مختلف صورتیں وغیرہ بیان کر کے امت کو اس سے بچنے و بچانے کی تلقین و تعلیم کی جائے۔

راقم الحروف کے لیے اس موضوع پر لکھنے کی تقریب یوں ہوئی کہ مجھے اپنے ایک رسالے ''امت میں اعتقادی و عملی بگاڑ اور علمائے امت کی ذمے داری'' پر نظرِ ثانی کے درمیان بعض مواقع پر اس میں ترمیمات و اضافات کی نوبت آئی اور اضافہ کرتے ہوئے امت میں بگاڑ کے اسباب میں ''غلو فی الدین'' پر بھی بحث آ گئی، جو وہاں ایک ضمنی بحث ہونے کی حیثیت سے نہایت اختصار سے لکھی گئی۔ جب اس سے فراغت ہوئی تو معاً یہ خیال، ایک داعیہ بن کر دل و دماغ پر مسلط ہو گیا کہ ''غلو فی الدین'' کی اس بحث کو ذرا توضیح و تفصیل سے اور مدلل انداز سے لکھا جائے؛

کیوں کہ یہ موضوع امت کے موجودہ احوال وکوائف کے پسِ منظر میں نہایت اہم و ضروری ہے۔

زیرنظر یہ تحریر اسی خیال و داعیے کی مرہونِ منت ہے، جوالحمد للہ تعالیٰ مختصر سے وقت میں تیار ہوگئی، جو آپ کے ہاتھوں میں کتابی شکل میں موجود ہے۔

امید ہے کہ اہلِ دین حضرات اس میں پیش کردہ امور پر غور کریں گے اور خود کو بھی اور دیگر لوگوں کو بھی، اس ''غلو فی الدین'' کی برائی سے باز رکھنے کی فکر و کوشش کریں گے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس تحریر کو نافع و مفید اور لوگوں کے لیے باعثِ ہدایت اور میرے لیے سامانِ نجات بنائے، آمین۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان

جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

۱۲؍صفر المظفر ؍۱۴۳۵ہجری

۱۶؍دسمبر؍۲۰۱۳، میلادی

غلو کی تعریف اور حقیقت

"غلو" کی لغوی وشرعی تعریف

دینِ اسلام اور امتِ مسلمہ کی خصوصیت: اعتدال وتوسط

"غلو فی الدین" کی حقیقت، صراطِ مستقیم سے انحراف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلی فصل

''غلو'' کی تعریف اور حقیقت

''غلو'' کی لغوی وشرعی تعریف

غلو فی الدین کے بارے میں سب سے پہلے یہ معلوم کیجیے کہ عربی زبان میں ''غلو'' کی تعریف کیا ہے اور شریعت میں اس کی حقیقت کیا ہے؟

''غلو'' کے معنے لغتِ عرب میں ''حد سے تجاوز'' کر جانے کے ہیں اور جب اس کو شرعی زبان میں استعمال کیا جاتا ہے، تو اس کے معنے یہ ہیں کہ شریعت میں کسی چیز کی جو حد مقرر ہے، اس سے نکل جائے۔

امام اللغۃ علامہ ابن فارس رحمہ اللہ نے لکھا ہے :

" الغين ، واللام ، والحرف المعتل أصل صحيح يدل على ارتفاع ، و مجاوزة قدر ، يُقَالُ: غلا السعرُ يغلُو غلاءً ، وذلک ارتفاعه ، و غلا الرجل في الأمر غلواً إذا جَاوَزَ حَدَّه ، و غَلا بسَهمِه غلواً ، إذا رمى به سهماً أقصىٰ غايته ".

(غین اور لام اور حرفِ علت ''واؤ'' عربی میں اصل صحیح ہے، جو بلند ہونے اور مقدارِ مقررہ سے تجاوز پر دلالت کرتی ہے، چناں چہ کہا جاتا ہے: غلا السعر يغلو غلواً (قیمت بڑھ گئی) یہ قیمت کا بلند ہونا ہے

اور کہا جاتا ہے: غلا الرجل في الأمر غلواً (آدمی اپنے معاملے میں آگے بڑھ گیا) یہ اس وقت بولتے ہیں، جب وہ اپنی حد سے بڑھ جائے اور کہا جاتا ہے: غلا بسهمه غلواً (اس نے اپنا تیر دور پھینکا) یہ اس وقت بولتے ہیں، جب اس نے اپنا تیر بہت دور پھینک دیا ہو)۔"(۱)

امام ابو بکر الجصاص رازی رحمہ اللہ نے "أحکام القرآن" میں غلو کی تعریف یہ بیان کی ہے:

"الغلو في الدين هو مجاوزة حد الحق فيه"

(دین میں غلو یہ ہے کہ جس چیز کی جو حد مقرر ہے اس سے نکل جائے۔)(۲)

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"غلو، حد سے تجاوز کرنا ہے اس طرح کہ کسی کی تعریف میں یا مذمت میں اس کے استحقاق سے زیادتی کردی جائے۔"(۳)

حضرت مولانا عبد الماجد دریابادی رحمہ اللہ اپنی "تفسیر ماجدی" میں "غلو" کی تعریف میں لکھتے ہیں:

"دین میں غلو کرنا یہی ہے کہ عقائد و مسائل میں اضافہ و افراط کو اپنی طرف سے دخل دے دیا جائے۔"(۴)

---

(۱) مقاییس اللغة:۳۸۷/۴

(۲) أحکام القرآن:۲۸۲/۳

(۳) اقتضاء الصراط المستقیم:۲۸۹/۱

(۴) تفسیر ماجدی:۸۳۸/۱

اور مفسرِ قرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللہُ ''غلو'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''غلو کے معنی حد سے نکل جانے کے ہیں، دین میں غلو کا مطلب یہ ہے کہ اعتقاد و عمل میں دین نے جو حدود مقرر کی ہیں، ان سے آگے بڑھ جائیں۔ مثلاً انبیا کی تعظیم کی حد یہ ہے کہ ان کو خلقِ خدا میں سب سے افضل جانے، اس حد سے آگے بڑھ کر ان ہی کو خدا یا خدا کا بیٹا کہہ دینا ''اعتقادی غلو'' ہے۔''(۱)

الحاصل شریعت نے جس چیز کی جو حد مقرر کر دی، اس میں آگے بڑھنا اور اس حدِ شرعی کو پھلانگنا ''غلو فی الدین'' ہے، خواہ وہ عقائد کا باب ہو یا مسائلِ فرعیہ کا باب ہو، پھر یہ مسائل خواہ عبادات سے متعلق ہوں یا معاشرت و تمدن سے تعلق رکھتے ہوں، اخلاق و کردار کے بارے میں ہوں یا معاملات و اقتصادیات سے منسلک ہوں، سیاست و امارت کے سلسلے میں ہوں یا حدود و تعزیرات سے تعلق رکھتے ہوں، کسی باب میں بھی حدودِ شرعیہ کو پھلانگنا اور ان سے آگے بڑھنا، غلو کی حقیقت ہے۔

جب یہ سمجھ میں آ گیا، تو اب قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے، جس میں ہر چیز کی حد مقرر ہے، خواہ وہ عقیدہ ہو یا عبادت ہو، یا حقوق و آداب ہوں یا معاشرت و تہذیب ہو یا اخلاق و کردار ہو، تمام ابواب میں اللہ و رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی بیان کردہ حدیں مقرر ہیں، جن سے تجاوز کرنا ناجائز ہے۔

چناں چہ قرآن میں ہے:

﴿ تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلاَ تَعْتَدُوْھَا وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَأُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ (البقرۃ: ۲۲۹)

---

(۱) معارف القرآن: ۳/۲۱۰-۲۱۱

(یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں؛ لہٰذا ان کو نہ پھلانگنا اور جو بھی اللہ کی حدوں کو پھلانگتا ہے، تو ایسے لوگ ہی ظالم ہیں۔)

الغرض دینِ اسلام میں ہر چیز و ہر حکم و قانون، ایک مقررہ حدو معیار کے ساتھ ہے اور یہی درحقیقت اس کی خوبی و کمال ہے؛ یہاں کوئی بات بے ڈھنگی، غیر مرتب اور غیر معتدل نہیں ہے؛ بل کہ غور کریں تو واضح ہوگا کہ اس کی ہر چیز اپنے ایک حدو اصول کے ساتھ ہے؛ لہٰذا ان حدود و قیود کو باقی رکھنا لازم و ضروری ہے؛ تاکہ اس کا حسن و جمال علی وجہ التمام و الکمال باقی و دائم رہے اور اس کی رونق پر کوئی حرف نہ آئے؛ اسی لیے اسلام میں ان حدود و قیود، شرائط و طرق کو پامال کرنا اور ان سے تجاوز کرنا حرام و ناجائز قرار دیا گیا ہے اور اسی تجاوز کا نام ''غلو فی الدین'' ہے۔

دینِ اسلام اور امتِ مسلمہ کی خصوصیت
''اعتدال و توسط''

اصل بات یہ ہے کہ غلو فی الدین مزاجِ اسلام کے خلاف ہے؛ کیوں کہ اسلام وہ مذہب ہے، جس نے ہر موقعے پر اور اپنی تمام تر تعلیمات و احکامات میں اعتدال و توسط کو ملحوظ رکھا ہے، اس میں نہ افراط ہے، نہ تفریط، نہ کمی ہے نہ زیادتی؛ بل کہ وہ ان سب بے اعتدالیوں سے پاک، نہایت معتدل مذہب ہے؛ اسی لیے اسلام کو ''صراطِ مستقیم'' کہا گیا ہے۔

اور اسی ''صراطِ مستقیم'' پر قائم و دائم رہنے کی دعا بھی ہمیں سکھائی گئی ہے۔ ﴿سُوْرَةُ الْفَاتِحَة﴾ جو درحقیقت دعا ہی کی تعلیم ہے، اس میں یہ دعا سکھائی گئی ہے:

﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ (الفاتحۃ: ۶-۷)

(اے اللہ! ہمیں سیدھی راہ پر چلائیے، ان لوگوں کی راہ جن پر آپ
نے انعام فرمایا، ان کے راستے پر نہیں جن پر غضب ہوا اور نہ ان کے
راستے پر جو گمراہ ہو چکے ہیں۔)

راہِ دین "راہِ مستقیم" ہے، جس کا اس آیت میں سوال ہے، پھر اس راہِ مستقیم کو دو طرح واضح و منقح کیا گیا ہے: ایک تو اس طرح کہ اس کی تشخیص انعام یافتہ بندوں کے راستے کی حیثیت سے کی گئی اور دوسرے اس طرح کہ ﴿مغضوب علیهم﴾ اور ﴿ضالین﴾ کے راستوں سے الگ قرار دیا گیا۔ ﴿مغضوب علیهم﴾ یہود ہیں، جو تفریط و تقصیر کے مرتکب ہوتے تھے اور ﴿ضالین﴾ نصاریٰ ہیں، جو افراط و تعدی کے شکار ہوا کرتے تھے۔ اس طرح یہاں "صراطِ مستقیم" کی تعیین یوں ہوگئی کہ وہ انعام یافتہ لوگوں جیسے حضراتِ انبیا، اولیا، صدیقین و صالحین، مجاہدین و شہدا کا راستہ ہے، نہ یہودیوں کا راستہ ہے جس میں تفریط کے جراثیم ہیں اور نہ عیسائیوں کا جس میں افراط کے عناصر ہیں؛ بل کہ "صراطِ مستقیم" ان دونوں سے پاک وہ راہ ہے، جو اعتدال و توسط کو لیے ہوئے ہے۔

نیز جس طرح اسلام معتدل مذہب ہے، اسی طرح یہ امتِ مسلمہ بھی "امتِ وسط" ہے۔ قرآن کریم میں اس امتِ مرحومہ کو "امتِ وسط" قرا دیا گیا ہے؛ کیوں کہ وہ اس متوسط و معتدل مذہب کی پیرو کار ہے۔

چناں چہ فرمایا گیا ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطاً﴾ (البقرة:۱۴۳)

(اور اسی طرح ہم نے تمھیں "امتِ وسط" بنایا۔)

"امتِ وسط" کے معنی ہیں معتدل امت اور اس کا یہ اعتدال عقائد و نظریات میں بھی ہے اور عبادات و اعمال میں بھی، معاشرت و تمدن میں بھی ہے اور معاملات و

اقتصادیات میں بھی، اخلاق وکردار میں بھی ہے اور سیاست وامارت میں بھی۔
امامِ تفسیر علامہ جریر الطبري رَحِمَہُ اللّٰہُ کہتے ہیں :

" و أنا أرى أن "الوسط" في هذا الموضع ، هو الوسط الذي بمعنى الجزء الذي هو بين الطرفين .... وأرى أن اللّٰه تعالى ذكره إنّما وَصَفَهُم بأنّهُم وَسَطٌ لتَوَسُّطِهِم في الدين ، فلا هُم أهلُ غُلُوٍّ فيه غُلُو النصارى الذين غلوا بالترهب وقيلهم في عيسى -- عَلَيْهِ السَّلَامُ -- ما قالوا فيه ، و لا هُم أهلُ تقصير فيه تقصير اليهود الذين بَدَّلُوا كتابَ اللّٰه ، و قَتَلُوا أنبيائهم ، و كَذَّبُوا على ربهم ، و كَفَرُوا به ، ولكنَّهُم أهلُ توسُّط و اعتدال فيه، فوَصَفَهُمُ اللّٰهُ بذلک ، إذ أحبُّ الأمُور إلى اللّٰه أوسَطُهُم ."

(میرا خیال یہ ہے کہ "وسط" سے اس جگہ پر وہ وسط مراد ہے، جو دوطرفوں کے درمیان جز کے معنی میں ہے ....اور میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالی نے امتِ محمدیہ کو وسط ہونے سے جو موصوف کیا ہے، یہ ان کے دین میں معتدل ہونے کی وجہ سے ہے؛ لہٰذا وہ نہ تو نصاریٰ کی طرح غلو کرنے والے ہیں، جنھوں نے رہبانیت میں اور حضرت عیسیٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ کے شان میں تعریف کرتے ہوئے غلو کیا ہے اور نہ وہ یہود کی طرح تقصیر وکمی کرنے والے ہیں، جنھوں نے اللہ کی کتاب کو بدل ڈالا اور حضراتِ انبیا کو قتل کیا، اپنے رب پر جھوٹ باندھا اور اس کا انکار کیا؛ بل کہ وہ امتِ مرحومہ تو دین کے بارے

میں توسط واعتدال والی ہے؛ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اسی سے اس کو متصف کیا؛ کیوں کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ امور وہ ہیں، جو متوسط ہوں۔)(۱)

اور علامہ شیخ عبد الرحمان بن ناصر السعدی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اسی ''آیتِ وسط'' کی تفسیر میں لکھا ہے :

" فقال : ﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَٰكُمْ أُمَّةً وَسَطاً﴾ أي : عدلاً خياراً ، و ما عدا الوسط فأطراف داخلة تحت الخطر ، فجعل الله هذه الأمة وسطا في كل أمور الدين ، وسطا في الأنبياء بين من غلا فيهم من النصارى و بين من جفاهم كاليهود، بأن آمنوا بهم كلهم على الوجه اللائق بذلك ، و وسطا في الشريعة ، لا تشديدات اليهود ، و آصارهم ، ولا تهاون النصارى . و في باب الطهارة والمطاعم ، لا كاليهود الذين لا تصح لهم صلاة إلا في بيعهم ، وكنائسهم ، و لا يطهرهم الماء من النجاسات ، و قد حرمت عليهم الطيبات عقوبة لهم ، ولا كالنصارى الذين لا ينجسون شيئا ، و لا يحرمون شيئا ، بل أباحوا ما دب ، و درج ؛ بل طهارتهم أكمل طهارة ، و أتمها ، و أباح الله لهم الطيبات من المطاعم ، و المشارب ، والملابس ، والمناكح ، و حرم عليهم الخبائث من ذلك . فلهذه الأمة من الدين أكمله ، و من الأخلاق

(۱) جامع البیان:۳/۱۴۲

أجلها ، و من الأعمال أفضلها ."

(اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اسی طرح ہم نے تم کو امتِ وسط بنایا" یعنی معتدل و بہترین امت بنایا۔ اور وسط و درمیان کے علاوہ جو ہوتا ہے، وہ اس چیز کے اطراف و کنارے ہیں، جو خطرے کے تحت داخل ہوتے ہیں؛ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس امت کو دین کے تمام امور میں درمیانی و معتدل امت بنایا ہے، حضراتِ انبیا کے بارے میں غلو کرنے والے نصاریٰ اور ان کے بارے میں کمی و تقصیر کرنے والے یہود کے درمیان میں یہ امت وسط و معتدل ہے، بایں طور کہ وہ تمام انبیا پر ان کے لائق و مناسب طریقے پر ایمان لاتی ہے اور یہ امت شریعت و احکام میں بھی وسط ہے کہ نہ یہاں یہود کی سی تشدیدات ہیں اور نہ ان کے سے بوجھ اور نہ نصاریٰ کا سا تہاون و لا پروائی اور یہ امت طہارت و کھانے پینے کے باب میں بھی وسط ہے؛ یہود کی طرح نہیں، جن کی نماز ان کی عبادت خانوں ہی میں درست ہوتی ہے اور پانی نجاستوں سے ان کو پاک نہیں کرتا اور ان پر سزا کے طور پر پاکیزہ چیزیں حرام کر دی گئیں اور نہ نصاریٰ کی طرح جن کے ہاں کوئی چیز ناپاک ہی نہیں ہوتی اور نہ وہ کسی چیز کو حرام سمجھتے ہیں؛ بل کہ ہر زندہ و مردہ چیز کو حلال سمجھتے ہیں؛ لیکن امتِ محمدیہ کی طہارت سب سے بڑھ کر کامل و تام ہے اور اللہ نے ان کے لیے کھانے و پینے و پہننے کی چیزوں اور نکاحوں میں سے پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیا اور خبیث و ناپاک چیزوں کو حرام ٹھہرایا؛ لہٰذا اس امت کے لیے کامل دین اور بلند اخلاق اور افضل اعمال ہیں۔(۱)

---

(۱) تفسير السعدي:۱/۷۰

نوٹ: اس توسط و اعتدال کی تفصیل دیکھنا ہو تو ''معارف القرآن رجلد اول'' میں اسی آیت کی تفسیر دیکھیے۔

اور اسلام اور امتِ اسلامیہ میں اعتدال کو خوبی و کمال کیوں قرار دیا گیا ہے؟ اس کو اس طرح سمجھیے کہ اعتدال در حقیقت تناسب و توازن کا نام ہے کہ ہر چیز کمی بیشی ونقصان و زیادتی سے پاک ہو۔ اسی کا نام خوبصورتی ہے کہ اعضا میں تناسب ہو۔ اگر تناسب کے بہ جائے بے اعتدالی ہو، تو اس کو خوبصورتی نہیں، بدصورتی کہا جاتا ہے۔ مثلاً کسی کی ناک بہت لمبی ہو، یا بہت چھوٹی ہو، یا کان بڑے بڑے ہوں، یا بہت چھوٹے ہوں، یا رنگ میں تفاوت ہو، یا کسی کے دانت بڑے بڑے ہوں، یا ہونٹ موٹے موٹے ہوں، یا آنکھیں بہت چھوٹی، یا بہت بڑی ہوں وغیرہ، تو یہ بے اعتدالی انسان کو خوبصورتی سے دور کر دیتی ہے۔

اسی طرح شریعتِ اسلامیہ میں تمام احکامات و تعلیمات نہایت درجے معتدل اور سب اپنی اپنی جگہ فٹ ہیں؛ لہٰذا اس کا کمال اسی میں ہے کہ اس کو اسی صورت پر برقرار رکھا جائے اور اگر اس میں کمی بیشی، یا کوئی تبدیلی و ترمیم کی جائے گی، تو اس کا حسن ختم ہو جائے گا۔

اس کی ایک دوسری مثال حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے یہ بیان کی ہے:

> ''دنیا کے جتنے نئے اور پرانے طریقے جسمانی صحت و علاج کے لیے جاری ہیں: طب یونانی، ویدک، ایلو پیتھک، ہومیو پیتھک وغیرہ، سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ بدن انسانی کی صحت اعتدالِ مزاج سے ہے اور جہاں یہ اعتدال کسی جانب سے خلل پذیر ہوا، وہی بدنِ انسانی کا مرض ہے۔ خصوصاً طب یونانی کا تو بنیادی اصول ہی مزاج کی

پہچان پر موقوف ہے، انسان کا بدن چار اخلاط: خون، بلغم، سودا وصفرا سے مرکب اور ان ہی چاروں اخلاط سے پیدا شدہ چار کیفیات، انسان کے بدن میں ضروری ہیں: گرمی، ٹھنڈک، خشکی وتری۔ جس وقت تک یہ چاروں کیفیات مزاجِ انسانی کے مناسب حدود کے اندر معتدل رہتی ہیں، وہ بدنِ انسانی کی صحت وتندرستی کہلاتی ہے اور جہاں ان میں سے کوئی کیفیت مزاج انسانی کی حد سے زیادہ ہو جائے یا گھٹ جائے وہی مرض ہے اور اگر اس کی اصلاح وعلاج نہ کیا جائے، تو ایک حد میں پہنچ کر وہی موت کا پیام ہو جاتا ہے۔ اس محسوس مثال کے بعد اب روحانیت اور اخلاقیات کی طرف آیئے، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں بھی اعتدالی و بے اعتدالی کا یہی طریقہ جاری ہے، اس کے اعتدال کا نام روحانی صحت اور بے اعتدالی کا نام روحانی و اخلاقی مرض ہے اور اس مرض کا اگر علاج کر کے اعتدال پر نہ لایا جائے، تو اس کا نتیجہ روحانی موت ہے۔"(۱)

ان دونوں مثالوں سے دو باتیں واضح ہوئیں: ایک تو یہ کہ ظاہری خوبصورتی اور باطنی صحت دونوں اعتدال کا نام ہے، جہاں اعتدال رخصت ہوا، وہاں نہ ظاہری خوبصورتی باقی رہتی ہے، نہ باطنی صحت کو بقا ملتا ہے۔

دوسری بات یہ سمجھ میں آ گئی کہ اسلام بھی اسی طرح ایک نہایت معتدل مذہب ہے، جس کی تعلیمات وتلقینات میں کوئی بے اعتدالی نہیں ہے؛ بل کہ ہر حکم اور ہر تعلیم اپنی جگہ اس طرح فٹ ہے کہ اس سے ذرا بھی ہٹ جائے، تو اس کی خوبصورتی وحسن ختم ہو جائے اور اس کی رونق باطل ہو جائے۔

(۱) معارف القرآن: ۱/۳۶۶-۳۶۷

اسی طرح یہ امت بھی معتدل قوم ہے، جس کی خوبصورتی ہی دراصل اس میں پوشیدہ ہے کہ وہ اعتدال وتوسط کی ''صراط مستقیم'' اور ''شاہراہ'' پر قائم رہے؛ ورنہ اس کا سارا حسن و جمال، اس کی ساری خوبی وکمال ختم ورخصت ہو جائے گا اور وہ بد صورت و بدنما قوموں میں شمار ہونے لگے گی۔

اس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ امتِ اسلامیہ کو غلو اور افراط وتفریط اور کمی وزیادتی سے پاک ہونا چاہیے، اسی میں اس کا کمال وخوبصورتی پوشیدہ ہے۔

غلو فی الدین کی حقیقت: ''صراطِ مستقیم'' سے انحراف

یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ دین میں غلو، دراصل اسلام کی راہِ راست وصراطِ مستقیم سے انحراف کا نام ہے؛ کیوں کہ جب کوئی شخص دین وشریعت کے حدود کو پامال کرے گا، تو اس کا دین اپنی اصلی حالت وصورت میں کہاں باقی رہے گا؟

ایک حدیث سے اس پر روشنی پڑتی ہے، حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ضرب اللّٰهُ مثلاً صراطاً مُستَقِيماً ، و على كنفي الصراط سُوْرَانِ فيهما أبوابٌ مُفَتَّحَةٌ ، و على الأبوابِ سُتُوْرٌ مُرْخَاةٌ ، و على بابِ الصِّرَاط دَاعٍ يَدْعُوْ يقُوْلُ: يا أَيُّهَا النَّاسُ ! اُسْلُكُوا الصِّرَاطَ جَمِيعاً ، و لا تَعَوَّجُوْا، و داعٍ يَدعُوْ على الصِّرَاط ، فإذا أرَادَ أحَدُكُم فتحَ شَيْءٍ مِنْ تِلْكَ الأبوَابِ ، قَالَ: وَيْلَكَ! لاَ تَفْتَحْهُ ؛ فإنَّكَ إنْ تَفْتَحْهُ تَلِجْهُ ، فَالصِّرَاطُ : ''الإسْلَامُ'' ، وَ السُّتُوْرُ : ''حُدُوْدُ

اللّٰهِ" ، وَ الأَبوَابُ المُفَتَّحَةُ : " مَحَارِمُ اللّٰهِ " ، و الدَّاعِي الَّذِيُ عَلىَ رَأسِ الصِّرَاطِ :" كِتَابُ اللّٰهِ " ، وَ الدَّاعِيُ مِنُ فَوُق : " وَاعِظُ اللّٰهِ يُذَكِّرُ فِي قَلبِ كُلِّ مُسُلِم ".

(اللہ تعالیٰ نے صراطِ مستقیم کی ایک مثال بیان کی کہ اس راستے کی دونوں جانبوں پر دو دیواریں ہیں، جن میں کھلے ہوئے دروازے ہیں، اوران دروازوں پر پردے لٹکے ہوئے ہیں اور راہِ مستقیم پر ایک بلانے والا ہے، جو یہ کہہ رہا ہے: اے لوگو! صراطِ مستقیم پر چلو اور ادھر ادھر مائل نہ ہوں اور ایک بلانے والا راستے پر ہوگا، جب تم میں سے کوئی ان دروازوں میں سے کسی دروازے کو کھولنا چاہے گا، تو وہ کہے گا کہ تیرا بھلا ہو، اس کو مت کھول؛ کیوں کہ اگر کھولے گا، تو اس میں داخل ہو جائے گا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ صراط سے مراد اسلام کا راستہ ہے اور پردوں سے مراد اللہ کی بیان کردہ حدود ہیں اور کھلے دروازوں سے مراد اللہ کی حرام کردہ چیزیں ہیں اور اس راستے پر دعوت دینے والی اللہ کی کتاب ہے اور اس سے اوپر کا دعوت دینے والا اللہ کا واعظ ہے، جو ہر مؤمن کے دل میں یاددہانی کرتا رہتا ہے۔)(۱)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ"صراطِ مستقیم" ایک ایسا راستہ ہے، جس کی دونوں طرف دیواریں اور ان دیواروں میں دروازے ہیں، جن پر پردے پڑے ہوئے ہیں، یہ دروازے محارم کے دروازے ہیں، ان کو کھولنے سے انسان کے لیے ان حرام کاموں میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اس لیے اللہ کا فرشتہ، جو وہاں داعی

(۱) مسند أحمد:۱۷۶۷۱، المستدرک للحاکم :۲۴۵، مشکل الآثار:۱۷۰/۵، السنة لابن أبي عاصم :۱۹، السنة للمروزي :۱۷

بن کر کھڑا رہتا ہے، وہ کہتا ہے کہ ان کو مت کھولو؛ ورنہ ان میں گر جاؤ گے۔ معلوم ہوا کہ ''صراطِ مستقیم'' افراط وتفریط سے پاک راستہ ہے۔

اور صراطِ مستقیم نام ہی اس راستے کا ہے، جس میں کجی و ٹیڑھ نہ ہو اور وہ صاف وواضح ہو۔ امام طبری رَحِمَہُ اللّٰہُ ''صراطِ مستقیم'' کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

'' أجمعتِ الأمةُ من أهل التأويل جميعاً على أن الصراط المستقيم هو الطريق الواضح الذي لا اعوجاج فيه ، و ذلک في لغة جميع العرب.''(۱)

(امت کے تمام مفسرین کا اجماع ہے کہ'' صراطِ مستقیم'' وہ واضح راستہ ہے، جس میں کوئی ٹیڑھ نہ ہو، یہ تمام اہلِ عرب کی لغت ہے۔)

ایک شخص دین کے نام پر نماز پڑھنے کے لیے عین طلوعِ آفتاب یا غروبِ آفتاب کے وقت کھڑا ہو جائے، تو کیا اس کو ہم دین کہیں گے یا بے دینی کی بات؟ اسی طرح اگر کوئی نماز کی رکعتوں میں کمی یا اضافہ کر کے پڑھنے لگے، تو کیا یہ وہ نماز ہے جو ہمارے دین میں مشروع ہوئی ہے؟

کوئی شخص ان امور کو جو دین میں نہیں، اپنی جانب سے جاری کر لے اور اس کا نام دین رکھ چھوڑے، تو کیا وہ محض دین کے نام کی وجہ سے دین کہلائیں گے؟ یا اس کو خلاف دین قرار دیا جائے گا؟ ظاہر ہے کہ اس کا نام دین یا دین پر عمل نہیں؛ بل کہ کہا جائے گا کہ اس نے دین کے خلاف کیا؛ لہٰذا دین میں اپنی جانب سے کوئی کمی بیشی کرنا حد سے تجاوز ہے اور اسی کا نام دراصل ''غلو فی الدین'' ہے، جو راہِ راست سے انسان کو دور کر دینے والی چیز ہے۔

اس کی ایک حسی مثال یہ ہے کہ جیسے ریل گاڑی کہ پٹریوں پر جب وہ چلتی ہے،

---

(۱) جامع البیان:۱/۷۳

تو اس کا ایک مقررہ راستہ و حد بندی ہے، جس پر اس کو گزرنا و چلنا ہے، جب وہ اسی پٹری پر اپنی اس حد میں ٹھیک طور سے چلتی ہے، تو منزل مقصود تک رسائی پا جاتی ہے؛ لیکن اگر وہ اس پٹری سے ذرا بھی ادھر ادھر ہو جائے، تو وہ پٹری سے اتر جائے گی یا لائن بدل جائے گی اور یہ ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ کبھی اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتی اور اس کو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اپنے راستے پر قائم ہے۔ ٹھیک ٹھیک اسی طرح جب آدمی اسلام کی قائم کردہ شاہراہ جس کو "صراطِ مستقیم" کہا جاتا ہے، اس پر قائم ہو اور اس پر چلتا رہے اور اس سے ذرا بھی ادھر ادھر نہ ہو، تو وہ منزل تک پہنچ جاتا ہے؛ لیکن اگر ذرا بھی ادھر ادھر ہوتا ہے، تو وہ منزل سے دور ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اگر یہی روش باقی رہی، تو وہ اس قدر دور ہو جاتا ہے کہ پھر اپنی منزل بھی بھول جاتا ہے۔

اور اسی مثال میں ایک اور بات قابلِ لحاظ اور عبرت انگیز ہے، وہ یہ کہ جیسے ریل گاڑی اپنی پٹری پر چلتے ہوئے لائن بدلتی ہے، تو ابتدا میں تو یہ نہیں لگتا کہ یہ کوئی دور ہوتی جا رہی ہے؛ لیکن شروع میں ذرا بھی لائن بدلنے والی ریل کچھ ہی دیر میں بہت دور ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ کبھی مشرق سے مغرب کی جانب یا مغرب سے مشرق کے جانب نکل جاتی اور خلاف سمت پر پڑ جاتی ہے، اسی طرح اسلام کی "راہِ راست" اور "صراطِ مستقیم" سے ہٹنے والے اور غلو کر کے دور ہونے والے ابتدا میں زیادہ دور جاتے نظر نہیں آتے؛ لیکن یہ ذرا سا ہٹنا، چلتے چلتے ان کو راہِ راست سے کوسوں دور کر دیتا ہے۔

اگر عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا بنالیا، تو اسی غلو کے سبب بنایا، اگر یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا، تو اسی غلو کی بلا سے قرار دیا، اگر مشرکینِ عرب یا دیگر اہلِ کفر و شرک نے بتوں کی عبادت کا سلسلہ جاری کیا، تو اسی غلو کا نتیجہ تھا، اگر بعض فرقوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت کو

خدائی کے مقام تک بڑھایا تھا، تو اسی غلو کی کرشمہ سازی تھی ، اگر لوگ ولیوں و شہیدوں کو حاجت رواو مشکل کشا سمجھتے اور ان سے اپنی حاجت کا سوال کرتے اور مشکل کشائی کی گزارش کرتے ہیں، تو اسی غلو کے مرض کا اثر ہے، اگر اہل اللہ کی مزارات پر طواف وسجدے کیے جاتے ہیں، تو اسی غلو کی دَین ہے، اگر خوارج نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو کافر قرار دیا، تو اسی غلو کے زیر اثر تھا، اگر قدریہ و جبریہ فرقوں نے مسئلۂ تقدیر میں بندے کی قدرت کے بارے میں دو متقابل راستے اختیار کیے تھے، تو غلو ہی اس کا بھی سبب تھا، اگر مجسمہ و معطلہ فرقوں نے خدا کی ہستی کے بارے میں جسمیت و تعطیل کے دو متضاد نقاط نظر اختیار کیے تھے، تو اس کا باعث بھی یہی غلو تھا۔ اہلِ بیت کرام وائمہ عظام کے بارے میں اہلِ تشیع کا عقیدۂ عصمت اور ان ہی کے بارے میں ناصبیوں نے کفر و فسق کے فتوے لگائے تھے، تو وہاں بھی یہی غلو کار فرما تھا۔ الحاصل ہر بدعت و گمراہی و بدعقیدگی و بدعملی کے پیچھے غور کیا جائے، تو اس کا اصل سبب و باعث یہی غلو فی الدین نظر آتا ہے۔

لہٰذا اسلام نے غلو سے سختی سے منع کر دیا؛ تاکہ یہ غلو اگر چہ کہ بہت معمولی لگتا ہو اور لوگ اس کو کچھ زیادہ اہمیت نہ دیتے ہوں؛ مگر یہ انسان کو صراطِ مستقیم سے بہت دور کر دیتا ہے؛ لہٰذا ہر قسم کے غلو سے اسلام نے منع کر دیا۔

غلو فی الدین کی حرمت وممانعت

غلو کی مذمت وممانعت قرآن میں

غلو کی مذمت وممانعت حدیث میں

غلو کی برائی اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں

دوسری فصل

غلو فی الدین کی حرمت وممانعت

غلو کی مذمت وممانعت قرآن میں

اسلام میں ''غلو فی الدین'' کی سخت ممانعت ہے اور قرآنِ کریم وحدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کے دلائل موجود ہیں۔

یہاں صرف چند دلیلیں ذکر کی جاتی ہیں: سب سے پہلے قرآنِ کریم سے دلیل لیجیے:

(۱) پہلی آیت:

﴿ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَاۗءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَاۗءِ السَّبِيْلِ﴾ (المائدۃ: ۷۷)

(اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور نہ ان لوگوں کی پیروی کرو، جو اس سے پہلے گمراہ ہو چکے اور بہت سے لوگوں کو گمراہ کر چکے اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔)

(۲) دوسری آیت:

ایک اور جگہ قرآن میں ان ہی الفاظ کے ساتھ غلو کی ممانعت کی گئی ہے، چناں چہ فرمایا:

﴿ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَاتَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ﴾ (النسآء: ۱۷۱)

(اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ پر حق بات کے سوا کچھ نہ کہو۔)

ان دونوں جگہ کی آیات میں یہود و نصاریٰ کو غلو فی الدین سے منع کیا گیا ہے؛ کیوں کہ یہ دونوں اللہ کی قائم کردہ حدود کو ہمیشہ توڑتے رہے اور دین میں غلو کے ذریعے اپنے دینوں کو بدل دیا تھا؛ لہٰذا ان کو اس ناشائستہ حرکت و کافرانہ عمل سے منع کیا گیا۔ یہود نے حضرت عزیر عَلَیْہِ السَّلَام کو خدا کا بیٹا قرار دیا اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کو خدا کا بیٹا ٹھیرایا۔

مفسر قرآن علامہ قرطبی رَحِمَہُ اللہُ فرماتے ہیں :

"مراد اس "غلو" سے جیسا کہ مفسرین نے بیان کیا ہے، یہود کا حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کے بارے میں غلو ہے؛ حتیٰ کہ حضرت مریم علیہا السلام پر بہتان باندھ دیا اور مراد عیسائیوں کا حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کے بارے میں غلو ہے؛ یہاں تک کہ ان کو خدا ہی بنا ڈالا؛ لہٰذا افراط وتفریط دونوں ہی گناہ وکفر ہیں۔"(۱)

(۳) تیسری آیت:

﴿ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ، وَ لَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴾ (هُوْد :۱۱۲-۱۱۳)

(آپ کو (راہِ دین پر) جس طرح استقامت کے ساتھ رہنے کا حکم

---

(۱) تفسیر القرطبي:۶/۲۱

دیا گیا ہے، اسی طرح استقامت سے رہیے اور وہ لوگ بھی استقامت سے رہیں، جو توبہ کرکے آپ کے ساتھ ہیں اور دین کے دائرے سے ذرا بھی نہ نکلو، بلاشبہ وہ اللہ تم سب کے اعمال کو خوب دیکھتا ہے اور تم ان لوگوں کی طرف مت جھکو، جنھوں نے ظلم کیا کہ کہیں تم کو دوزخ کی آگ لگ جائے اور اللہ کے سوا کوئی بھی تمھارا دوست نہیں ہے؛ پھر تمھاری مدد نہ کی جائے گی۔)

یہ دو آیات ہیں، ان میں سے پہلی آیت میں حضرت نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کو اور تمام امتیوں کو دو حکم دیے گئے ہیں: ایک ﴿اسْتَقِمْ﴾ (دین پر استقامت سے رہیے۔)

علامہ زمخشری رَحِمَهُ اللّٰهُ نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:

" فاستقم استقامةً مثل الاستقامة التي أمِرْتَ بها على جادة الحق غيرَ عادل عنها "

(آپ جادۂ حق پر اس طرح قائم رہیے، جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے، اس سے ذرا عدول نہ کیجیے۔)(۱)

اور دوسرا ﴿وَلَا تَطْغَوْا﴾ (دین کے دائرے سے نہ نکلیے) اور "طغیان" کے معنے بھی حد سے باہر نکلنے کے آتے ہیں اور وہ غلو کا ہم معنے ہے۔

مفسرِ قرآن علامہ ابو السعود رَحِمَهُ اللّٰهُ نے اپنی تفسیر " إرشاد العقل السليم " میں اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:

" ولا تَنحَرِفُوا عمَّا حُدَّ لَكُم بإفراطٍ أو تفريطٍ ؛ فإنّ كِلا طرفي قصد الأمور ذَمِيم. "

(افراط یا تفریط کرکے ان حدود سے انحراف نہ کرو، جو تمھارے لیے مقرر کردی

(۱) تفسیر الکشاف: ۴۳۲/۲

گئی ہیں؛اس لیے کہ ان معاملات کے دونوں پہلو افراط وتفریط مذموم ہیں۔)(۱)

اور علامہ زمخشری رَحِمَہُ اللّٰہُ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”وَلَا تَخْرُجُوْا عَنْ حُدُوْدِ اللّٰہِ.“(اللہ کے حدود سے نہ نکلو۔)(۲)

اور دوسری آیت میں حد سے نکلنے والوں کی جانب میلان و جھکاؤ نہ رکھنے کا حکم اور ان کی جانب جھکاؤ رکھنے پر جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔

ان آیات کی تفسیر میں مفسرِ جلیل و محدثِ عظیم حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے ”ترجمۂ شیخ الہند“ پر اپنے ”فوائد“ میں مختصر مگر جامع کلام کیا ہے، اس کا یہاں نقل کردینا مناسب ہے،آپ پہلی آیت کی تفسیر لکھتے ہیں:

”آپ کو اور ان لوگوں کو جنھوں نے کفر وغیرہ سے توبہ کرکے آپ کی معیت اختیار کرلی اور حق تعالیٰ کی طرف رجوع کیا،احکامِ الٰہیہ پر نہایت پامردی اور استقلال کے ساتھ ہمیشہ جمے رہنا چاہیے۔عقائد، اخلاق،عبادات،معاملات،دعوت وتبلیغ وغیرہ ہر چیز میں افراط وتفریط سے علیحدہ ہوکر توسط و استقامت کی راہ پر سیدھے چلے جاؤ،کسی معاملے میں افراط وتفریط کی جانب اختیار کرکے حد سے نہ نکلو اور یقین رکھو کہ حق تعالیٰ ہر آن تمھارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔“

اور دوسری آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

”پہلے ﴿وَلَا تَطْغَوْا﴾ میں حد سے نکلنے کو منع کیا تھا،اب بتلاتے ہیں کہ جو لوگ ظالم (حد سے نکلنے والے) ہیں،ان کی طرف تمھارا ذرا

(۱) إرشاد العقل السلیم:۳۹۴/۳

(۲) تفسیر الکشاف:۴۳۲/۲

سا میلان و جھکاؤ بھی نہ ہو، ان کی موالات و مصاحبت، تعظیم و تکریم، مدح و ثنا، ظاہری تشبہ، اشتراکِ عمل، ہر بات سے حسبِ مقدور محترز رہو؛ مبادا آگ کی لپٹ تم کو نہ لگ جائے، پھر نہ خدا کے سوا تم کو کوئی مددگار ملے گا اور نہ خدا کی طرف سے کوئی مدد پہنچے گی۔''(۱)

پھر یہاں ایک بات سمجھنے کی یہ ہے کہ یہ ﴿اسْتَقِمْ﴾ اور ﴿لَا تَطْغَوْا﴾ در اصل ایک دوسرے کی توضیح و تاکید ہیں؛ کیوں کہ استقامت یہ ہے کہ دین پر صحیح طریقے پر جم جائے اور جو اس طرح جم جائے گا، اس کو لازم ہے کہ دین کے دائرے سے باہر نہ نکلے۔

اسی بات کو قدرے تفصیل و توضیح کے ساتھ مفسرِ قرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے، چناں چہ اسی آیت کی تفسیر میں آپ لکھتے ہیں:

''رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمانوں کو اس آیت میں اپنے ہر کام میں، ہر حال میں استقامت پر رہنے کا حکم فرمایا گیا ہے، ''استقامت'' لفظ تو چھوٹا سا ہے؛ مگر مفہوم اس کا ایک عظیم الشان وسعت رکھتا ہے؛ کیوں کہ معنے اس کے یہ ہیں کہ انسان اپنے عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، کسبِ معاش اور اس کی آمد و صرف کے تمام ابواب میں اللہ جل شانہ کے قائم کردہ حدود کے اندر اس کے بتلائے ہوئے راستے پر سیدھا چلتا رہے، اس میں سے کسی باب کے کسی عمل اور کسی حال میں کسی ایک طرف جھکاؤ یا کمی زیادتی ہو جائے تو استقامت باقی نہیں رہتی۔''

-- آگے چل کر فرماتے ہیں-- ﴿وَلَا تَطْغَوْا﴾ یہ لفظِ ''طغیان'' سے

---

(۱) فوائد ترجمہ شیخ الہند: ۳۱۰

بنا ہے، اس کے معنے حد سے نکل جانے کے ہیں، جو ضد ہے ''استقامت'' کی؛ آیت میں استقامت کا حکم مثبت انداز میں صادر فرمانے پر کفایت نہیں فرمائی؛ بل کہ اس کے منفی پہلو کی ممانعت بھی صراحۃً ذکر کر دی کہ عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، وغیرہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مقرر کردہ حدود سے باہر نہ نکلو کہ یہ ہر فساد اور دینی و دنیوی خرابی کا راستہ ہے۔''(۱)

(۴) چوتھی آیت:

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (البقرۃ: ۲۲۹)

(یہ اللہ کی قائم کردہ حدود ہیں؛ لہٰذا ان سے باہر نہ نکلو اور جو لوگ ان سے تجاوز کرتے ہیں، وہی دراصل ظالم ہیں۔)

اس آیت میں بھی وہی ''غلو'' اور ''تجاوز عن الحدود'' سے منع کیا گیا ہے اور غلو کرنے والوں کو ظالم کہا گیا ہے، جو اس ''غلو فی الدین'' کی مذمت و برائی جاننے کے لیے کافی ہے۔

غلو کی مذمت و ممانعت حدیث میں

قرآنِ کریم کے بعد اب آیئے دیکھتے ہیں کہ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں غلو کے بارے میں کیا کہا گیا ہے؟

(۱) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ یا ان کے بھائی فضل بن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

(۱) معارف القرآن: ۴/۶۷۰-۶۷۲

”يَآ أَيُّهَا النَّاسُ ! إِيَّاكُمْ وَالغُلُوَّ فِيْ الدِّيْنِ ، فَإِنَّهُ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبلَكُمُ الغُلُوُّ فِيْ الدِّيْنِ.“

(اے لوگو! تم دین میں غلو کرنے سے بچو؛ کیوں کہ تم سے پہلے لوگوں کو دین میں غلو ہی نے ہلاک کیا تھا۔)(۱)

یہ بات اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص موقعے پر ارشاد فرمائی تھی، وہ یہ کہ حج کے موقعے پر”جمرات“ پر کنکریاں مارنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ یا ان کے بھائی فضل بن عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ کنکریاں چن کر لاؤ، وہ کنکریاں چن کر لائے، جو نہ بہت بڑی تھیں، نہ بہت چھوٹی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں! ایسی ہونی چاہئیں، اس جیسی کنکریوں سے”جمرات“ پر رمی کرو، پھر یہ جملہ فرمایا تھا:”دین میں غلو سے بچو؛ کیوں کہ تم سے پہلے لوگوں کو اسی نے ہلاک کیا تھا۔“

اس سے معلوم ہوا کہ کنکریاں مارنے میں بھی طریقِ سنت کو چھوڑنا اور بہت بڑی یا چھوٹی کنکریاں مارنا غلو فی الدین میں داخل ہے۔

(۲) حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا :

”ألا هلك المتنطعون“(خبردار! غلو کرنے والے ہلاک ہوگئے۔)(۲)

---

(۱) السنن لابن ماجة :۳۰۲۹، مسند أحمد:۳۲۴۸، المعجم الكبير:۱۵۱۴۰، السنة لابن أبي عاصم:۹۸

(۲) الصحيح للمسلم: ۶۹۵۵، سنن أبي داود :۴۶۱۰، مسند أحمد:۳۶۵۵، مسند بزار:۱۸۷۸، مسند أبي يعلى :۵۰۰۴، المعجم الكبير:۱۰۲۱۷، شرح السنة :۳۳۹۶

"شارحِ مسلم" علامہ نووی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے" المنهاج شرح مسلم" میں اور علامہ سیوطی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے" الديباج شرح مسلم "میں"متنطعون" کے معنے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

" أي المتعمقون الغالون المجاوزون الحدود في أقوالهم ، و أفعالهم ."

(یعنی وہ لوگ جو دینی باتوں اور کاموں میں تعمق وتشدد کرتے ،غلو کرتے اور حدود سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔)(۱)

(۳)حضرت انس رضی اللہ عنہ بن مالک سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا :

"لا تُشَدِّدُوْا على أنفسكم ، فيشدد عليكم ، فإن قوماً شددوا على أنفسهم ، فشدد الله عليهم ، فتلك بقاياهم في الصوامع والديار."

(اپنی جانوں پرسختی نہ کرو کہ تم پرسختی نہ کردی جائے ؛ کیوں کہ ایک قوم نے اپنی جانوں پرسختی کی ،تو اللہ نے اس پر بھی سختی کردی ، پس یہ ان ہی کے بقایا ہیں ، جو ان گرجاؤں اور کٹیوں میں ہیں۔)(۲)

یہ تشدد اسی غلو کی ایک شکل ہے،اس سے ہمارے آقا حضرت محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے سختی سے منع فرمایا اور اس کو یہود ونصاریٰ کے راہبوں کا عمل قرار دیا۔

(۴)حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا :

---

(۱) شرح مسلم للنووي:۲۲۱/۸،الديباج:۳۴/۶

(۲) سنن أبي داود:۴۹۰۶،مسند أبي يعلى:۳۶۹۴

”لا تشددوا علی أنفسکم ، فإنما ھلک من کان قبلکم بتشدیدھم علی أنفسھم ، و ستجدون بقایاھم في الصوامع ، والدیارات.“

(اپنی جانوں پر سختی نہ کرو؛ کیوں کہ تم سے پہلے لوگوں کی ہلاکت، ان کے اپنے اوپر سختی ہی کی وجہ سے ہوئی ہے اور تم ان کے بقایا لوگوں کو گرجاؤں اور کٹیوں میں پاؤگے۔)(۱)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے اوپر اعمالِ شاقہ سے سختی نہ کرو۔ جیسے زندگی بھر روزہ رکھنا ، پوری پوری رات عبادت کرنا اور عورتوں سے الگ رہنا وغیرہ؛ تا کہ اصل عبادت کرنے اور حقوق ادا کرنے میں کہیں ضعف نہ آجائے؛ کیوں کہ ایسا کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ خود سختی کر دیتے ہیں یعنی ایسی عبادت فرض کر دیتے ہیں، جو تم ادا نہ کرسکو اور مصیبت میں پڑ جاؤ۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کی ایک قوم نے جب اس طرح کی سختیاں اپنے اوپر لاگو کرلیں، جیسے مشقت آمیز عبادات اور مشکل ریاضتیں اور بے پناہ مجاہدات، تو اللہ نے ان پر یہ پابندیاں لاگو کردیں۔(۲)

(۵) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ان کے پاس ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں داخل ہوئے اور پوچھا کہ کون عورت ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ یہ فلاں عورت ہے، وہ اپنی نماز (کی کثرت) کا تذکرہ کر رہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو رہنے دو، تم پر اتنا ہی ضروری ہے، جتنا کہ تم طاقت رکھتے ہو، پس اللہ تعالیٰ ثواب دینے سے

---

(۱) شعب الإیمان :۳۶۰۱، المعجم الکبیر :۵۴۱۸، المعجم الأوسط :۳۰۷۸، معجم الصحابۃ : ۲۰۰۱

(۲) المرقاۃ شرح المشکاۃ :۱/۳۸۸، المرعاۃ شرح المشکاۃ : ۱/۲۶۹

نہیں اکتاتے، جب تک کہ تم ہی اکتا نہ جاؤ۔(۱)

(۶) حضرت ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”إن الله فرض فرائض فلا تضيعوها ، و حرم حرمات فلا تنتهكوها ، وحد حدوداً فلا تعتدوها ، و سكت عن أشياء من غير نسيان فلا تبحثوا عنها. “

(بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزوں کو فرض قرار دیا؛ لہٰذا تم انھیں ضائع نہ کرو اور اس نے کچھ چیزوں کو حرام ٹھیرایا، پس تم ان کی بے حرمتی نہ کرو اور اس نے حدود مقرر کردیں؛ لہٰذا تم ان سے تجاوز نہ کرو اور چند باتوں سے بغیر بھول کے سکوت فرمایا؛ لہٰذا تم ان کے بارے میں کھوج نہ کرو۔)(۲)

اس میں اللہ تعالیٰ کے مقرر فرض کو ضائع نہ کرنے اور اس کے بیان کردہ حرام کا ارتکاب کر کے اس کی بے حرمتی نہ کرنے اور اس کی مقرر کردہ حدوں کو نہ پھلانگنے کا حکم دیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ ہمیں یہی حکم ہے کہ ان سب کی محافظت کریں اور اسی کا نام ”استقامت“ ہے، جو ”غلو“ کی ضد ہے۔

(۷) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”إن الدين يسر ، و لن يشاد الدين أحد إلا غلبه ، فسددوا ، و قاربوا ، و أبشروا ، و استعينوا بالغدوة ، و الروحة ، و شيء من الدلجة.“

(۱) الصحيح للبخاري:۴۳،الصحيح للمسلم:۱۸۷۰،رياض الصالحين:۱۱۵

(۲) سنن الدار قطني:۴۳۹۶، المعجم الكبير: ۱۸۰۳۵، السنن للبيهقي :۱۹۵۰۹، مسند الشاميين : ۳۴۹۲)

(بلاشبہ دین آسان ہےاور جس نے بھی دین میں تشدد وغلو کیا، تو دین ہی اس پر غالب ہوا؛ لہٰذا اعتدال وتوسط کواختیار کرواور جس قدر طاقت میں ہواتنا کرلو، اجروثواب کی بشارت لواور صبح وشام اور رات کے اخیر حصے سے عبادت میں مدد لو۔)(۱)

اس حدیث میں یہ جو فرمایا: " لن يشاد الدين أحد إلا غلبه " اس کا مطلب علما نے یہ بیان کیا ہے کہ جو شخص دین میں غلو کرتے ہوئے تشدد وسختی اختیار کرے گا، تو دین چوں کہ آسان ہے؛ لہٰذا دین ہی غالب رہے گا اور وہ شخص ہار جائے گا؛ لہٰذا ایسی بے جا سختی وتشدد سے احتراز کرنا چاہیے۔

اور شراحِ حدیث نے اس حدیث کا مقصد ومنشا واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"صبح وشام اور رات کے اخیر حصے سے اوقاتِ نشاط مراد ہیں اور یہ مطلب ہے کہ عبادت ایسے اوقات میں کی جائے، جب آدمی کو نشاط حاصل ہو؛ تاکہ عبادت کا مزہ آئے، اس میں آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے عبادت گزار سے ایک مسافر کی حیثیت سے کلام کیا ہے کہ جیسے مسافر کے لیے یہ اوقات، بہترین اوقات ہیں، جس میں وہ سفر کرسکتا ہے، اسی طرح عبادت والے کو بھی اس کا خیال رکھنا چاہیے اور اگر مسافر دن رات مسلسل چلتا رہے گا، تو عاجز آجائے گا اور اس کا سفر منقطع ہو جائے گا۔"(۲)

(۸) حضرت ابو برزہ اسلمی رَضِيَ اللهُ عَنْهُ سے روایت ہے کہ ایک بار وہ باہر نکلے، تو اللہ کے رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو آتے ہوئے دیکھا اور یہ سمجھ کر کہ آپ اپنی ضرورت

---

(۱) الصحيح للبخاري :۳۹،سنن النسائي :۵۰۳۴، السنن للبيهقي :۴۹۲۹، شرح السنة :۹۳۵

(۲) شرح ابن بطال للبخاري:۹۶/۱،عمدة القاري:۱۰۲/۲، فيض القدير:۴۱۷/۲

کے لیے جارہے ہیں، اعراض کیا؛ مگر خود آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان کو بلایا اور ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے کر چلنے لگے، وہاں ایک شخص کو دیکھا، جو نماز پڑھ رہا تھا اور کثرت سے رکوع وسجدہ کرر ہا تھا۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرمانے لگے :

"عليكم هدياً قصداً ، فإنه من يشاد هذا الدين يغلب"

(تم پر لازم ہے کہ درمیانی طریقہ اختیار کرو؛ کیوں کہ جو بھی دین میں تشدد وغلو کرتا ہے، اس پر دین ہی غالب آتا ہے) یہ تین مرتبہ فرمایا۔(۱)

(۹) حضرت انس رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم مسجد میں داخل ہوئے، تو دیکھا کہ ایک لمبی سی رسی دوستونوں کے درمیان لٹکی ہوئی ہے، آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے معلوم کیا کہ یہ رسی کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ حضرت زینب رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہَا کی رسی ہے، جب وہ عبادت کرتے ہوئے تھک جاتی ہیں، تو اس سے لٹک جاتی ہیں، آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: اس کو کھول دو، تم میں سے کوئی نماز پڑھے، تو اپنی نشاط وسہولت کے مطابق پڑھے، جب تھک جائے تو سو جائے۔(۲)

(۱۰) حضرت عائشہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہَا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

"إذا نعس أحدكم ، و هو يصلي فليرقد ؛ حتى يذهب عنه النوم ، فإن أحدكم إذا صلى ، وهو ناعس لا يدري لعله يذهب يستغفر فيسب نفسه"

(جب تم میں سے کسی کو نماز پڑھتے ہوئے اونگھ آجائے، تو اس کو سو جانا چاہیے، یہاں تک کہ اس کی نیند جاتی رہے؛ کیوں کہ جب کوئی نیند کی حالت میں نماز پڑھے گا، تو کیا خبر کہ وہ شاید استغفار کرنا چاہے

(۱) مسند أحمد:۱۹۸۰۱، صحيح ابن خزيمة:۱۱۷۹، السنن للبيهقي:۴۹۳۰

(۲) الصحيح للبخاري:۱۱۵۰، السنن للبيهقي:۴۹۲۷، المعجم الأوسط:۸۸۹۰

اور خود کو گالی دینے لگے)(۱)

(۱۱) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے کہ ایک شخص کو دیکھا کہ وہ کھڑا ہوا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا، تو لوگوں نے کہا کہ یہ ابو اسرائیل رضی اللہ عنہ ہیں، انھوں نے نذر مانی تھی کہ وہ دھوپ میں کھڑے رہیں گے، نہیں بیٹھیں گے، کسی چیز کا سایہ نہیں لیں گے اور کسی سے بات نہیں کریں گے اور روزہ رکھیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کو حکم دو کہ وہ بات چیت کریں، سایہ حاصل کریں اور بیٹھیں اور روزہ کی نذر پوری کریں۔(۲)

(۱۲) حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بوڑھے شخص پر سے گزرے، جو اپنے دو بیٹوں کے سہارے چل رہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اس کا کیا حال ہے؟ بتایا گیا کہ اس نے کعبۃ اللہ تک چل کر جانے کی نذر مانی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " إن اللّٰه عن تعذيب هذا نفسه لغني " (اللہ اس (بوڑھے) کے خود کو اس تکلیف دینے سے مستغنی ہیں) پھر آپ نے اس کو سوار ہونے کا حکم دیا۔(۳)

مذکورہ احادیثِ نبویہ سے یہ معلوم ہوا کہ دین میں غلو کرنا نا جائز ہے اور اس کی سخت ممانعت ہے۔

---

(۱) الصحيح للبخاري: ۲۱۲، الصحيح للمسلم: ۱۸۷۱، الموطأ للمالك: ۲۵۷، سنن أبي داود: ۱۳۱۲، سنن ابن ماجة: ۱۳۷۰، مسند أحمد: ۲۴۳۳۲، صحيح ابن خزيمة: ۹۰۷، السنن للبيهقي: ۴۹۱۵

(۲) الصحيح للبخاري: ۶۷۰۴، سنن أبي داود: ۳۳۰۲، سنن ابن ماجة: ۲۱۳۶

(۳) الصحيح للبخاري: ۱۸۶۵، الصحيح للمسلم: ۴۳۳۶، سنن أبي داود: ۳۳۰۳، سنن الترمذي: ۱۵۳۷، سنن النسائي: ۳۸۵۲، مسند أحمد: ۱۲۰۵۷، صحيح ابن خزيمة: ۳۰۴۴

غلو کی برائی، اسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں

اب ذرا یہ بھی ملاحظہ فرمائیں کہ خود اللہ کے رسول ﷺ کا اسوۂ مبارکہ ہمیں کیا سبق دیتا ہے اور اس سلسلے میں کیا رہبری کرتا ہے؟

(۱) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی بیوی بڑی حسین وجمیل اور عطر اور عمدہ لباس کو پسند کرنے والی عورت تھی، ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو دیکھا وہ بہت میلے کچیلے کپڑوں میں ہیں اور ان سے پوچھا کہ یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟ انھوں نے کہا کہ بات یہ ہے کہ بعض صحابہ جس میں حضرت علی، حضرت عبداللہ بن رواحہ اور عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہم ہیں، انھوں نے خود کو عبادت کے لیے فارغ کرلیا اور بیویوں سے پرہیز اور گوشت سے احتراز کرنے لگے اور دن بھر کا روزہ اور رات بھر کا قیام اپنے اوپر لگالیا؛ لہٰذا مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی کہ میں اپنے شوہر کو ایسی حالت میں نظر آؤں، جو ان کو میری جانب متوجہ کرے۔ جب نبی کریم ﷺ تشریف لائے، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ سارا قصہ آپ کو سنایا، پس آپ ﷺ نے اپنی جوتیاں اٹھائیں اور اپنے بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے ان کو پکڑا اور جلدی سے ان لوگوں کے پاس گئے اور ان سے ان کا حال پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا ارادہ خیر ہی کا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

”إنما بعثت بالحنيفية السمحة ، ولم أبعث بالرهبانية البدعة ، ألا ! و إن قوماً ابتدعوا الرهبانية ، فكتبت عليهم، فما رعوها حق رعايتها ، ألا فكلوا اللحم ، و ائتوا النساء ، و صوموا ، و أفطروا ، و صلوا ، و ناموا ، فإني بذلك

أمرت. "(۱)

(میں ایسی شریعت کے ساتھ بھیجا گیا ہوں، جو کجی وٹیڑھ سے پاک، سہولت آمیز ہے، میں بدعت رہبانیت کے ساتھ نہیں بھیجا گیا ہوں، خبردار! ایک قوم نے رہبانیت کی بدعت جاری کی، تو وہ ان پر لازم کردی گئی، پس وہ اس کے حق کا لحاظ نہ کرسکے، خبردار! گوشت کھاؤ اور اپنی عورتوں کے پاس جاؤ اور کبھی روزہ رکھو اور کبھی نہ رکھو اور کچھ رات میں نماز پڑھو اور کچھ دیر سو بھی جاؤ؛ کیوں کہ مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے۔)

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے اسی حدیث میں ایک روایت اس طرح آئی ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی بیوی خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بوسیدہ حالت میں آئیں، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے پوچھا کہ کیا حال ہے؟ انھوں نے کہا کہ میرے شوہر رات بھر عبادت کرتے اور دن بھر روزہ رکھتے ہیں (تو میں پھر کس کے لیے زینت اختیار کروں؟) اتنے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کے سامنے اس کا ذکر کیا، تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اور فرمایا:

"يا عثمان -- رضي الله عنه -- ! إن الرهبانية لم تكتب علينا، أما لك فيَّ أسوة ؟ فوالله إنِي أخشاكم لله، و أحفظكم لحدوده."

(اے عثمان رضی اللہ عنہ! رہبانیت ہمارے لیے مشروع نہیں کی گئی، کیا تمھارے لیے میری ذات میں نمونہ نہیں ہے؟ پس اللہ کی قسم! میں تم میں

(۱) المعجم الكبير: ۷۶۱۷

سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اللہ کے حدود کی سب سے زیادہ حفاظت کرنے والا ہوں۔)(۱)

(۳) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"تین حضرات اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے گھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے بارے میں معلوم کرتے ہوئے آئے، جب ان کو آپ کی عبادت کے بارے میں بتایا گیا، تو انھوں نے اس کو معمولی سمجھا اور آپس میں کہنے لگے کہ ہم کہاں اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہاں؟ آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ تو معاف کردیے گئے ہیں۔ (لہٰذا آپ کی عبادت کی کمی سے آپ کے مقام میں کوئی کمی نہیں آئے گی) پھر ان میں سے ایک نے کہا کہ میں تو بس ہمیشہ رات بھر نماز پڑھتا رہوں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور کبھی روزہ نہ چھوڑوں گا۔ تیسرے شخص نے کہا کہ میں عورتوں سے علیحدہ رہوں گا، کبھی شادی نہ کروں گا۔ پس اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ان سے کہا کہ کیا تم ہی لوگوں نے ایسی ایسی باتیں کہی تھیں؟ مگر میں تو خدا کی قسم! تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور سب سے زیادہ تقوے والا ہوں؛ لیکن میں کبھی (نفلی) روزہ رکھتا ہوں اور کبھی روزہ چھوڑ دیتا ہوں اور کبھی رات بھر نماز پڑھتا ہوں، کبھی سو جاتا ہوں اور میں نے عورتوں سے شادی کی ہے، پس جس نے میرے طریقے سے روگردانی

---

(۱) مسند أحمد: ۲۵۹۳۵، صحیح ابن حبان: ۹، مصنف عبد الرزاق: ۱۰۳۷۵، معجم الصحابة: ۱۷۸۷، المعجم الکبیر: ۸۲۴۰، الأحکام الشرعیة: ۲۶۳/۳

کی وہ مجھ سے نہیں۔"(۱)

(۴)ایک حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کچھ حضرات نے ازواجِ نبی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اندرونِ خانہ عبادت کے بارے میں پوچھا؛ پھر ان میں سے بعض نے کہا کہ میں بستر ے پر نہیں لیٹوں گا، بعض نے کہا کہ میں عورتوں سے نکاح نہیں کروں گا اور بعض نے کہا کہ میں روزہ رکھا کروں گا، کبھی روزہ نہ چھوڑوں گا۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ بعض نے کہا کہ میں گوشت نہیں کھاؤں گا۔ یہ بات اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچ گئی، تو آپ خطبہ دینے کھڑے ہوئے اور اللہ کی حمد وثنا بیان کی، پھر فرمایا کہ لوگوں کا کیا حال ہے کہ وہ ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں؛ لیکن میں کبھی (نفلی) روزہ رکھتا ہوں اور کبھی روزہ چھوڑ دیتا ہوں اور کبھی رات بھر نماز پڑھتا ہوں، کبھی سوجاتا ہوں اور میں نے عورتوں سے شادی کی ہے، پس جس نے میرے طریقے سے روگردانی کی وہ مجھ سے نہیں۔"(۲)

(۵)حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

"میرے والد حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے میری شادی

---

(۱) الصحیح للبخاري :۵۰۶۳،صحیح ابن حبان :۳۱۷،السنن الکبریٰ للبیهقي : ۱۳۸۳۰،السنن الصغری للبیهقي :۱۸۱۰

(۲)الصحیح للمسلم : ۳۴۶۹، سنن النسائي :۳۲۱۷ ، مسند أحمد : ۱۴۰۷۷، صحیح ابن حبان :۱۴،مسند بزار :۶۸۰۷،السنن للبیهقي :۵۳۰۵، مستخرج أبي عوانة :۳۲۲۳

''قریش'' کی ایک عورت سے کی، جب وہ میرے پاس داخل ہوئی، تو میں اس کو اس لیے نظر انداز کرنے لگا کہ مجھ میں نماز، روزے، عبادت کی بڑی قوت تھی۔ پس حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اپنی کوٹھری میں تشریف لائے اور میری عورت کے پاس گئے اور اس سے پوچھا کہ اپنے شوہر کو کیسا پایا؟ تو میری بیوی نے کہا کہ وہ بہترین آدمی ہیں یا کہا کہ وہ بہترین شوہر ہیں کہ ہمارا پردہ ہی نہیں کھولا اور نہ ہمارے لیے بستر ہی پر قدم رکھا۔ (یعنی عبادت کے ذوق سے بیوی سے نہ جماع ہی کیا اور نہ اس کے ساتھ بستر پر لیٹے) حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے اس کا تذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو میرے پاس لاؤ۔ میں حاضر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ روزہ کیسے رکھتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ روزانہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر ہفتے میں سے تین دن رکھ لیا کرو، میں نے عرض کیا کہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو دن رکھ لو اور ایک دن چھوڑ دو، میں نے عرض کیا کہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ افضل الصیام ''صوم داؤدی'' رکھ لو، ایک دن روزہ رکھو اور ایک دن چھوڑ دو۔''(۱)

امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ کیا تم دن بھر روزہ رکھتے ہو؟ عرض کیا کہ ہاں! پوچھا کہ کیا رات بھر نماز پڑھتے ہو؟ عرض کیا کہ ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لیکن میں تو

(۱) الصحيح للبخاري :۵۰۵۲،سنن النسائي :۲۳۸۹، السنن الكبرى للنسائي :۲۷۱۰

کبھی روزہ رکھتا ہوں اور کبھی چھوڑ دیتا ہوں اور کبھی نماز پڑھتا ہوں اور کبھی سو جاتا ہوں اور میں عورتوں سے ملتا بھی ہوں، پس جس نے میرے طریقے سے روگردانی کی وہ مجھ سے نہیں۔(۱)

(۶) حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت ام نبیہ بنت الحجاج رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیہ بھیجا کرتی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار ان کے یہاں تشریف لے گئے اور خیر خیریت دریافت فرمائی، پھر پوچھا کہ عبد اللہ رضی اللہ عنہ کا کیا حال ہے؟ تو ام نبیہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ وہ خیریت سے ہے؛ مگر وہ دنیا سے الگ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ وہ کیسے؟ تو انھوں نے کہا کہ نیند کو حرام کر لیا ہے، سوتا نہیں اور نہ کبھی روزہ چھوڑتا ہے اور گوشت کو حرام کر لیا ہے، پس گوشت بالکل نہیں کھاتا اور نہ اپنی اہلیہ کا حق ادا کرتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟ عرض کیا کہ ابھی ابھی کہیں باہر نکلا ہے، ہو سکتا ہے کہ آجائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر وہ آئے تو میرے لیے اس کو روک لینا، پس وہ آگئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے۔(۲)

(۷) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کام کیا اور اس کی اجازت عطا فرمائی؛ مگر کچھ لوگ اس سے پرہیز واحتیاط کرنے لگے اور یہ بات اللہ کے نبی

---

(۱) مسند أحمد: ۲۳۴۷۷، معجم الصحابة: ۱۴۷۴

(۲) المستدرک للحاکم: ۶۹۰۰

صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی ، ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غصے میں آگئے اور آپ کے غصے کا اثر آپ کے چہرے پر ظاہر ہونے لگا ،تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور اللہ کی حمد کی پھر فرمایا:

" ما بال أقوام يتنزهون عن الشيء أصنعه ، فوالله ! إني لأعلمهم بالله ، و أشدهم له خشية. "

(لوگوں کا کیا حال ہے کہ اس چیز سے پرہیز کرتے ہیں، جو خود میں انجام دیتا ہوں ، پس خدا کی قسم ! میں لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ کو جاننے والا اور اللہ سے ڈرنے والا ہوں۔)(۱)

(۸) حضرت مسلم القرشی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صوم دہر (ہمیشہ روزہ رکھنے) کے بارے میں سوال کیا،تو فرمایا : تیرے اہل وعیال کا تجھ پر حق ہے، رمضان اور اس کے بعد والے ماہ میں روزہ رکھ لینا اور ہر بدھ و جمعرات کو روزہ رکھ لینا ، یہ ایسا ہے کہ تو نے زندگی بھر روزہ رکھا۔ (۲)

(۹) حضرت سہل بن ابوامامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ وہ اور ان کے والد، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے پاس مدینے میں عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کی امارت کے دور میں گئے ،تو دیکھا کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں ،آپ نے بڑی ہی ہلکی پھلکی نماز پڑھی ۔ جیسے مسافر کی نماز ہوتی

---

(۱) الصحيح للبخاري: ۶۱۰۱،الصحيح للمسلم:۶۲۵۷، الأدب المفرد: ۴۳۶، شرح السنة:۹۹، مشكل الآثار:۵۸۸۲

(۲) سنن أبي داود:۲۴۳۲،سنن الترمذي:۷۵۳، شعب الإيمان:۳۵۸۶

ہے۔ جب آپ نے سلام پھیرا، تو میرے والد نے عرض کیا کہ حضرت! آپ نے فرض نماز پڑھی یا کوئی نفل نماز؟ فرمایا کہ یہ فرض نماز تھی اور رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی نماز بھی ایسی ہی ہوتی تھی، میں نے اس میں کوئی غلطی نہیں کی ہے؛ مگر یہ کہ کوئی بھول ہوگئی ہو۔

پھر کہا کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اپنی جانوں پر سختی نہ کرو کہ تم پر سختی نہ کردی جائے؛ کیوں کہ ایک قوم نے اپنی جانوں پر سختی کی، تو اللہ نے اس پر بھی سختی کردی، پس یہ ان ہی کے بقایا ہیں، جو ان گرجاؤں اور کٹیوں میں ہیں۔ (۱)

(۱۰) حضرت ابو جحیفۃ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

”رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے مابین بھائی چارگی قائم کی تھی، ایک بار حضرت سلمان رضی اللہ عنہ ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کے یہاں گئے، تو ان کی بیوی کو خستہ حال میں دیکھا اور پوچھا کہ یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟ انھوں نے کہا کہ آپ کے بھائی ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کو دنیا کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ پس اتنے میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ آگئے، ان کے لیے کھانا بنایا اور کہا کہ کھائیے، انھوں نے کہا کہ میں روزہ دار ہوں، حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اس وقت تک نہیں کھاؤں گا، جب تک آپ ساتھ میں نہیں کھائیں گے۔ یہ سن کر ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے کھانا کھالیا، پھر جب رات ہوئی تو ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نماز کی تیاری کرنے لگے، حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ سو جائیے، پس وہ سو گئے، پھر کچھ دیر بعد اٹھنے لگے، تو

(۱) سنن أبي داود: ۴۹۰۶، مسند أبي يعلى: ۳۶۹۴

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سو جایئے، پھر وہ سو گئے اور جب آخر رات ہوئی، تو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اب اٹھیے، پھر دونوں نے نماز پڑھی۔ پھر فرمایا :

”إن لربک علیک حقا ، و لنفسک علیک حقا ، و لأھلک علیک حقا ، فأعط کل ذي حق حقه . “

(بلا شبہ تمھارے رب کا بھی تم پر حق ہے اور تمھارے نفس کا بھی تم پر حق ہے اور تمھاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے؛ لہذا ہر ایک حق دار کو اس کا حق دو۔)

یہ سن کر حضرت ابوالدردا رضی اللہ عنہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور سارا قصہ بیان کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلمان نے سچ کہا۔“(۱)

یہ چند احادیث ہیں، جن میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ مبارکہ بیان ہوا ہے اور خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے بیان ہوا ہے کہ دین کے سلسلے میں آپ حدِ اعتدال پر قائم تھے اور دوسروں کو بھی اسی کی تعلیم دیا کرتے تھے، رہبانیت و دین میں سختی وتشدد آپ کا طریقہ نہیں تھا، ضرورت کے تحت آپ دنیا کے کاموں کو بھی انجام دیتے تھے، کبھی رات بھر عبادت بھی کرتے تھے اور کبھی آرام بھی فرماتے تھے، روزہ رکھنے یا چھوڑنے میں بھی وہی اعتدال ملحوظ ہوتا تھا۔ الغرض غلو سے پاک آپ کی زندگی کا طریقہ تھا۔

---

(۱) الصحیح للبخاري :۱۹۶۸، سنن الترمذي :۲۴۱۳، صحیح ابن خزیمة :۲۱۴۴، صحیح ابن حبان : ۳۲۰، مسند بزار: ۴۲۲۳ ، سنن الدارقطني : ۲۲۳۵ ، السنن للبیهقي: ۸۶۰۴، تهذیب الآثار:۵۹۳

ان سارے دلائل سے معلوم ہوا کہ غلو حرام و ناجائز ہے، قرآنِ کریم نے اس کو ممنوع قرار دیا ہے، احادیثِ نبویہ و اسوۂ نبوی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے بھی اس کا حرام ہونا ظاہر ہوتا ہے اور اسی لیے حضراتِ علما نے بھی اس کی وضاحت کر دی ہے، صرف ایک حوالہ لکھنا کافی سمجھتا ہوں۔

شارحِ بخاری علامہ بدر الدین عینی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے آیت ﴿ لا تغلوا ﴾ کے تحت لکھا ہے:

"احتج بهذه الآية على تحريم الغلو في الدين."

(اس آیت سے علما نے غلو فی الدین کے حرام ہونے پر احتجاج کیا ہے۔)(۱)

معلوم ہوا کہ اس "غلو فی الدین" سے بہت بچنا چاہیے؛ ایک تو اس لیے کہ یہ حرام ہے؛ بل کہ بعض صورتیں اس کی کفر ہیں۔ جیسا کہ اوپر کی تفصیلات سے معلوم ہوا، دوسرے اس لیے کہ غلو فی الدین ہر گمراہی کا راستہ و دروازہ ہے، تیسرے اس لیے کہ اس سے استقامت و اعتدال کی دولت سے محرومی ہو جاتی ہے۔

---

(۱) عمدة القاري:۲۵/۵۷، باب اقتداء أفعال النبي

تاریخِ مذاہب میں غلو کی بنیاد و ابتدا

غلو زمانۂ نوح علیہ السلام میں

یہودیوں کا دین میں غلو

نصاریٰ کا دین میں غلو

مشرکین و کفارِ عرب کا غلو

تیسری فصل

تاریخِ مذاہب میں غلو کی بنیاد وابتدا

غلو زمانۂ نوح عَلَيْهِ السَّلَام میں

غلو فی الدین کے سلسلے کی ابتدائی واولین کڑی حضرت نوح عَلَيْهِ السَّلَام کے دور کے لوگوں سے جاملتی ہے، جنھوں نے اپنے زمانے کے اولیاء اللہ و صالحین کو عقیدت ومحبت کے نام پر قابل پرستش بنالیا تھا۔

قرآن کریم میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَ قَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعاً وَ لَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَ نَسْراً ﴾ (نوح :۲۳)

(قوم نوح کے لوگوں نے کہا کہ تم اپنے معبودوں کو نہ چھوڑو اور نہ ''ود'' کو، نہ ''سواع'' کو، نہ ''یغوث'' کو، نہ ''یعوق'' کو اور نہ ''نسر'' کو چھوڑو۔)

اس آیت کی تفسیر میں دوقول ہیں:

ایک یہ کہ یہ ''ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر'' قوم نوح کے بتوں کے نام ہیں، حضرت ابن عباس رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، حضرت قتادہ، حضرت ضحاک اور حضرت ابن زید رحمہم اللہ سے یہ منقول ہے۔(۱)

اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ دراصل قوم نوح کے نیک وصالح لوگ تھے، ان کے

---

(۱) جامع البیان:۲۵۳/۱۲

انتقال کے بعد ان لوگوں نے ان کے مجسمے بنائے، پھر بعد والوں نے ان کو پوجنا شروع کردیا۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی بات روایت کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ یہ پانچ (ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر) حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے نیک و صالح لوگوں کے نام تھے، پس جب ان کا انتقال ہوگیا، تو شیطان نے ان کی قوم کے لوگوں کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ یہ نیک لوگ جہاں بیٹھتے تھے، وہاں ان کے بت نصب کریں اور ان کے نام پر ان بتوں کے نام رکھیں، چناں چہ ان لوگوں نے ان نیک لوگوں کے نام پر ان بتوں کے نام رکھے؛ لیکن ان کی عبادت نہیں کی جاتی تھی، جب یہ (بت بنانے والے لوگ) انتقال کر گئے اور حقیقت روپوش ہوگئی، تو ان کی عبادت و پرستش ہونے لگی۔(۱)

حضرت عروہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ اور محمد بن کعب القرظی رحمہ اللہ نے روایت کیا کہ یہ پانچ افراد حضرت آدم علیہ السلام کی صلبی اولاد میں سے ہیں اور "ودّ" سب سے بڑے اور سب سے نیک بیٹے تھے۔ محمد بن کعب کہتے ہیں کہ جب ان میں سے ایک کا انتقال ہوا، تو لوگ غمگین ہوئے، پس شیطان آیا اور کہنے لگا کہ میں اس جیسا بت بنادوں گا کہ تم اس کو دیکھو، تو وہ تم کو یاد آئے، چناں چہ لوگوں نے جب کہا کہ ہاں بنادو، تو اس نے اس کا ایک بت بنادیا، اس طرح ان پانچوں میں سے جس جس کا انتقال ہوتا، وہ اس کا بت بنادیتا اور یہ بت مسجد میں نصب ہوتے تھے، پھر آگے چل کر ان ہی بتوں کو معبود بنالیا گیا؛ حتی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کے لیے حضرت نوح علیہ السلام کو بھیجا۔(۲)

---

(۱) الصحیح للبخاري:۷۳۲/۲

(۲) القرطبي:۳۰۸/۱۸، الدر المنثور:۲۹۴/۸، فتح الباري مختصراً:۶۶۷/۸

اس سلسلے میں ایک روایت یہ ہے کہ محمد بن قیس و محمد بن کعب رحمہما اللہ نے کہا کہ یہ ''یعوق، یغوث وغیرہ'' حضرت آدم و نوح علیہما السلام کے زمانے کے درمیان کچھ نیک لوگ گزرے ہیں اور ان کے کچھ ماننے والے معتقد لوگ بھی تھے، جوان لوگوں کی اقتدا و اتباع کرتے تھے۔ جب ان لوگوں کا انتقال ہوا، تو شیطان نے ان کے دل میں ڈالا کہ اگر ان بزرگوں اور ولیوں کی صورتیں بنائی جائیں، تو عبادتِ الٰہی میں زیادہ شوق کا ذریعہ بنے گا اور ان کی عبادتِ الٰہی میں جدو جہد و محنت و مجاہدہ یاد آتا رہے گا۔ چناں چہ ان کی تصویریں اور مورتیاں بنائی گئیں۔ جب یہ نسل ختم ہوئی اور دوسری نسل آئی، تو شیطان نے ان کو یہ سمجھایا کہ تمھارے آبا واجداد تو ان ہی کی پوجا کرتے تھے اور ان ہی کی وجہ سے ان پر بارانِ رحمت ہوئی تھی۔ چناں چہ بعد والوں نے ان ہی بتوں کی پوجا شروع کردی۔ (۱)

یہ غلو فی الدین کی ابتدا و بنیاد ہے، جس میں نیک و صالح لوگوں کی محبت و عقیدت کے نام پر ان کو خدائی کے مقام پر پہنچا دیا گیا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ غلو کی بنیاد تو بہت پہلے حضرت نوح عَلَيْهِ السَّلَام کے زمانے میں ہی پڑگئی تھی اور ان کے بعد بھی دیگر انبیا کے زمانوں میں بھی لوگوں نے غلو سے کام لیا ہے؛ مگر ''غلو فی الدین'' کو باقاعدہ دین بنانے والے لوگ یہود و نصاریٰ ہیں۔

اسی غلو نے یہود و نصاریٰ کو ان کے اصلی دین سے نکال کر من گھڑت دین جاری کر لینے پر ابھارا تھا اور اسی غلو سے ان لوگوں نے تورات و انجیل اور اپنے دین میں تک تحریف کردی تھی؛ یہاں تک کہ توحید و شرک کا فرق باقی نہ رکھا؛ حلال و حرام میں

---

(۱) ابن كثير: ۴/ ۴۲۶، ابن جرير: ۱۲/ ۲۵۳، القرطبي ۱۸/ ۳۰۸، معالم التنزيل: ۱/ ۲۳۲

امتیاز نہ رہا؛ کبھی تو حضرات انبیا کو خدائی کے مقام پر بٹھا دیا اور کبھی ان کا مذاق اڑایا، ان کی توہین کی، ان کو قتل بھی کیا، اس طرح اللہ کی مقرر و بیان کردہ حدوں پر وہ باقی تو کیا رہتے، خود ہی ان کو اپنے ہاتھوں سے برباد کر دیا۔

اسی لیے خاص طور پر یہود و نصاریٰ سے اللہ تعالیٰ نے غلو سے بچنے کا مطالبہ کیا ہے، جیسا کہ آیات کے تحت گزر گیا۔

یہودیوں کا دین میں غلو

یہود نے دو طرح دین کے بارے میں غلو کیا: ایک افراط و حد سے بڑھنے کے ساتھ اور دوسرے تفریط و حد سے کمی کرنے کے ساتھ، ایک طرف ان لوگوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا اور حضرات انبیا میں سے بعض کی قبروں کو عبادت گاہ بھی بنالیا، جو حد شرع سے گزر جانے کی صورت ہے۔

پہلی بات کے متعلق قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ، ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴾ (التوبۃ: ۳۰)

(یہود نے کہا کہ عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں، یہ بھی ان سے پہلے کے کافروں کی سی باتیں کرنے والے ہیں، اللہ ان کو غارت کرے، یہ کہاں الٹے جا رہے ہیں۔)

اور دوسری بات کے بارے میں حدیث میں ہے کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”قاتل الله اليهود ، والنصارى ، اتخذوا قبور أنبيائهم مساجد.“
(یہود و نصاری کو اللہ غارت کرے کہ انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔)(۱)

اور دوسری جانب انھوں نے متعدد حضرات انبیا علیہم السلام کو ایذا و تکلیف دینے، ان کو جھٹلانے اور قتل کرنے کی کافرانہ و مجرمانہ حرکتیں کیں، اسی طرح اس قوم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا اور ان کو حرامی کہا اور ان کی ماں حضرت مریم علیہا السلام کو زانیہ قرار دیا۔

قرآنِ کریم میں ہے :

﴿ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ (البقرة :٦١)

(یہ (پھٹکار ان پر) اس لیے ہے کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور حضراتِ انبیا کو ناحق قتل کرتے تھے، یہ اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے اور حد سے بڑھ جاتے تھے۔)

اس آیت میں جہاں یہ ہے کہ یہود، حضرات انبیا کو ناحق قتل کرتے تھے، وہیں یہ بھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب غلو کی وجہ سے تھا؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اخیر جملے میں فرمایا: ﴿كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ (وہ حد سے بڑھ جاتے تھے) اسی کا نام ”غلو“ ہے۔

ایک غلو ان کے یہاں یہ پیدا ہوا کہ جو قانونِ شرع پسند آیا اور نفس کے مطابق معلوم ہوا، اس کو قبول کرلیا کرتے اور جو نفس کے تقاضوں سے متصادم ہوتا، اس کا انکار کردیا کرتے تھے اور پھر اسی کو بنیاد بنا کر حضراتِ انبیا کو قتل بھی کردیا کرتے تھے۔

---

(۱) المؤطا للمالك :١٥٨٣، الصحيح للبخاري :٤٣٧، الصحيح للمسلم :١٢١٤، مسند أحمد :٧٨١٨

ایک دوسرے مقام پر ان یہودیوں کی غلو آمیز عادت وخصلت کے بارے میں کہا گیا ہے:

﴿ اَفَکُلَّمَا جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌۢ بِمَا لَا تَہۡوٰۤی اَنۡفُسُکُمُ اسۡتَکۡبَرۡتُمۡ فَفَرِیۡقًا کَذَّبۡتُمۡ وَ فَرِیۡقًا تَقۡتُلُوۡنَ ﴾ (البقرۃ:۸۷)

(آخر کیا معاملہ ہے کہ جب کبھی کوئی پیغمبر تمھارے پاس اس چیز کے ساتھ آیا، جو تمھارے نفس کو نہ بھاتی تھی، تو تم اکڑنے لگتے، پھر بعض پیغمبروں کو جھٹلاتے اور بعض کو قتل کرتے تھے۔)

یہ تھا وہ غلو جو خواہشاتِ نفس کی بنا پر پیدا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے جو بات پسند آئی، لے لی اور جو پسند نہ آئی اس کو رد کر دیا؛ حتی کہ ان انبیا کو جھٹلایا بھی اور قتل بھی کیا۔

اس طرح اس قوم نے کبھی تو افراط سے کام لے کر غلو کیا، تو کبھی تفریط کا ارتکاب کر کے غلو کیا۔

نصاریٰ کا دین میں غلو

اور رہے نصاری، تو تاریخِ مذاہب کی گواہی یہی ہے کہ وہ بھی اسی طرح افراط و تفریط کا شکار رہے، انھوں نے ایک جانب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا دیا؛ بل کہ بعض نے تو ان کو خود خدا بنا دیا اور اس سلسلے میں عجیب و بے ڈھنگی باتوں میں مبتلا ہو گئے۔

قرآنِ کریم میں ان عیسائی نظریات کی بھر پور طریقے پر تردید کی گئی ہے، چناں چہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا ٹھیرانے والوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

﴿ لَقَدۡ کَفَرَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡمَسِیۡحُ ابۡنُ مَرۡیَمَ وَقَالَ الۡمَسِیۡحُ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اعۡبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیۡ وَرَبَّکُمۡ اِنَّہٗ

مَن يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ وَمَا لِلظَّالِمِيْنَ مِنْ أَنصَارٍ﴿ (المائدۃ :۷۲)

(تحقیق کہ ان لوگوں نے کفر کیا، جنھوں نے کہا کہ مسیح بن مریم علیہ السلام ہی اللہ ہیں اور حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا کہ اے بنی اسرائیل ! اللہ کی عبادت کرو! جو کہ میرا اور تمھارا پروردگار ہے اور بلاشبہ جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر جنت کو حرام کردیتا ہے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ۔)

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے مشہور عیسائی (Maurice Relton) کا بیان بہ حوالہ (STUDIES IN CHRISTIAN DOCTRINE) نقل کیا ہے کہ اس نے اس عقیدے کی تشریح اس طرح کی ہے:

"کیتھولک عقیدے کا کہنا ہے کہ وہ ذات جو خدا تھی ، خدائی صفات کو چھوڑے بغیر انسان بن گئی ، یعنی اس نے ہمارے جیسے وجود کی کیفیات اختیار کرلیں ، جو زمان و مکان کی قیود میں مقید ہے اور ایک عرصے تک ہمارے درمیان مقیم رہی ۔"(۱)

اسی طرح آپ نے (Encyclopedia of Religions and Ethics) کے حوالے سے "الفریڈ ای گارو" کا یہ قول نقل کیا ہے:

"وہ (حضرت مسیح) حقیقۃً خدا بھی تھے اور انسان بھی ، ان کی ان دونوں حقیقتوں میں سے کسی ایک کے انکار یا ان کے وجود میں دونوں کے متحد ہونے کے انکار ہی سے مختلف بدعتی نظریات پیدا ہوئے؛ لہٰذا منظور شدہ فارمولا یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ایک شخصیت

---

(۱) مقدمہ: بائبل سے قرآن تک: ۱/۵۹

میں دو ماہیتیں جمع ہوگئی تھیں۔‘‘(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ ان کے شرک کی بنیاد بھی وہی عقیدت کا غلو اور محبت میں تجاوز ہے، اسی کی بنا پر انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مقام ’’عبدیت‘‘ سے اٹھا کر مقام ’’اُلوہیت‘‘ تک پہنچا دیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدائی صفات سے متصف مان کر ان کی عبادت کو جائز ٹھیرالیا۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہنے والوں کے بارے میں اوپر آیت گزر چکی ہے اور یہی لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تین خداؤں میں کا ایک مان کر توحید کے بہ جائے ’’تثلیث‘‘ کے قائل ہوئے، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْاْ إِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلاَثَةٍ وَمَا مِنْ إِلَـٰهٍ إِلاَّ إِلَـٰهٌ وَاحِدٌ وَإِن لَّمْ يَنتَهُواْ عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُواْ مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ﴾ (المائدۃ: ۷۳)

(تحقیق کہ ان لوگوں نے کفر کیا، جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تین میں سے تیسرا ہے، حال آں کہ ایک خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور اگر یہ لوگ ان باتوں سے نہیں باز آئے، جو وہ کہتے ہیں، تو ضرور ان کافروں کو دردناک عذاب آئے گا۔)

اس مشرکانہ عقیدے کی تشریح (Encyclopedia Britannica) میں اس طرح کی گئی ہے:

’’تثلیث کے عیسائی نظریے کو ان الفاظ میں اچھی طرح تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ باپ، خدا ہے، بیٹا خدا ہے اور روح القدس خدا ہے؛ لیکن یہ مل کر تین خدا نہیں ہیں؛ بل کہ ایک ہی خدا ہیں؛ اس لیے کہ عیسائی

(۱) مقدمہ: بائبل سے قرآن تک: ۱/۶۰

نظریے کے مطابق ہم جس طرح ان تینوں میں سے ہر ایک اقنوم کو خدا اور آقا سمجھنے پر مجبور ہیں، اسی طرح ہمیں کیتھولک مذہب نے اس بات کی بھی ممانعت کردی ہے کہ ہم ان کو تین خدا یا تین آقا سمجھنے لگیں۔‘‘(۱)

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے مشہور عیسائی عالم (St. Augustine) کی کتاب (On The Trinity) سے اس عقیدے کی وضاحت میں اس کا یہ قول نقل کیا ہے:

’’عہدِ قدیم اور عہدِ جدید کے وہ تمام کیتھولک علما، جنھیں پڑھنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے اور جنھوں نے مجھ سے پہلے ’’تثلیث‘‘ کے موضوع پر لکھا ہے، وہ سب مقدس صحیفوں کی روشنی میں اس نظریے کی تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ باپ، بیٹا اور روح القدس مل کر ایک ’’خدائی وحدت‘‘ تیار کرتے ہیں، جو اپنی ماہیت اور حقیقت کے اعتبار سے ایک اور نا قابل تقسیم ہے؛ اسی وجہ سے وہ تین خدا نہیں ہیں؛ بل کہ ایک خدا ہے، اگرچہ باپ نے بیٹے کو پیدا کیا؛ لہٰذا جو باپ ہے، وہ بیٹا نہیں، اسی طرح بیٹا باپ سے پیدا ہوا ہے؛ اس لیے جو بیٹا ہے، وہ باپ نہیں اور روح القدس بھی نہ باپ ہے نہ بیٹا؛ بل کہ باپ اور بیٹے کی روح ہے، جو دونوں کے ساتھ مساوی حیثیت اور ’’تثلیثی وحدت‘‘ میں ان کی حصہ دار ہے۔‘‘(۲)

نیز عیسائیوں نے غلو کے نتیجے میں اپنے پیشواؤں اور علما و مشائخ کو خدائی کا مقام دیتے ہوئے ان کو تحلیل و تحریم کا حق دے دیا تھا، جس کا ذکر قرآن میں اللہ تعالیٰ

---

(۱) مقدمہ: بائبل سے قرآن تک: ۱/۴۵

(۲) مقدمہ: بائبل سے قرآن تک: ۱/۴۵

اور حدیث میں نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے کیا ہے۔

قرآنِ کریم میں ہے:

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ، وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ، سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ (التوبۃ:۳۱)

(ان لوگوں نے اپنے علما و مشائخ کو اللہ کے علاوہ خدا بنالیا تھا اور اسی طرح مسیح بن مریم عَلَیْہِ السَّلَام کو بھی، حال آں کہ ان کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ ایک خدا کی عبادت کریں، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ان کے شرک سے پاک ہے۔)

یہاں احبار و رہبان اور حضرت عیسیٰ کو خدا بنا لینے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ان کو حلال وحرام کرنے کا مختار و مجاز سمجھتے تھے، اس آیت میں اسی پر ان کی گرفت کی گئی اور مذمت بیان کی گئی ہے۔

مولانا عبد الماجد دریابادی رَحِمَہُ اللّٰہ اس آیت کی مراد کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”یعنی انھیں مستقلاً ایسا صاحبِ اختیار مان رکھا ہے کہ گویا وہی معبود اور رب ہیں، جو چاہیں جائز کریں، جو چاہیں حرام ٹھیرادیں، سارے اختیارات شریعت و قانون سازی کے انھیں کو حاصل ہیں۔“

مزید لکھتے ہیں:

”مسیحیوں میں فرقۂ کیتھولک میں پوپ (پاپائے روم) بہ حیثیتِ نائبِ مسیح آج بھی سارے اختیارات علانیہ رکھتا ہے اور فرقۂ پروٹسٹنٹ نے بھی عملاً سارے اختیارات کلیسا کو دے رکھے ہیں، یہود کے ہاں

بھی ربیوں کے احکام خود توریت کی تعلیمات پر غالب آگئے تھے۔“(۱)

اور حدیث میں خود حضرت جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے یہی بات واضح کی ہے، چناں چہ آپ ﷺ کی خدمت میں حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ آئے، جو پہلے عیسائی تھے، پھر ایمان لے آئے تھے، تو ان کے گلے میں سونے کی صلیب لٹک رہی تھی، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اس کو نکال دو اور آپ اوپر والی آیت تلاوت کرنے لگے، حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! یہ عیسائی لوگ تو علما و مشائخ کی عبادت تو نہیں کرتے تھے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

”أجل! ولكن يحلون لهم ما حرم الله فيستحلونه، و يحرمون عليهم ما أحل الله فيحرمونه، فتلك عبادتهم لهم.“(۲)

(ہاں! لیکن (ان کے علما و مشائخ) ان کے لیے ان چیزوں کو حلال کر دیا کرتے، جن کو اللہ نے حرام کیا تھا، پس یہ لوگ ان چیزوں کو حلال سمجھ جاتے تھے اور وہ لوگ ان کے لیے ان باتوں کو حرام کر دیا کرتے تھے، جن کو اللہ نے حلال کیا تھا، پس یہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے تھے، پس یہی ان کے لیے عبادت ہے۔)

نیز حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ کیا یہ عیسائی لوگ اپنے علما و مشائخ کے لیے نماز پڑھتے تھے؟ فرمایا کہ نہیں؛ لیکن وہ ان کے لیے اللہ کی حرام کردہ چیز کو حلال کر دیتے تھے اور لوگ اس کو حلال سمجھ جاتے اور یہ علما و مشائخ اللہ کی حلال

---

(۱) تفسیر ماجدی: ۲/۳۴۷

(۲) السنن للبيهقي: ۲۰۸۴۷، سنن الترمذي: ۳۳۷۸

کردہ چیز کو حرام کر دیتے، تو یہ لوگ اس کو حرام سمجھتے۔ اس طرح وہ ان کے خدا ہو گئے۔"(۱)

نیز ایک غلو ان کا یہ تھا کہ "رہبانیت" کو اختیار کر لیا تھا، جس کا نہ خدا نے حکم دیا تھا، نہ خدا کے فرستادوں نے لاگو کیا تھا؛ بل کہ اپنی جانب سے اس کو جاری و نافذ کر لیا اور اس کو ثوابِ عظیم کا راستہ قرار دے لیا، پھر اس "رہبانیت" میں بھی غلو کرتے کرتے اس کی انتہا کو پہنچ گئے۔

اس سلسلے میں ان کے غلو کا حال سن کر یا پڑھ کر حیرت ہوتی ہے، یہاں میں حضرت مفکرِ اسلام مولانا ابو الحسن علی ندوی رَحِمَهُ اللهُ کی کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" سے چند اقتباسات نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں؛ تاکہ ان کے غلو کی کیفیت و حالت کا اندازہ کیا جا سکے۔ آپ نے "تاریخِ اخلاقِ یورپ" کے حوالے سے لکھا ہے:

> "سینٹ جروم کے زمانے میں "ایسٹر" کی تقریب میں تقریباً پچاس ہزار راہب جمع ہوتے تھے، چوتھی صدی میں صرف ایک راہب کی ماتحتی میں پانچ ہزار راہب تھے، سینٹ سراپین کی ماتحتی میں دس ہزار راہب تھے اور چوتھی صدی کے خاتمے پر تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ جتنی خود مصر کے شہریوں کی آبادی تھی تقریباً اسی قدر ان زاہدوں اور راہبوں کی تھی۔
>
> دو چار سال نہیں، کوئی پورے دو سو سال تک جسم کشی منتہائے اخلاق سمجھی جاتی رہی۔ مؤرخین نے اس کی بڑی لرزہ خیز مثالیں پیش کی ہیں؛ سینٹ میکیریس اسکندری کی بابت مشہور ہے کہ وہ چھ ماہ تک برابر ایک دلدل میں سویا کیے؛ تاکہ ان کے برہنہ جسم کو زہریلی مکھیاں ڈسیں؛ نیز

---

(۱) السنن للبیهقي: ۲۰۸۴۸، شعب الإیمان: ۲۲/۱۲

یہ کہ یہ ہمیشہ ایک من لوہے کا وزن اپنے اوپر لادے رہتے تھے، ان کے مرید شینٹ یوسیس تقریباً دو من لوہے کا وزن لادے رہتے تھے اور تین سال تک ایک خشک کنویں کے اندر مقیم رہے؛ ایک مشہور راہب یوحنا کے متعلق منقول ہے کہ وہ مستقل تین سال تک کھڑے ہوئے عبادت کرتے رہے، بعض زاہد لباس کسی قسم کا استعمال نہیں کرتے تھے؛ ستر پوشی کا کام اپنے جسم کے بالوں سے لیتے تھے اور چوپاؤں کی طرح ہاتھ پیر کے بل چلتے تھے، راہبوں کے مسکن علی العموم اس وقت مکانات نہیں ہوتے تھے؛ بلکہ وحشی درندوں کے غار، خشک کنویں، یا قبرستان ہوتے تھے، اہل زہد کا ایک طائفہ صرف گھاس کھاتا تھا، جسم کی طہارت روح کی پاکیزگی کے منافی سمجھی جاتی تھی اور جو زاہد مرتبۂ زہد میں زیادہ ترقی کر جاتے تھے اسی قدر وہ مجسمۂ عفونت و غلاظت ہوتے۔ سینٹ اتھینیس نہایت فخر سے بیان کرتا ہے کہ سینٹ انٹونی بایں کبرسنی کبھی مدت العمر اپنے پیر دھونے کے عصیان کا مرتکب نہیں ہوا، سینٹ ابرہام نے پنجاہ سالہ مسیحی زندگی میں اپنے چہرہ یا پیر پر پانی کی چھینٹ پڑنے نہ دی۔

عورتوں کے سایے سے وہ بھاگتے تھے، ان کا سایہ پڑ جانے سے اور راستے گلی میں اتفاقاً سامنا ہو جانے سے وہ سمجھتے تھے کہ ساری عمر کی زہد و ریاضت کی کمائی خاک میں مل جاتی ہے، اپنی ماؤں، بیویوں، حقیقی بہنوں سے بات کرنا بھی وہ معصیتِ کبیرہ سمجھتے تھے۔" (۱)

اس سے موجودہ عیسائی مذہب کی صورتِ حال اور اس کے ماننے والوں کی غلو پسند طبیعتوں کا اندازہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے۔

---

(۱) دیکھو: انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر: ۲۱۱-۲۱۳

مشرکین وکفارِ عرب کا غلو

اسی طرح ایک غلو مشرکین و کفار نے جاری کیا اور اللہ کے دین میں تحریف و تبدیلی کردی اور یہاں بھی وہی عقیدت ومحبت کے غلو نے ان کو بھی بتوں کی پرستش میں لگا دیا اور مخلوق کو خدا کے برابر کردیا اور اللہ کی صفات وخصوصیات کو مخلوقِ خدا کے لیے ماننے لگے اور پھر اس شرک کے جواز وخوبی پر من گھڑت دلیلیں بھی بیان کرنے لگے، جیسے قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ، مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ (الزمر: ۳)

(اور جن لوگوں نے اللہ کے علاوہ دوسروں کو خدا بنا لیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ اللہ کے نزدیک ہماری سفارش کرکے ہمیں اللہ کے قریب کردیں۔)

اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں مشہور مفسرِ قرآن، امام وعلامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ جب ان (مشرکین) سے کہا جاتا کہ تمھارا رب اور خالق کون ہے اور آسمانوں اور زمین سے پیدا کرنے اور آسمان سے بارش برسانے والا کون ہے؟ تو کہتے کہ ''اللہ'' ہے، پھر جب ان سے پوچھا جاتا کہ پھر بتوں کی عبادت کے کیا معنے؟ تو کہتے کہ یہ بت ہم کو اللہ سے قریب کرتے اور ہماری سفارش کرتے ہیں''۔(۱)

---

(۱) القرطبي: ۱۵/۲۳۳

اور مفسر قرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَهُ اللهُ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"یہ مشرکینِ عرب کا حال ہے اور اس زمانے کے عام مشرکین بھی تقریباً یہی عقیدہ رکھتے تھے، خالق و مالک اور تمام کاموں میں متصرف تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، شیطان نے ان کو بہکایا، تو اپنی خیال کے مطابق فرشتوں کی شکلوں کے بت تراشے اور یہ جانتے ہوئے کہ یہ بت ہمارے بنائے ہوئے ہیں، انھیں کوئی عقل و شعور اور قوت و قدرت نہیں، ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ان بتوں کی تعظیم و تکریم سے وہ فرشتے ہم سے خوش ہوں گے، جن کی شکلوں پر بت بنائے گئے ہیں اور فرشتے اللہ کے نزدیک مقرب ہیں۔ انھوں نے بارگاہ خداوندی کو دنیا کے بادشاہوں پر قیاس کیا کہ جیسے شاہی مقرب کسی سے خوش ہوں، تو وہ باشاہ کے پاس ان کی سفارش کر کے ان کو بھی بادشاہ کا مقرب بنا دیتے ہیں، یہ سمجھتے تھے کہ فرشتے بھی بادشاہی درباریوں کی طرح جس کی چاہیں سفارش کر سکتے ہیں؛ مگر ان کے یہ خیالات شیطانی تلبیس اور باطل ہی باطل تھے۔" (۱)

اور حضرت مولانا عبد الماجد دریابادی رَحِمَهُ اللهُ لکھتے ہیں:

"اس مختصر سے فقرے میں شرک کا سارا فلسفہ آ گیا ہے، حضراتِ انبیا کی مسلسل تعلیم و تبلیغ کا اثر دنیا پر یہ پڑا کہ اب کوئی بڑے سے بڑا مشرک فرقہ بھی کھلم کھلا دو یا زائد خداؤں کا قائل نہیں رہا؛ بل کہ ہر ایک اپنے کو مشرک کہلاتے شرمانے لگا ہے اور اپنے شرک کی طرح طرح تاویل

---

(۱) معارف القرآن: ۷/۵۳۷

کرنے پر مجبور ہو گیا ہے، تو اب مشرکین کہتے کیا ہیں؟ کہ خدائے عظیم و برتر تو بس ہمارا بھی ایک ہی ہے؛ لیکن بات یہ ہے کہ کائنات کے ہر ہر شعبۂ حیات کا انتظام و تصرف تو الگ الگ دیوی، دیوتا یا خدائے اصغر کے سپرد ہے اور ہم تو ان دیوی، دیوتاؤں کو محض ایک واسطہ و وسیلہ اسی معبود اعظم تک رسائی کے لیے بنائے ہوئے ہیں۔" (۱)

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے ان مشرکین کے بارے میں ارشاد فرمایا :

﴿ وَيَعْبُدُوْنَ مِن دُوْنِ اللّٰهِ مَا لاَ يَضُرُّهُمْ وَلاَ يَنفَعُهُمْ وَيَقُولُوْنَ هٰـؤُلَآءِ شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللّٰهِ ، قُلْ أَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لاَ يَعْلَمُ فِيْ السَّمٰوَاتِ وَلاَ فِيْ الأَرْضِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ (یونس: ۱۸)

(وہ عبادت کرتے ہیں اللہ کے سوا ان چیزوں کی، جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتی ہیں اور نہ ان کو نفع دے سکتی ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بت تو اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں، آپ پوچھیے کہ کیا تم اللہ کو وہ بات بتاتے ہو جو وہ زمین و آسمان میں نہیں جانتا؟ وہ پاک ہے اور بلند ہے، ان چیزوں سے جو وہ اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہیں۔)

امام فخر الدین الرازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں مشرکین کی اس صورتِ حال کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے:

" فاعلم أن من الناس من قال : إن أولئک الکفار توهموا أن عبادة الأصنام أشد في تعظيم اللّٰه سبحانه و تعالى ، فقالوا: ليست لنا أهلية أن نشتغل بعبادة اللّٰه تعالى

(۱) تفسیر ماجدی: سورۃ الزمر / آیت: ۳

بل نحن نشتغل بعبادة هذه الأصنام ، و أنها تكون شفعاء نا عند اللّٰه ."

(جان لو کہ لوگوں میں سے بعض وہ ہیں، جو کہتے ہیں کہ ان کفار نے یہ وہم کرلیا تھا کہ بتوں کی عبادت سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی زیادہ تعظیم ہوتی ہے، پس انھوں نے کہا کہ ہم بہ راہِ راست اللہ کی عبادت میں مشغول ہونے کی اپنی میں اہلیت نہیں رکھتے ؛ بل کہ ہم تو بتوں کی عبادت میں مشغول ہوتے ہیں اور وہ بت اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں۔)(۱)

اور علامہ شبیر احمد عثمانی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے ''ترجمہ شیخ الہند'' پر اپنے ''فوائد'' میں لکھا ہے:

''خدا کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں، جن کے قبضہ قدرت میں نفع اور ضرر کچھ نہیں ، جب پوچھا جاتا ہے،تو کہتے ہیں کہ بے شک بڑا خدا تو ایک ہی ہے، جس نے آسمان وزمین پیدا کیے؛ مگر ان اصنام (بتوں) وغیرہ کو خوش رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ سفارش کر کے بڑے خدا سے دنیا میں ہمارے اہم کام درست کرادیں گے اور اگر موت کے بعد دوسری زندگی کا سلسلہ ہوا،تو وہاں بھی ہماری سفارش کریں گے،باقی چھوٹے موٹے کام جو خود ان کے حدود واختیار میں ہیں،ان کا تعلق تو خود ان ہی سے ہے، بناءً علیہ ہم کو ان کی عبادت کرنی چاہیے۔''(۲)

---

(۱) التفسیر الکبیر: ۴۹/۱۷،تفسیر سورۃ یونس: آیت ۱۸/

(۲) تفسیر عثمانی: ۲۷۸

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے " حجة الله البالغة "اور
" الفوز الكبير " میں مشرک قوموں کی ان بے اعتدالیوں اور ان کے عقائد پر کلام
کرتے ہوئے جو بتایا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے :

"ان مشرکین کا عقیدہ و مذہب یہ تھا کہ جو لوگ نیک و مقرب تھے،
ان کو اللہ تعالیٰ نے مقامِ الوہیت عطا کر دیا، جیسے کوئی شہنشاہ ہو اور اس
کا غلام اس کی خدمت کرتا رہے اور خدمت عمدگی سے انجام دے، تو وہ
بادشاہ اس کو کسی جگہ کی حکومت کا خلعت عطا کر دیتا ہے اور اپنے زیرِ
فرمان شہروں میں سے کسی شہر کا نظام اس کے حوالے کر دیتا ہے اور اپنی
مملکت کے اطراف بعض علاقوں میں بھیجتا ہے اور ان کو جزوئی امور میں
تصرف کا حق دے دیتا ہے، پھر وہ بادشاہ جزوی امور کی طرف متوجہ
نہیں ہوتا اور دیگر لوگوں کے امور ان غلاموں کے ہی حوالے کر دیتا ہے
اور جو ان غلاموں کی خدمت کرے ان کے معاملات میں اپنے غلاموں
کی سفارش قبول کرتا ہے۔ اسی طرح مشرکین اس کے قائل تھے کہ اللہ
کے مخصوص و مقرب بندوں کا تقرب حاصل کرنا اور وسیلہ پکڑنا ضروری
ہے؛ تا کہ اللہ تعالیٰ بادشاہ مطلق کے دربار میں قبولیت آسان ہو اور ان
کے حق میں ان مقربین کی سفارش قبول ہو؛ نیز یہ مشرکین اس بات کے
قائل تھے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت جب ہی قبول ہوگی، جب اس کے
ساتھ ان بتوں کی عبادت بھی کی جائے؛ بل کہ وہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ تو
بہت ہی بلند و بالا ہے؛ لہٰذا اس کی عبادت بہ راہِ راست اس کے تقرب
کا ذریعہ نہیں بن سکتی؛ بل کہ ضروری ہے کہ ان بتوں و معبودوں کی
پوجا کی جائے؛ تا کہ وہ اللہ کے پاس ہماری سفارش کریں۔" (۱)

(۱) دیکھو حجة الله البالغة: ۱/۶۱۷ (اور) ۱/۱۸۳، الفوز الكبير: ۴

ایک غلو ان میں یہ تھا کہ اپنے بتوں کے لیے نذر و نیاز کے طور پر کوئی جانور مخصوص کر دیتے، اسی طرح کوئی جانور اللہ کے نام کا بھی نکالتے، پھر کسی وجہ سے اگر اللہ کے نام کا بتوں کے لیے دینا ہوتا، تو دے دیتے؛ لیکن بتوں کے نام کا اللہ کے نام پر نہ دیتے، یہ سارے تماشے خود اپنی جانب سے گھڑ کر ان لوگوں نے جاری کر لیے تھے۔

چناں چہ قرآنِ کریم کہتا ہے:

﴿وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَ هٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ، فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَ مَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ، سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ﴾ (الأنعام: ۱۳۶)

(اور ان لوگوں نے کھیتی و مویشی میں سے جو اللہ نے پیدا کیے ہیں، کچھ حصہ اللہ کا مقرر کر رکھا ہے اور اپنے خیال کے مطابق کہتے ہیں کہ یہ حصہ اللہ کا ہے اور یہ ہمارے دیوتاؤں کا اور پھر جو حصہ ان کے دیوتاؤں کا ہوتا ہے، وہ تو اللہ کی طرف پہنچتا نہیں اور جو حصہ اللہ کا ہوتا ہے، وہ دیوتاؤں کی طرف پہنچتا ہے، کس قدر برا ہے ان کا فیصلہ!!)

ان لوگوں کے اس غلو کی وضاحت حضرت مولانا عبد الماجد دریابادی رحمہ اللہ سے سنیے، وہ لکھتے ہیں:

”جاہلیتِ عرب میں ایک دستور یہ بھی تھا کہ یہ لوگ اپنی سالانہ پیداوار وغیرہ میں سے ایک حصہ بہ طور خیر خیرات الگ نکال رکھتے، اس میں سے ایک جز اللہ تعالیٰ کے نام کا رکھتے اور اسے مسافروں، مسکینوں، مہمانوں پر خرچ کرتے اور ایک جز اپنے دیوتاؤں کے لیے نامزد

کر دیتے، اسے مجاوروں، پنڈتوں، پروہتوں کے ذریعے مندروں میں بتوں اور مورتیوں پر چڑھاتے، اصولی ونظری حیثیت سے تو یہی تقسیم تھی؛ لیکن عملاً یہ بھی تھا کہ دونوں حصوں میں اگر اتفاق سے کچھ خلط ہو جاتا، تو کل کا کل دیوتاؤں ہی کے چڑھاوے پر منتقل کر دیتے، یا اگر دیکھتے کہ عمدہ مال اللہ والے حصے میں چلا جا رہا ہے، جب بھی اسے دیوتاؤں کی طرف کر دیتے، یہاں ان کی اس دہری حماقت پر توجہ دلائی ہے۔‘‘(۱)

ان مشرکین کے ایک اور غلو کی جانب قرآنِ کریم میں اشارہ ہے کہ یہ لوگ جب حج کے لیے اپنے گھروں سے نکل جاتے اور اس کے بعد پھر کسی ضرورت سے ان کو اپنے گھر جانا ہوتا، تو گھروں کے پچھواڑے سے جاتے، دروازے سے جانے کو برا خیال کرتے تھے۔ قرآنِ کریم میں اس پر رد فرماتے ہوئے ارشاد ہے:

﴿وَ لَیۡسَ الۡبِرُّ بِاَنۡ تَاۡتُوا الۡبُیُوۡتَ مِنۡ ظُهُوۡرِهَا وَ لٰكِنَّ الۡبِرَّ مَنِ اتَّقٰی وَاۡتُوا الۡبُیُوۡتَ مِنۡ اَبۡوَابِهَا وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ﴾ (البَقَرَة :۱۸۹)

(اور یہ کوئی نیکی نہیں کہ تم گھروں کو ان کے پچھواڑوں سے آؤ؛ لیکن نیکی یہ ہے کہ کوئی اللہ سے ڈرے اور تم گھروں کو ان کے دروازوں سے داخل ہو، اللہ سے ڈرو؛ تاکہ تم کامیاب ہو۔)

مفسرین نے لکھا ہے کہ جاہلیت میں لوگ حج کا احرام باندھنے کے بعد گھروں کے دروازوں سے داخل نہیں ہوتے تھے؛ بل کہ دیوار پھاند کر داخل ہوتے تھے، یا پچھواڑے سے داخل ہوتے تھے، کسی نے اس کے خلاف یہ کیا کہ وہ دروازے سے

---

(۱) تفسیر ماجدی:۲/۱۰۶

داخل ہوگیا، تو لوگوں نے اس کو برا بھلا کہا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں ان کو بتایا گیا کہ پچھواڑے سے داخل ہونے میں کوئی خوبی و نیکی کی بات نہیں ہے؛ لہٰذا دروازوں سے داخل ہوا کرو۔ (۱)

اسی طرح ایک غلو، ان کا یہ تھا کہ قریش کے سوا دوسرے لوگ جب حج یا عمرے میں یا کسی اور موقعے پر طواف کرنے جاتے، تو مادرزاد برہنہ ہوکر طواف کرتے تھے۔ (۲)

الغرض اعتقادی و عملی غلو کی مختلف شکلیں تھیں، جن کو ان مشرکین نے جاری کیا ہوا تھا اور ان ساری بے وقوفیوں و بے اعتدالیوں کو دین و مذہب سمجھتے تھے۔

---

(۱) التفسير للطبري:۵۵۶/۳، تفسير ابن كثير:۵۵۲/۱

(۲) دیکھو: الصحيح للبخاري:۱۶۶۵، فتح الباري:۲۵۳/۱۰

غلو فی الدین کے اسباب

جہالت و ناواقفیت

علم میں عدم رسوخ و تفقہ کی کمی

جاہلی تعصب

اتباعِ ہویٰ یعنی خواہشات کی پیروی

عقل پرستی

تقلید آبا یا اتباعِ عادات

چوتھی فصل

غلو فی الدین کے اسباب

غلو کی حقیقت اور اس کی قرآن و حدیث کی روشنی میں مذمت و حرمت اور مختلف مذاہب کے لوگوں میں جاری کیے جانے والے غلو کی کیفیت بیان کرنے کے بعد اب ہم چاہتے ہیں کہ لوگوں میں غلو پیدا ہونے کے اسباب و بواعث پر روشنی ڈالیں؛ تا کہ اس بیماری سے بچنا و بچانا آسان ہو؛ کیوں کہ بیماری کے اسباب کی تشخیص کے بغیر بیماری کا علاج نہایت مشکل ہوتا ہے۔

غلو فی الدین کے اسباب تو بہت ہو سکتے ہیں؛ لیکن یہاں اختصار کے پیشِ نظر اور اس لیے کہ ان میں سے اہم چند ہیں، ہم ان اہم اسباب پر روشنی ڈالیں گے:

جہالت و ناواقفیت

دین میں غلو کا ایک اہم اور بڑا سبب دین سے ناواقفیت و جہالت ہوا کرتا ہے؛ کیوں کہ جب علمِ دین سے انسان محروم ہوتا ہے، تو اس کو کسی بھی چیز کے حدود کا علم کہاں سے ہوسکتا ہے؟ لٰہذا وہ اپنی جہالت کی وجہ سے دین کے حدود کے سلسلے میں غیرِ صحیح تصورات قائم کر لیتا ہے اور پھر اسی کی وجہ سے حدودِ شرع کو پھلانگتا اور مختلف صورتوں سے دین میں غلو و تجاوز کا ارتکاب کرتا رہتا ہے، کسی چیز کو اپنی حد سے بڑھا دیتا اور کسی کو اپنی حد سے گھٹا دیتا ہے، اکثر جہلا میں غلو کی بیماری کا سبب یہی جہالت ہوتا ہے۔

جہالت کی مذمت

اسلام نے من جملہ اور اسباب کے اس وجہ سے بھی جہالت کو ناپسند کیا ہے اور

جہالت کی مذمت بیان کی ہے۔

جہالت کی مذمت میں یہ بات کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی پہلی سورت ﴿الفَاتِحَۃ﴾ میں فرمایا:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ، صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ، غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ﴾

(اے اللہ ہمیں سیدھے راستے پر چلا، ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو نے انعام فرمایا، نہ کہ ان کے راستے پر جن پر غضب نازل ہوا اور نہ ان کے جو بے راہ ہوئے۔) (الفَاتِحَۃ :۷-۵)

یہاں ان آیات میں غور کیجیے کہ ان میں ایک تو ''صراطِ مستقیم'' (سیدھے راستے) کا ذکر کیا گیا ہے، دوسرے اس ''سیدھے راستے'' کی تعیین دو طرح سے کی گئی ہے، ایک تو اس طرح کہ اس کو اللہ کی جانب سے انعام پانے والوں کا راستہ قرار دیا گیا ہے، دوسرے غضب و پھٹکار والوں اور بے راہوں کے راستوں سے اس کو الگ قرار دیا گیا۔ لہٰذا ''صراطِ مستقیم'' وہ ہے جو اللہ کی جانب سے انعام پانے والوں کا اختیار کردہ راستہ ہے، رہا وہ راستہ جس پر خدا کی پھٹکار و غضب والے چلتے ہیں، وہ سیدھا راستہ نہیں، اسی طرح وہ راستہ جس پر ضال و گمراہ لوگ چلتے ہیں، وہ بھی سیدھا راستہ نہیں ہے۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ یہاں ﴿المغضوب علیھم﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں، جو علم ہونے کے باوجود نفس پرستی و ہوا پرستی کی وجہ سے علم کے تقاضوں کو پس پشت ڈال کر زندگی کرتے ہیں اور ﴿الضالین﴾ یعنی بے راہوں سے مراد وہ لوگ ہیں، جن کے پاس علم ہی سرے سے نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ علم ہونے کے باوجود علم کے بہ جائے نفس پرستی کی راہ پر چلنا بھی ''صراطِ مستقیم'' نہیں ہے اور علم ہی سے بے بہرہ ہونا یا رہنا اور جہالت کے ساتھ

زندگی کرنا بھی ''صراطِ مستقیم'' نہیں ہے۔

اس تحقیق سے واضح ہو گیا کہ قرآن کی نظر میں جہالت کس قدر بد بختانہ مرض و عیب ہے کہ اس کا شکار کبھی صراطِ مستقیم کو نہیں پا سکتا اور گمراہی و بے راہی کی زندگی گزارتا ہے۔

ایک جگہ فرمایا گیا:

﴿فَلاَ تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ﴾ (اور تم جاہلین میں سے نہ ہو جانا۔)
(الأنعام: ۳۵)

نیز اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں جگہ جگہ ان لوگوں کی مذمت بیان کی ہے، جو جہل میں پڑے ہوئے ہیں۔

جہالت: علامتِ قیامت

اسی لیے احادیثِ نبویہ میں ''جہالت'' کو قیامت کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ چند احادیث ملاحظہ کیجیے:

(۱) حضرت ابو موسی اشعری اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''إِنّ بينَ يديِ الساعةِ لأياماً ، ينزِل فيها الجهل، و يرفع فيها العلم ، و يكثر فيها الهرج ، والهرج : القتل.''

(بلا شبہ قیامت سے پہلے ایسے دن آئیں گے، جن میں جہل نازل ہوگا اور علم اٹھا لیا جائے گا اور ہرج کی کثرت ہوگی اور ہرج کے معنی قتل کے ہیں۔)(۱)

---

(۱) الصحيح للبخاري: ۷۰۶۲، سنن الترمذي: ۲۲۰۰، مصنف ابن أبي شيبة: ۲۳۴، مسند أحمد: ۴۳۰۶

(۲) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إنّ مِن أشراطِ الساعةِ أن يرفعَ العلم، و يبث الجهل، و يشرب الخمر، و يظهر الزنا."

(بے شک قیامت کی علامات میں سے یہ ہے کہ علم اٹھا لیا جائے گا اور جہل پھیل جائے گا اور شراب پیا جائے گا اور زنا عام ہو جائے گا۔)(۱)

اور حقیقت یہ ہے کہ جہالت ہر بیماری و خرابی کے لیے "ام الاسباب" کی حیثیت رکھتی ہے، وہ کونسی روحانی بیماری ہے، جو جہالت سے پیدا نہیں ہوتی؟ وہ کونسا باطنی روگ ہے جس کی پیداوار کے پیچھے اس کا ہاتھ نہیں؟ ہر روحانی بیماری کے پیچھے اگر کوئی اور سبب نہیں ہے، تو وہاں ضرور یہ "جہالت" کارفرما ہوگی، اسی طرح غلو فی الدین کی بیماری کا بڑا سبب "جہالت" ہے، جس کی وجہ سے دین کو ایک کھلواڑ بنا لیا جاتا ہے اور اس میں کمی بیشی، گھٹانا و بڑھانا، تقدیم و تاخیر وغیرہ کے ذریعے غلو کیا جاتا ہے اور اللہ کی قائم کردہ حدود کو پامال کر دیا جاتا ہے۔

جہالت کی کرشمہ کاریاں

امام لالکائی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "اعتقاد أهل السنة" میں یہ حیرت انگیز واقعہ لکھا ہے، جس سے "جہالت" کا کرشمہ دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ خارجی فرقے کے دو شخصوں نے کعبۃ اللہ کا طواف کیا، پھر ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ اللہ کی اس مخلوق میں سے تیرے اور میرے سوا جنت میں کوئی داخل نہیں ہوگا، اس کے ساتھی نے کہا کہ وہ جنت جس کا عرض زمین و آسمان کے برابر ہے، کیا وہ صرف ہم دونوں کے لیے بنائی گئی ہے؟ تو اس نے کہا کہ ہاں! اس پر اس کے

(۱) الصحيح للبخاري:۸۰، سنن الترمذي:۲۲۰۵، السنن الكبرى للنسائي:۵۹۰۵

ساتھی نے خارجی مذہب چھوڑ دیا اور اس سے یہ کہہ کر الگ ہوگیا کہ یہ جنت تو صرف تجھے ہی مبارک ہو۔(۱)

''غلو وتجاوز عن الحدود'' کی یہ انتہا دیکھیے اور افسوس کیجیے کہ جب آدمی علم سے محروم ہوتا ہے، تو غلو کی کس انتہا کو پہنچ جاتا ہے؟! حتی کہ اس کو اپنی اس جہالت کا علم بھی نہیں ہوتا۔

جہالت کی اس بے اعتدالی کا اندازہ اس واقعے سے ہوگا کہ ایک مولانا نے ایک شخص کو ایک ناجائز کام پر تنبیہ کی اور کہا کہ یہ ناجائز ہے؛ لہٰذا یہ ترک کردیں، تو وہ شخص جو دینی علم سے کورا تھا، کہنے لگا کہ مولانا! یہ کپڑے جو آپ پہنے ہوئے ہیں، یہ کیسے جائز ہو گئے؟ کیا رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم نے کبھی ایسے کپڑے پہنے تھے؟ اس واقعے سے جہالت کی کارفرمائی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس شخص کے نزدیک یا تو وہ حرام کام جائز ہونا چاہیے یا نہیں تو مولانا کے کپڑے بھی حرام ہونا چاہیے۔

اسی کو غلو فی الدین کہا جاتا ہے کہ حرام کو جائز کے خانے میں داخل کیا جائے اور حلال کو حرام سمجھا جائے۔ اگر اس شخص کو علمِ دین کا ایک قابلِ لحاظ حصہ حاصل ہوتا، تو ایسی بے تکی بات اس کی زبان سے نہ نکلتی۔

علم میں عدم رسوخ وتفقہ کی کمی

غلو فی الدین کا ایک سبب یہ ہوتا ہے کہ علمِ دین میں رسوخ ومہارت نہیں ہوتی اور تفقہ وبصیرت میں کمی ہوتی ہے، اس کے باوجود نااہل لوگ فتوے دیں گے اور خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی راہِ حق سے بھٹکائیں گے۔ جیسے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

---

(۱) اعتقاد أهل السنة: ۱۳۰۲/۴

" إن الله لا ينزع العلم انتزاعاً ينتزعه من العِباد ؛ ولكن يقبض العلم بقبض العلماء ؛ حتى إذا لم يبق عالماً اتخذ الناسُ رؤوساً جهالاً ، فَسُئِلُوا فأفتوا بغير علم فضلوا و أضلوا ."

(بلا شبہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے اندر سے کھینچ کر علم نہیں اٹھا لیتے؛ لیکن علما کو موت دے کر علم کو اٹھا لیتے ہیں، یہاں تک کہ جب کسی عالم کو باقی نہ چھوڑیں گے، تو لوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنالیں گے اور ان سے سوال کریں گے اور وہ بغیر علم کے ان کو فتوے دیں گے، خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔)(۱)

خوارج وغیرہ باطل فرقوں کے غلو کا ایک سبب علم کی کمی تھی

چناں چہ بہت سے باطل فرقے اس لیے وجود میں آگئے کہ انھوں نے اسلامی تعلیم سے کما حقہ اور گہرائی و گیرائی سے واقفیت حاصل نہیں کی اور اپنی جہالت و کم علمی کی وجہ سے گمراہی کی جانب چلے گئے۔ ان کے سامنے قرآن وحدیث کے الفاظ تو تھے؛ مگر ان کو سمجھنے کا مستند سامان، اس کے لیے معقول وسائل نہیں تھے، وہ الفاظ قرآن و الفاظِ حدیث کو اپنی جہالتوں اور ناواقفیتوں سے تختۂ مشق بنائے ہوئے تھے۔ یہ لوگ سطحی علم اور موٹی عقل رکھتے تھے، درکِ مقاصد و فہمِ معانی اور استنباط و استخراج کی صلاحیتوں سے یکسر خالی تھے۔

اس کی مثال خوارج سے دی جا سکتی ہے، جنھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اختلاف کیا اور تحکیم والے مسئلے میں ان کو بعض آیات کی وجہ سے، اپنی کم فہمی و فقدانِ

---

(۱) الصحيح للبخاري:۱۰۰، الصحيح للمسلم:۶۹۷۱

تفقہ کی بنا پر نعوذ باللہ کافر قرار دیا اور صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہی نہیں؛ بل کہ آپ کے ساتھ جتنے صحابہ رضی اللہ عنہم تھے ان سب کو کافر قرار دیا۔ ان کے ہاتھوں میں قرآن کا نسخہ تھا، ان کی جبینیں نشاناتِ تہجد سے سیاہ تھیں، وہ خود کو سب سے بڑے علامہ اور سب سے زیادہ صاحبِ تقوی سمجھ رہے تھے، حتی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے مقابلے میں آ کھڑے ہوئے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب جنگ کے دوران لوگوں میں سے کسی کو حکم بنا کر تصفیہ کر لینے کی پیش کش کی، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو قبول کر لیا اور اللہ کے علاوہ کسی اور کو حکم ماننا کفر ہے۔ اس پر یہ لوگ بعض آیات سے استدلال کیا کرتے تھے، جیسے ﴿ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ ﴾ وغیرہ اور ان کی یہ سوئے فہمی اور جہالت یہاں تک بڑھ گئی کہ ان میں سے ایک نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا:

" أما والله يا علي ! لئن لم تدع تحكيم الرجال في كتاب الله عَزَّ وَ جَلَّ ، قاتلتک أطلب بذلک وجه اللّٰه ورضوانه. "

(اے علی! خدا کی قسم، اگر تم نے اللہ کی کتاب میں لوگوں کو حکم بنانا نہیں چھوڑا، تو میں آپ کو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے قتل کر دوں گا۔)(۱)

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت کے قتل کو گناہ کے بہ جائے عین صواب اور باعثِ ثواب سمجھ رہا ہے؛ حال آں کہ کسی کو حکم بنانا قرآن و سنت سے حرام یا کفر نہیں ہے اور یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقصود یہ تھا کہ کسی کو حکم بنا کر اس کے فیصلے کو قرآن و سنت کی روشنی میں قبول کیا جائے گا؛ مگر ان لوگوں کو ان کی جہالت یا کم علمی، فقدانِ

(۱) تاريخ الطبري:۵/۷۲

تفقہ اور بے بصیرتی نے اس حق کو باطل اور باطل کو حق کر دکھایا اور وہ دین و شریعت سے دور اور اہلِ سنت سے الگ ہو گئے۔ پھر ان لوگوں نے یہیں سے یہ عقیدہ بھی پیدا کرلیا کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر اور جہنمی ہے۔

اسی طرح متعدد فرقوں اور افراد نے دین و شریعت کے علوم میں رسوخ و مہارت نہ ہونے کے باوجود احکام و نظام شرع میں رائے زنی کی اور غلو فی الدین کے مرتکب ہوئے اور خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ آج بھی بعض لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ خوارج کے نقش قدم پر چلتے ہوئے قرآن و سنت کا حوالہ دے کر اسلاف کی توہین و تذلیل کرتے ہیں، ان کے فہم سے اپنے فہم کو بالا و برتر مانتے ہیں، حدیث کے معانی کا درک اور فہم و بصیرت سے عاری ہونے کے باوجود اس پر ضد و ہٹ کرتے ہیں۔ کوئی امام ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللہُ کو برا کہتا ہے، تو کوئی امام شافعی رَحِمَہُ اللہُ پر پھبتیاں کستا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ دراصل اسی کا اثر ہے جسے ان کی ''باقیاتِ سیئات'' کہا جائے تو غلط نہیں۔

عصرِ حاضر میں ناقص لوگوں سے دین کو نقصان

اسی جہل و دین میں بے بصیرتی کے دور دورے اور تسلط کا ایک خطرناک اثر یہ ہے کہ امت میں سے کوئی بھی جاہل و اناڑی، کوئی ڈاکٹر، کوئی انجینئر، کوئی پروفیسر، جنھوں نے نہ کسی معتبر اساتذہ سے قرآن و حدیث کے علوم و فنون پڑھے، نہ کسی کے سامنے زانوئے تلّمذ طے کیا، نہ ایک زمانے تک اس کو معتبر طریقے سے حاصل کیا؛ بل کہ صرف اپنے ذاتی مطالعے سے یا کسی اپنے ہی جیسے جاہل سے یا کسی اردو ترجمے کی مدد سے کچھ باتیں سیکھ لیں، ایسے لوگ قرآن و حدیث کی تشریح و تفہیم، فقہ و فتاوی میں اپنی رائے دیتے ہیں اور تمام مفسرین و محدثین، فقہا و علما کی تردید کرتے اور ان سب کے خلاف وہ کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ لوگ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ قرآن و

حدیث کو ہم جتنا سمجھتے ہیں، یہ علما نہیں سمجھتے اور دین کے بارے میں جس قدر بصیرت ہم کو ہے، علما اس سے خالی ہیں اور مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ امت کا ایک بہت بڑا طبقہ وہ ہے، جو اس جاہل وناقص کی باتیں ماننے وقبول کرنے پر تل جاتا ہے اور اسی کو حق سمجھتا اور قرآن وحدیث اور فقہ وفتاوی میں اسی کی رائے پر عمل کرتا دکھائی دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں از اول تا آخر تمام علما کی تفسیرات وتشریحات، ان کے بیان کردہ مسائل وتحقیقات اور ان کے فتاوی کو غلط قرار دیتا ہے۔

قیامت کی ایک نشانی

یہ بھی دراصل قیامت کے قریب ظاہر ہونے والی اسی مہیب جہالت کا ایک انتہائی خطرناک اثر ونتیجہ ہے، جس کا حاصل علم کو جہل سمجھ لینا اور جہل کو علم قرار دینا ہے۔ چناں چہ وقفے وقفے سے امت میں ایسے مدعیانِ علم ومجتہدانِ بے بصیرت پیدا وظاہر ہوتے اور قرآن وحدیث کا کھلواڑ کرتے اور اپنی تمام تر جہالتوں کے باوجود اللہ وآخرت سے بے خوفی کی وجہ سے دین میں رائے زنی کر کے خود بھی ہلاک ہوتے اور دوسروں کو بھی ہلاک کرتے چلے آئے ہیں۔

اور اسی کی جانب اس حدیث میں اشارہ ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے اندر سے کھینچ کر علم نہیں اٹھا لیتے؛ لیکن علما کو اٹھا لینے سے علم کو اٹھا لیتے ہیں، یہاں تک کہ جب کسی عالم کو باقی نہ چھوڑیں گے، تو لوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنالیں گے اور ان سے سوال کریں گے اور وہ بغیر علم کے ان کو فتوے دیں گے، خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

غالباً اسی قسم کے حالات ووقائع کی جانب ایک حدیث اشارہ کر رہی ہے، جس میں اللہ کے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اللہ سے دعا کرتے ہوئے کہا ہے:

”اللّٰھُمَّ لا یُدرِکنِي زمانٌ ، ولا تُدرِکُوا زماناً لا یُتَّبَعُ فیه

العليمُ ، و لا يُستَحيٰى فيه من الحليم ، قُلوبُهم قُلُوبُ الأعاجِم و ألسِنَتُهُم ألسنةُ العَرَب'' (اے اللہ! میں تیرے سے سوال کرتا ہوں کہ وہ زمانہ مجھ کو نہ پائے اور یہ بھی اللہ سے مانگتا ہوں کہ تم لوگ (صحابہ ﷺ یا مسلمان) بھی ایسے زمانے کو نہ پائیں، جس میں علم والے کی اتباع نہ کی جاتی ہو اور حلم والے سے حیا وشرم نہ کی جاتی ہو، جس زمانے کے لوگوں کے دل تو عجمیوں جیسے ہوں اور زبانیں عرب لوگوں کی جیسی ہوں۔)(۱)

جب جہل کا اس قدر غلبہ ہو جائے کہ لوگ علم والے کی نہ قدر کریں، نہ اس کی بات مانیں اور حلم والے سے شرم بھی نہ کریں، تو ایسا زمانہ نہ مانگنے کے قابل ہے۔ آج یہی سب کچھ ہو رہا ہے، جہالت و اہلِ جہل کا غلبہ اور اہلِ علم سے دوری و بے نیازی؛ بل کہ بے زاری، جو ''غلو فی الدین'' کا بڑا سبب ہے۔

جاہلی تعصب

ایک وجہ غلو کی ''تعصب'' ہوتا ہے اور ''تعصب'' کی تعریف یہ ہے کہ حق و ناحق سے قطعِ نظر اپنے لوگوں کی تائید و نصرت کرنا، خواہ وہ ''اپنے لوگ'' نسب و خاندان کے لحاظ سے اپنے ہوں یا مسلک و نظریے کے لحاظ سے اپنے ہوں، یا کسی جماعت و طبقے کے لحاظ سے اپنے ہوں۔

پھر یہ تعصب طبقاتی و جماعتی بھی ہوتا ہے اور افراد و شخصیات کے لحاظ سے بھی ہوتا ہے، چناں چہ بہت سی جماعتوں اور فرقوں کی جانب سے تعصب کی بنا پر دین میں غلو کی باتیں پیدا ہو جاتی ہیں، وہ اپنے مسلک و نظریے کے لیے تعصب برتتے ہوئے

---

(۱) جمع الجوامع للسيوطي:۴۴۵

کبھی قرآن سے اور کبھی حدیث سے دلیل لیتے ہیں، حال آں کہ نہ وہ قرآن کا منشا ہوتا ہے، نہ حدیثِ رسول کا، اس طرح یہ لوگ دین میں غلو کر جاتے ہیں۔ اسی طرح اپنی جماعت اور اپنے طبقے و مسلک کے لوگوں سے کچھ بھی ہو جائے وہ روا رکھا جاتا ہے اور وہی بات دوسرے کی جانب سے پیش آئے، تو اس پر ردو انکار کیا جاتا ہے۔ یہی وہ تعصّبات ہیں، جو دین میں غلو کا سبب بنتے ہیں۔

اسی طرح بعض لوگ کسی شخصیت کے سلسلے میں تعصب برتتے ہوئے غلو کرنے لگتے ہیں اور اس کی اچھی و بری باتوں، یا حق و ناحق باتوں کو ایک درجے دیتے چلے جاتے ہیں، گویا کہ وہ شخصیت معصوم ہے۔ اسی تعصب نے غلو کو یہاں تک پہنچا دیا کہ اس نے عجیب عجیب گل کھلائے۔ مثلاً:

تعصب اور وضعِ حدیث کا فتنہ

بعض فرقے اور بعض طبقے جان بوجھ کر وضعِ حدیث تک کی گمراہی میں مبتلا ہو گئے اور وہ اپنے مسلک و نظریے کو ثابت کرنے کے لیے آخرت سے غافل ہو کر حدیثیں گھڑنے لگے تھے اور عوام الناس کو تذبذب و پریشانی میں مبتلا کر دیتے تھے۔

جیسے یہ حدیث: "الإيمان يزيد،و ينقص" (ایمان بڑھتا ہے اور گھٹتا ہے) اور اس کے مقابلے میں یہ حدیث: "الإيمان لا يزيد،و لا ينقص". (ایمان نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے۔)

ملا علی قاری رَحِمَہُ اللّٰہُ نے لکھا ہے کہ یہ دونوں کذب و جھوٹ ہیں۔(۱)

اسی طرح یہ حدیث: "القرآن كلام الله لا خالق ، ولا مخلوق"

(قرآن اللہ کا کلام، نہ خالق ہے، نہ مخلوق۔)

یہ بات اگر چہ کہ صحیح اور مسلکِ اہلِ سنت ہے؛ مگر حدیث من گھڑت ہے، جو

---

(۱) الأسرار المرفوعة :۴۷۸

بعض متعصبین نے گھڑی ہے۔علامہ شوکانی رَحِمَہُ اللّٰہُ لکھتے ہیں کہ یہ حدیث موضوع ہے، جس کو مامون کے زمانے میں جب یہ مسئلہ پیدا ہوا، تو ان لوگوں نے گھڑا ہے، جنھیں اللہ سے شرم وحیا نہیں۔(۱)

اور جیسے یہ حدیث:

''يكون في أمتي رجل يُقَالُ له محمد بن إدريس أضر علی أمتي من إبليس ، و يكون في أمتي رجل يُقَالُ له أبو حنيفة -- رَحِمَہُ اللّٰہُ -- هو سراج أمتي.''

(میری امت میں ایک آدمی پیدا ہوگا، جس کو محمد بن ادریس کہا جائے گا، وہ میری امت پر ابلیس سے زیادہ نقصان دہ ہوگا اور میری امت میں ایک شخص ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللّٰہُ نامی ہوگا، وہ میری امت کا چراغ ہوگا۔)

یہ بھی من گھڑت حدیث ہے، جو امام شافعی رَحِمَہُ اللّٰہُ کے مخالفین نے گھڑی ہے۔تمام ائمۂ حدیث نے اس کو موضوع قرار دیا ہے۔(۲)

الحاصل جب تعصب کسی مسلک یا شخص یا جماعت کے ساتھ پیدا ہوجاتا ہے، تو اس سے بھی غلو پیدا ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں حدیث گھڑنے والے خوف الٰہی سے بے نیاز ہوکر حدیثیں بھی گھڑ دیتے ہیں۔

مسلکی تعصب اور بے اعتدالی

اسی طرح تعصب نے بعض ائمہ کے مقلدین کو دوسرے ائمہ کے مقلدین کے

---

(۱) الفوائد المجموعة : ۳۱۳

(۲) دیکھو:الموضوعات لابن الجوزي:۲/۴۸،الأباطيل للجوزقاني :۴۴۵،الفوائد المجموعة للشوكاني:۴۲۰،اللآلي المصنوعة :۱/۴۱۶

خلاف بہتان تراشی و توہین و تحقیر پر ابھارا اور من گھڑت امور ان کی جانب منسوب کرنے کی جرأت پیدا کر دی۔

جیسے بعض لوگ ایک جھوٹا واقعہ بیان کرتے ہیں، جس میں امام الحرمین شافعی رحمہ اللہ کی روایت سے یہ بیان کیا گیا ہے:

"سلطان محمود نے امام قفال مروزی شافعی رحمہ اللہ کو حکم دیا کہ شافعی و حنفی دونوں مذاہب کے مطابق ایسی دو رکعتیں پڑھ کر دکھائیں جس سے کم درجہ جائز نہ ہو، امام قفال رحمہ اللہ نے پہلے تو امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب کے مطابق دو رکعتیں کامل طہارت کے ساتھ باقاعدہ وضو کر کے، پاک لباس پہن کر، قبلہ رو، با ادب، خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کی، جن میں نماز کے کل ارکان کو بہ حسن و خوبی ادا کیا، نہ کسی فرض کو چھوڑا، نہ سنت کو، نہ کسی مستحب کو، اس طرح کامل و مکمل طور پر نمازِ شافعیہ پڑھ کر دکھائی اور سلطان محمود سے کہا کہ یہ ہے شافعی طریقۂ نماز اور جب حنفی طریقے کے مطابق نماز دکھائی، تو امام قفال رحمہ اللہ نے کتے کی دباغت دی ہوئی کھال پہن کر، اس کا چوتھائی حصہ نجاست میں ملوث کر کے، کھجور کی نبیذ سے وضو کیا، پھر نماز شروع کی، تو " الله أكبر" کی جگہ فارسی میں" خدائے بزرگ تر است" کہا اور قرآن سے ایک چھوٹی آیت: ﴿مُدۡهَآمَّتَانِ﴾ کا فارسی ترجمہ" دو برگ سبز" پڑھ دیا اور بغیر اطمینان و سکون کے جلدی جلدی رکوع و سجدہ کیا اور آخر میں گوز مار کر نماز ختم کی اور بادشاہ سے کہا کہ یہ ہے حنفی نماز کا طریقہ۔"

یہ واقعہ تاریخی لحاظ سے کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور درحقیقت جھوٹ کا پلندہ ہے

اور بلا ریب کسی دشمنِ دین و عقل کا گھڑا ہوا ہے اور یہ قول علامہ حبیب الرحمٰن اعظمی محدث رَحِمَہُ اللّٰہُ کے:

''ان امور کی نسبت قفال و امام الحرمین رحمہما اللّٰہ کی طرف بہتان و افترا ہے اور یہ قصہ طلسم ہوشربا کی داستان اور گل بکاؤلی کے قصے سے زیادہ وقیع نہیں۔ غور تو کرو! آخر یہ کتنی بڑی بے انصافی ہے کہ شافعی مذہب کی جائز نماز دکھاتے وقت تو کوئی مستحب بھی نہ چھوڑا اور حنفی مذہب کی جائز نماز پڑھی تو واجبات؛ بل کہ فرائض تک کا ناس مار دیا؟ حنفی مذہب میں یہ کہاں ہے کہ فرائض کے ترک سے نماز ہو جاتی ہے، حنفی مذہب میں تو واجب کے قصداً ترک سے بھی نماز لوٹانا واجب ہے۔''(۱)

کسی متعصب کی جانب سے اس واقعے میں مذہبِ حنفیہ کے ساتھ جھوٹ و مکر سازی کی فن کاری کا مظاہرہ کیا گیا ہے اور فریب دہی و بہتان طرازی کا معاملہ کیا گیا ہے اور علمی لحاظ سے اس میں جو جو خیانتیں کی گئیں ہیں، ان کا تفصیلی ذکر محدث شہیر حضرت علامہ حبیب الرحمٰن اعظمی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اپنے ایک مقالے میں کیا ہے، اس کے لیے دیکھیے: ''مقالات ابو المآثر'' اور اسی میں ہے کہ اس صلاۃِ قفال رَحِمَہُ اللّٰہُ کی تردید میں امام ملا علی قاری رَحِمَہُ اللّٰہُ نے بھی ایک رسالہ بہ نام: ''تشييع الفقهاء الحنفية بتشييع السفهاء الشافعية '' لکھا ہے۔

ایک اور واقعہ، جو بعض اساتذہ سے سنا ہوا ہے، پیش کرنے کو جی چاہتا ہے، جس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ تعصب کے نتیجے میں حضراتِ ائمہؒ کرام کے خلاف ذہنیت بنانے والے کس طرح کیا کرتے ہیں؟ اور حقیقت سے اعراض کرتے ہوئے غیر واقعی چیزوں کو کس طرح رنگ دیتے ہیں؟

---

(۱) مقالات ابو المآثر: ۱/۲۰۰

کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں جب حنفیہ وشافعیہ کے مابین اختلافات (جو در اصل مسائل کے اختلافات نہیں؛ بل کہ مسائل کے نام پر سیاسی اختلافات تھے) کا دور چل رہا تھا، تو کچھ شوافع حضرات نے ایک جلسہ طے کیا، جس میں کسی فقیہ کو دعوت دی اور اس کا چرچا کیا اور جب لوگ سارے جمع ہو گئے، تو جلسے میں بھرے مجمع کے اندر سوال و جواب ہوا اور وہاں پہلے سے کچھ مخصوص سوالات فقیہ سے پوچھنے کے لیے بنا لیے گئے تھے، ان میں ایک سوال یہ کیا گیا کہ ''امام کے پیچھے مقتدی قرأت کرے یا نہ کرے؟'' فقیہ صاحب نے اس کا جواب اس طرح دیا کہ اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ پوچھا گیا کہ کس کا کیا اختلاف ہے؟ جواب دیا کہ اس مسئلے میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اختلاف ہے۔ لا حول ولا قوة إلا بالله!! ان فقیہ نے اپنے اس جواب میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو (نعوذ باللہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مخالف ٹھہرانے کی کوشش کی اور غلو کو بھی حدود سے باہر پہنچا دیا۔ اب وہاں کے حنفیہ کو غصہ آیا اور وہ اس بے ہودگی کا جواب دینے کے لیے بے چین ہو گئے اور انھوں نے بھی ایک جلسہ کا اعلان کر دیا اور مقررہ تاریخ پر کسی فقیہ کو انھوں نے بھی بلا لیا اور حسب نظام العمل وہاں بھی سوال و جواب کی مجلس منعقد ہوئی اور سوالات کے درمیان ایک سوال فقیہ حنفی سے یہ کیا گیا کہ اگر کسی نے جان بوجھ کر اللہ کا نام لیے بغیر جانور ذبح کر دیا، تو اس جانور کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟ اس متعصب حنفی نے اس کا جواب یہ دیا: اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ پوچھا گیا کہ کس کا اور کیا اختلاف ہے؟ جواب دیا کہ اس میں امام شافعی رحمہ اللہ کا اللہ میاں سے اختلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتے ہیں کہ بغیر اللہ کا نام لیے، جو جانور ذبح کیا جائے اس کو نہ کھاؤ اور اس سے اختلاف کرتے ہوئے امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ کھا سکتے ہو۔ اس جواب میں جو تعصب ایک جلیل القدر امام

کے ساتھ برتا گیا ہے، وہ کس انصاف پسند سے مخفی ہوگا ؟ ایک جانب تعصب نے حنفیہ؛ بل کہ امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللّٰہُ کو رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا مخالف بنا دیا، تو دوسری جانب امام شافعی رَحِمَہُ اللّٰہُ وشوافع کو اللہ کا مخالف ٹھہرا دیا۔ یہ دونوں باتیں دراصل غلو کا ثمرہ ہیں۔

تبلیغی جماعت سے بے جا تعصب

اسی تعصب کا ایک نتیجہ یہ بھی دکھائی دیتا ہے کہ بعض لوگ ''تبلیغی جماعت'' اور کتاب'' فضائلِ اعمال'' کو غلط و گمراہی ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، جب کہ اس جماعت کا پیغام وطریقہ واضح وصاف ہے کہ یہ جماعت لوگوں میں دینی شعور پیدا کرنے اور ان کو دین سے قریب لانے کی ایک عظیم محنت کررہی ہے، اس نے نہ کوئی ایسا دعویٰ کیا ہے، جو غیر شرعی ہو، نہ اس کا کوئی پیغام ایسا ہے، جو خلافِ قرآن وسنت ہو اور نہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ چھپا کر کوئی بات پیش کی جائے؛ بل کہ کھلے عام مساجد و میدانوں میں بات کی جاتی ہے۔ حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب کاندھلوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے عوام الناس کی دین سے دوری کو محسوس کرتے ہوئے ایک عمومی فضا دین داری وتقوے و پرہیز گاری کی پیدا کرنے کے مقصد سے یہ تحریک جاری فرمائی اور دیکھتے ہی دیکھتے، بڑی مخالفتوں وعداوتوں کے باوجود عالم کے کونے کونے میں اس کا فیض اللہ تعالیٰ نے جاری فرما دیا اور بے شمار لوگوں کو ہدایت ملی۔ اس کے آغاز کے وقت سے بلا شک وشبہ ہر دور میں اس کے ذریعے لاکھوں انسان راہِ راست و ہدایت پر آئے، کتنے شرابی وکبابی لوگ نماز پنج گانہ کے پابند ہو گئے! کتنے آخرت سے غافل انسان اس سے متقی و پرہیز گار و تہجد گزار بن گئے! کس قدر چور و ڈاکو قسم کے لوگوں کو اس سے راہِ راست میسر آئی! یہ سب ایک

ایسی حقیقت ہے کہ کوئی بھی انصاف پسند وحق آشنا اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

یہ کون مسلمان نہیں جانتا کہ دین کی اشاعت واعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جد و جہد اور سعی و کوشش اور غیروں تک دینِ اسلام کی دعوت پہنچانے اور اہلِ اسلام کو بھی دین وشریعت پر جمانے کی محنت ایک ضروری ولابدی حکم اور فضیلت مآب کام ہے، ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کی ضرورت واہمیت ایک مسلمہ امر ہے اور ان سب کی ضرورت وفضیلت پر قرآن وحدیث کے نصوص بالصراحۃ دلالت کرتے ہیں اور اسی لیے ہمیشہ سے علمائے اسلام نے بھی اور عوام اہلِ اسلام نے ان امور کو ضروری و فضیلت مآب سمجھا اور اس سلسلے میں کام کیا ہے۔

اس دعوتی تحریک اور تبلیغی جماعت نے اسی کام کو انجام دینے کی جد و جہد کو ایک خاص نظام کے تحت جاری کیا ہے، جس کا دلائلِ شرعیہ کی روشنی میں جائزہ لیا جائے، تو اس کے جائز وصحیح ہونے میں کوئی اشکال واعتراض نہیں ہو سکتا اور دعوت وتبلیغ کے منصوص کام کی انجام دہی کے لیے کوئی بھی ایسا طریقہ جاری کر لینا، جو خلافِ شرع نہ ہو؛ بل کہ دلائلِ شرعیہ کی رو سے جائز ہو، یہ اس کے جواز کے لیے کافی ہے؛ نیز اس کا مفید و بار آور ہونا بھی ایک طویل تجربے کی روشنی میں ظاہر ہو چکا ہے، تو اس میں شبہ و شک کی کیا گنجائش ہے؟

یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے کے اہلِ حق علما و مشائخ نے خواہ وہ عجم سے تعلق رکھتے ہوں یا عرب سے، اس ''دعوتی وتبلیغی تحریک'' کی توثیق وتائید کی ہے، اسی طرح ہر دور کے اہلِ انصاف علما و مشائخ نے بھی، خواہ وہ دیوبندی نظریات کے حامل ہوں یا دوسرے مکتبِ فکر کے، اس کو سراہا ہے۔

اس کھلی حقیقت کے باوجود اس کو گمراہ قرار دینے کی وجہ؛ سوائے تعصب کے اور کیا ہو سکتی ہے؟ پھر اس تعصب نے جب مخالفت پر کچھ لوگوں کو ابھارا؛ تو اس میں بھی

ان کو کوئی باک نہ ہوا کہ اس جماعت کو انگریزوں کی ایجنٹ قرار دے دیں اور الزام تراشیاں کرنے لگیں اور اس جماعت کو کفر و شرک کی جانب منسوب کریں یا بدعت وگمراہی کی طرف اس کا انتساب کریں، یہاں تک کہ بعض مساجد میں ''تبلیغی جماعت کافر ہے'' اور ''تبلیغی جماعت کا داخلہ ممنوع'' کا بورڈ بھی لگا ہوا ملے گا۔ یہ سب کیا ہے؟ وہی دین میں غلو، جس کے پیچھے تعصّبات کام کرتے ہیں۔

تبلیغی جماعت میں کوتاہیوں کی اصلاح

لیکن یہاں ایک بات اور واضح کردوں کہ میں ''تبلیغی جماعت'' کی تائید میں ان جملوں کو لکھتے ہوئے یہ نہیں کہنا چاہتا کہ اس جماعت کے بہت سے افراد میں، جو علمی و عملی افراط وتفریط کی باتیں پیدا ہوگئی ہیں، وہ بھی صحیح ہیں؛ بل کہ یہاں یہ کہنا ہے کہ اس جماعت کا اصل مقصد و کام اور جس نیک ارادے کے تحت اس کا اجرا ہوا اور حضرت اقدس شاہ محمد الیاس کاندھلوی رَحِمَهُ اللهُ کے دردمند دل نے امت کے ساتھ دردمندانہ و مشفقانہ برتاؤ کرتے ہوئے جس عظیم وجلیل کام کا بیڑہ اٹھایا، کیا اس میں کسی حرف گیری کی گنجائش ہے؟ کیا اس کو قرآن وسنت کے خلاف ٹھہرانے کا کوئی جواز ہے؟ حق یہ ہے کہ ''تبلیغی جماعت'' کے کام و مقصد سے اختلاف میرے نزدیک ناجائز ہے۔

ہاں! بہت سی جماعتوں کی طرح اور بہت سی تحریکوں کی طرح وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ یہاں بھی بعض بے اعتدالیاں وغلطیاں لوگوں میں پیدا ہوگئی ہیں، جن میں سے بعض علمی غلطیاں ہیں، تو بعض عملی کوتاہیاں ہیں، ہم ان کو صحیح نہیں سمجھتے اور نہ صحیح قرار دیتے ہیں؛ بل کہ اصلاحی جذبے سے ان کی بھی اصلاح کی کوشش کو ضروری خیال کرتے ہیں؛ تاکہ یہ جماعت غلو فی الدین کی بیماری سے حفاظت میں

رہے۔اس لیے ہم تبلیغی جماعت سے منسلک علما سے خاص طور پر یہ گزارش کرتے ہیں کہ جماعت کے کام میں جو بے اعتدالیاں وافراط وتفریط کی باتیں پیدا ہوگئی ہیں، جن میں سے بعض زیادہ سخت بھی ہیں ، ان کی اصلاح کی کوشش سے کبھی دریغ نہ کریں؛ تاکہ اس مفید ترین وعظیم ترین کام میں غلو پیدا ہوکر وہ قابل اعتراض نہ بن جائے ؛ کیوں کہ ہم سب دین وشریعت کے پابند ہیں اور ہمیں بھی اسی طرح غلو سے بچنے کا حکم ہے، جس طرح سبھی لوگوں کو حکم ہے۔

اسی لیے ہمارے اکابر نے ہمیشہ ایک جانب اس جماعت سے بھرپور تعاون کیا ہے، تو دوسری جانب اس کے اندر پیدا ہونے والی بے اعتدالیوں پر بھی متنبہ کیا ہے اور یہی ہمارے اکابر کا اعتدال وتوسط ہے اور غلو سے پاک رویہ ہے، جس کی ہم سب کو اتباع کرنا چاہیے۔

مثلاً محدثِ جلیل وفقیہِ نبیل حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے جو خود حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ کے قریبی لوگوں میں سے تھے، انھوں نے اپنے مقالات میں ''تبلیغی جماعت'' کی خدماتِ جلیلہ اور اس کے فوائد وبرکات پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ یہ تحریر فرمایا:

> ''اس میں شک نہیں کہ اس کام کو اصول کے ساتھ کیا جائے، تو اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی سب سے بڑی خدمت اور وقت کی اہم ضرورت ہے؛ لیکن افراط وتفریط سے ہر کام میں احتیاط لازم ہے۔''
>
> (پھر اس جماعت کی چند کوتاہیوں وغلطیوں پر متنبہ کیا ہے۔)(۱)

اور اگر اس جماعت کے لوگوں کی بے اعتدالیاں وافراط وتفریط کے حالات ہمارے سامنے آنے کے باوجود ہم اصلاح نہ کریں، یا جو حضرات اہلِ علم واہلِ دین

---

(۱) دیکھو: مقالاتِ عثمانی رَحِمَہُ اللّٰہُ: ۱/۲۶۸

اصلاحی جذبے سے جماعتی کام میں ہونے والی بےاعتدالی وافراط وتفریط پر انکار ورد کریں، تو ان حضرات ہی کو غلط ثابت کرنے یا تبلیغ کا مخالف قرار دینے کی فکر وکوشش میں لگ جائیں، تو سمجھنا چاہیے کہ یہ بھی اسی ''غلو فی الدین'' کا ایک حصہ ہے، جس سے ہم سب کو منع کیا گیا ہے۔ ہمیں یہ طرز و انداز اختیار نہیں کرنا چاہیے، جو خود ہمارے خلاف حجت بن جائے؛ بل کہ اپنی یا اپنی جماعتوں کے اندر کی بےاعتدالیوں وغلطیوں کو دور کرنے کی کوشش برابر کرتے رہنا چاہیے، بےفکر نہ ہونا چاہیے، یہی اسلام کی تعلیم بھی ہے اور ہمارے اکابر کا طریق وطرزِ عمل بھی۔

حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے اپنے خطبات میں ایک جگہ نہایت معتدل بات فرمائی ہے، اس کو یہاں نقل کر دینا مناسب ہے، آپ نے فرمایا:

''ہمیشہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کسی بھی جماعت کا پھیل جانا اور اس کے پیغام کا دور دور تک پہنچ جانا، اگر صحیح طریقے سے ہو تو یہ قابلِ خیر مقدم ہے اور اس صورت میں اس جماعت کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے؛ لیکن اگر اس جماعت میں خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں یا اس کے اندر غلط فکر پیدا ہو رہی ہے، تو پھر تعاون کے ساتھ ساتھ اس کی غلطی پر اس کو متنبہ کرنا بھی ضروری ہے؛ کیوں کہ ایسا نہ ہو کہ یہ بہترین جماعت، جس سے اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا کام لیا، کہیں غلط راستے پر نہ پڑ جائے۔'' (۱)

الغرض ایک ہے ''تبلیغی جماعت'' کا اصل پیغام ونظام وطریق کار، اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں؛ لہٰذا اس کی مخالفت دراصل تعصب اور اللہ تعالیٰ سے بےتعلقی اور آخرت سے بےخوفی کا نتیجہ ہے اور دوسرا ہے اس جماعت میں وقت کے گزرنے کے ساتھ بےاعتدالیوں وغلطیوں، علمی وعملی غلو پسندیوں کا سلسلہ، یہ بےشک

---

(۱) اسلام اور ہماری زندگی: ۲/۳۳۱

قابلِ اصلاح ومحتاجِ تنبیہ ہے اور علما کی ذمے داری ہے کہ وہ اس پر لوگوں کو متنبہ کرتے رہیں اور اصلاحی اقدام کرتے رہیں اور جو لوگ اس میں لگے ہوئے ہیں، ان کو چاہیے کہ جب مقصود ہمارا اللہ کی رضا ہے اور معتبر علما دلائل کی روشنی میں کوئی قابلِ گرفت بات پر گرفت فرمائیں، تو خود کو قابلِ اصلاح سمجھ کر اصلاح کر لیں اور غلو و بے اعتدالی سے اپنے آپ کو بچائیں اور ایسے وقت علما کی بات کی قدر کریں اور یہ سمجھیں کہ یہ حضرات ہمارے مصلح ہیں، جو ہماری اصلاح کرتے اور ہمیں گمراہیوں سے بچاتے ہوئے ہمیں جنت میں لے جانا چاہتے ہیں، بالخصوص جب کہ ان علما کا مخلص ہونا بھی معلوم ہو اور اہلِ حق میں سے ہونا ثابت ہو، تو اہلِ حق ہونے اور دین پسند ہونے کا تقاضا ہی یہ ہے کہ علما کی بات کو مانیں، اگر چہ کہ وہ بہ ظاہر آپ کے ساتھ تبلیغی گشتوں وچلوں میں نہ جاتے ہوں؛ کیوں کہ دین کے اور بھی بہت سے کام ان کے ذمے ہوتے ہیں۔

یہ ہے غلو سے دور اور حق کی راہ، جس میں افراط وتفریط کی ساری راہیں مسدود و بند ہوتی ہیں۔ ہمیں نہ تو غلو کرتے ہوئے تعصب پسندوں کی طرح اس جماعتِ حقہ کی مخالفت کرنا چاہیے اور نہ اس کے حمایتی بن کر غلطیوں و بے اعتدالیوں کو بھی حق ثابت کرنے کی بے جا کوشش کرنا چاہیے اور نہ اہلِ حق کی تنبیہات کو دین و جماعت کی مخالفت کا نام دے کر اکابرین کے طریق سے ہٹنا چاہیے۔

الغرض تعصب ایک بہت بڑی وجہ ہے، جس سے غلو فی الدین پیدا ہوتا اور لوگوں میں گمراہیاں پھیلاتا ہے۔

اتباعِ ہویٰ یعنی خواہشات کی پیروی

غلو کے اسباب میں ایک چیز ''اتباع ہویٰ'' بھی ہے، یعنی انسان اللہ کے نازل فرمودہ دین وشریعت کے بجائے اس کی آڑ میں اپنی خواہشات کی پیروی کرے۔

اتباعِ ہویٰ کی مذمت

قرآن وسنت میں ''اتباعِ ہویٰ'' کی مذمت کی گئی اور اس سے منع کیا گیا اور اس کو دین کے لحاظ سے ایک خطرناک چیز ٹھیرایا گیا۔

ایک جگہ قرآن کہتا ہے:

﴿ أَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوٰهُ وَأَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ، فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْ بَعْدِ اللّٰهِ أَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴾ (الجاثیۃ:۲۳)

(بھلا دیکھیے تو، جس نے اپنی خواہشات کو اپنا خدا وحاکم بنالیا اور علم ہونے کے باوجود اللہ نے اس کو بے راہ کر دیا اور اس کے کان اور دل پر مہر لگادی اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیا، تو اب اس کو خدا کے بعد کون ہدایت دے سکتا ہے؟ کیا تم اس پر غور نہیں کرتے۔)

مفسرین کے مطابق یہ آیت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کے زمانے کے ایک عالم وعابد ''بلعم بن باعورا'' نامی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جس نے محض خواہشات کی اتباع میں حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کے خلاف بد دعا کر دی تھی، جب کہ وہ جانتا بھی تھا کہ حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام اللہ کے برگزیدہ پیغمبر ہیں اور ان کے خلاف بد دعا کرنا وبالِ ایمان بھی ہے اور وبالِ جان بھی؛ مگر دنیا کی خواہشات نے اس کو اس بے ایمانی میں مبتلا کر دیا۔(۱)

ایک جگہ حضرت داوٗد عَلَیْہِ السَّلَام کو جو اللہ کا حکم آیا تھا، اس کو قرآن نے ان الفاظ سے نقل کیا ہے:

---

(۱) دیکھو: الدر المنثور:۶/۲۷۳،تفسیر القرطبي:۷/۳۱۹، تفسیر ابن کثیر:۳/۵۰۸

﴿وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (صٓ: ۲۶)

(اور آپ خواہش کی پیروی نہ کریں کہ یہ آپ کو اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی۔)

ایک اور موقعے پر شہوت پرستوں کا، حق والوں کو حق سے دور کرنے کی تمنا اور ارادہ کرنے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

﴿وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ وَ يُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا﴾ (النِّسَآءِ: ۲۷)

(اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ تم پر توجہ فرمائیں اور شہوت پرست لوگ چاہتے ہیں کہ تم راہِ راست سے ہٹ کر بڑی کجی میں پڑ جاؤ۔)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوائے نفسانی و خواہشِ نفسانی سے انسان، اللہ کے راستے سے بھٹک جاتا ہے اور اللہ کے بہ جائے اپنی خواہش ہی کو معبود بنا لیتا ہے؛ نیز یہ کہ خواہش پرست لوگ دوسروں کو بھی حق سے ہٹا دینے کی خواہش رکھتے و کوشش کرتے ہیں۔

قرآن کے ساتھ اس سلسلے میں احادیث کا بھی مطالعہ کیجیے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”إني أخاف على أمتي من ثلاث : من زلة عالم ، و من هوى متبع ، و من حكم جائر.“

(میں میری امت پر تین چیزوں سے ڈرتا ہوں: ایک عالم کی لغزش سے، دوسرے اس خواہش سے جس کی پیروی کی جائے اور تیسرے ظالم کی بادشاہت سے۔)(۱)

(۱) مسند بزار:۳۳۸۴،المعجم الكبير للطبراني:۱۳۴۹۱،حلية الأولياء:۲/۱۰

اورحضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”ما تحت ظل السماء إله يعبد من دون الله أعظم عند الله من هوى متبع.“

(آسمان کے سایے تلے اس خواہش سے بڑھ کر جس کی اتباع کی جاتی ہے، کوئی چیز ایسی نہیں جس کی اللہ کو چھوڑ کر پرستش کی جاتی ہو۔)(۱)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”تین چیزیں مہلکات یعنی ہلاکت میں ڈالنے والی ہیں: ایک وہ بخل، جس کی پیروی کی جائے، دوسرے وہ خواہش جس کی بات مانی جائے اور تیسرے آدمی کا اپنے آپ پر اترانا۔“(۲)

ان تمام احادیث سے اتباعِ نفس و ہویٰ کی مذمت کے ساتھ ساتھ اس کے دینی ضرر و نقصان؛ نیز اس کی ممانعت صاف طور پر ظاہر ہو رہی ہے۔

ہوائے نفسانی کی قسمیں

یہاں یہ بھی معلوم کر لینا چاہیے کہ ہوائے نفسانی و خواہشات و شہوات بہت ہیں، ان میں سے تین اہم ہیں: ایک خواہشِ جاہ، ایک خواہشِ مال اور ایک خواہشِ باہ۔

انسان کبھی جاہ طلبی و ریاست و امارت کی خواہش میں مبتلا ہو کر غلو فی الدین کا مرتکب ہوتا ہے اور دین میں خلل پیدا کر دیتا ہے؛ تا کہ کسی طرح اس کو دوسروں سے

---

(۱) المعجم الكبير: ٧٥٠٢، السنة لابن أبي عاصم: ٣، اعتلال القلوب للخرائطي: ٨٤، حلية الأولياء: ٦/١١٨

(٢) المعجم الكبير: ٦٥١، المعجم الأوسط: ٥٧٥٤، مسند بزار: ٦٤٩١

فوقیت و بڑائی جتانے کا موقعہ مل جائے ، اس خواہش کے پیچھے وہ حق کو لات ماردیتا ہے، بدعات وخرافات کو رائج کردیتا ہےاور اپنا ایک حلقہ و جماعت بنا کر خود کی پوجا کراتا ہے۔

اور کبھی مال کی خواہش اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ دین میں غلو کرے اور اس کے ذریعے مال حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے اور دنیوی مال ومتاع حاصل کر کے راحت و آرام کی زندگی گزارے۔ یہ مال و دولت کی خواہش وہ ہے، جس سے آدمی اپنا دین بھی بیچ دینے کے لیے راضی ہو جاتا ہے۔

اور کبھی باہی لذات وخواہشات اس کے پیچھے پڑ جاتی ہیں اور ان کی وجہ سے آدمی اللہ کے دین میں غلو کرتا ہے؛ تا کہ اپنی باہی لذات وخواہشات پوری کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ رہے۔

خواہشات کی پیروی خطرناک مرض

''اتباعِ ہویٰ'' کا یہ مرض بڑا خطرناک مرض ہے، جس نے ہمیشہ راہِ راست و صراطِ مستقیم سے لوگوں کو ہٹایا اور گمراہی کے غار میں ڈھکیلا ہے۔ معلوم نہیں کہ اس بیماری کے شکار کتنے لوگوں کو اس نے جہنم رسید کیا ہے؟

اور اس کی جانب قرآنِ کریم میں بھی اشارہ ہے کہ اتباعِ خواہشات کی وجہ سے غلو پیدا ہوتا ہے، چناں چہ فرمایا گیا:

﴿ وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَ اتَّبَعَ هَوٰئهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا﴾ (الکھف :۲۸)

(اور تم پیروی نہ کرو، اس کی جس کے دل کو ہم نے ہمارے ذکر سے غافل کر دیا ہےاور وہ اپنی خواہش کی اتباع کرتا ہےاور اس کا معاملہ حد

سے بڑھا ہوا ہے۔)

اس آیت میں " فرط " کا لفظ بعض کے نزدیک افراط سے ہے، جس کے معنے حد سے باہر نکل جانے و بڑھ جانے کے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ تفریط سے ہے، جس کے معنیٰ "کمی کرنے" کے ہیں۔(۱)

لہٰذا اس میں اشارہ ہے کہ اتباعِ خواہشات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے حدود پر قائم نہیں رہتا؛ بل کہ کبھی افراط میں مبتلا ہوتا ہے، تو کبھی تفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔

ایک حدیث اور اس کی شرح

اسی طرح ایک اور حدیث سے بھی یہ بات مستفاد ہوتی ہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

" ألا ! إن من كان قبلكم من أهل الكتاب افترقوا على ثنتين ، و سبعين ملةً ، و إن هذه الأمة ستفترق على ثلاث، و سبعين ملة : ثنتان ، و سبعون في النار ، و واحدة في الجنة ؛ و هي " الجماعة " - وفي رواية زيادة - و إنه سيخرج من أمتي أقوام تجارى بهم تلك الأهواء كما يتجارى الكلب لصاحبه ، لا يبقى منه عرق ، و لا مفصل إلا دخله."

(خبردار رہو کہ تم سے پہلے جو اہلِ کتاب گزرے ہیں، وہ بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے اور یہ امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی؛ بہتر جہنم میں جائیں گے اور ایک جنت میں اور وہ "جماعت" ہے۔(ایک روایت میں یہ اضافہ ہے) اور میری امت میں ایسے لوگ ظاہر ہوں

(۱) دیکھو: تفسير القرطبي:۳۹۲/۱۰، التفسير فتح القدير :۳۸۵/۴

گے، جن میں یہ خواہشات اس طرح رچی وبسی ہوئی ہوں گی، جیسے کہ کتے کاٹے کا زہر کہ کوئی رگ اور کوئی جوڑ ایسا نہیں رہتا، جس میں یہ بیماری نہ گھس جائے۔)(۱)

حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی رَحِمَہُ اللّٰہُ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''کتے کاٹے کی بیماری پر غور کیجیے، تو دو باتیں نظر آئیں گی: ایک یہ کہ چوں کہ یہ بیماری ایک ایک جوڑ میں سرایت کر جاتی ہے؛ اس لیے لا علاج ہوتی ہے، دوم یہ کہ جس طرح یہ بیماری دراصل دیوانے کتے میں موجود ہوتی ہے؛ لیکن جب وہ کسی کو کاٹ لیتا، تو اس کو بھی اس بری طرح لگ جاتی ہے کہ پھر یہ شخص بھی کتے کی طرح خوفناک اور قابلِ احتراز ہو جاتا ہے، حتی کہ اگر یہ تیسرے انسان کو کاٹ لے، تو اس پر بھی وہی اثر ظاہر ہو جاتا ہے، جو دیوانے کتے کے کاٹنے سے ہوتا ہے۔ ان خصوصیات کے بعد اگر آپ اہلِ ہویٰ کے حالات کا موازنہ کریں، تو اس تشبیہ میں آپ کو نبوت کا ایک اعجاز نظر آئے گا، ہویٰ کا حال بھی یہی ہے کہ جب وہ انسان کے رگ وپے میں سرایت کر جاتی ہے، تو پھر وہی انسان کو ہدیٰ نظر آنے لگتی ہے؛ اس لیے یہاں توبہ کی امید نہیں رہتی، توبہ کی توفیق اس وقت ملتی ہے، جب قلب کا کوئی گوشہ ہویٰ سے خالی ہو؛ مگر جب رگ رگ میں ہویٰ سرایت کر جائے، تو اب توبہ کی توفیق کہاں سے ملے گی؟ اس لیے ﴿سُوْرَۃُ الْجَاثِیَۃِ﴾ میں فرمایا:

---

(۱) سنن أبي داود: ۴۵۹۷، السنة لابن أبي عاصم: ۲، مسند الشامیین: ۲/۱۰۸، مسند أحمد: ۱۶۹۷۹، المستدرک للحاکم: ۱/۲۱۸، المعجم الکبیر للطبراني: ۱۴/۳۰۱

﴿ أَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوٰهُ وَأَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهِ غِشٰوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ أَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴾ (الجاثیۃ:۲۳)

(بھلا دیکھیے تو! جس نے اپنی خواہشات کو اپنا خدا و حاکم بنالیا اور علم ہونے کے باوجود اللہ نے اس کو بے راہ کر دیا اور اس کے کان اور دل پر مہر لگادی اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیا، تو اب اس کو خدا کے بعد کون ہدایت دے سکتا ہے؟ کیا تم اس پر غور نہیں کرتے؟)

آیتِ بالا میں چند اہم فوائد بتائے گئے ہیں: پہلا یہ کہ جس طرح بے علمی، گمراہی کا سبب بنتی ہے، اسی طرح کبھی علم بھی گمراہی کا سبب ہوجاتا ہے؛ مگر جو گمراہی علم کی راہ سے آتی ہے، اس کا نتیجہ بھی انتہائی خطرناک ہوتا ہے، یہ گمراہی تاریکی کی نہیں؛ بل کہ روشنی کی گمراہی ہے، جہل کی نہیں، علم کی گمراہی ہوتی ہے؛ اس لیے یہاں اسبابِ ہدایت سب معطل ہو جاتے ہیں، نہ کان سنتے ہیں اور نہ آنکھیں غور وفکر کرنے کے لیے تیار ہوتی ہیں اور قلب میں تو حکومتِ ہویٰ کی وجہ سے حق بینی و حق فہمی کی کوئی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی؛ اس لیے یہاں ہدایت کی کوئی توقع نہیں رہتی۔ دوسری بات یہ کہ ہویٰ پرست کو اتباعِ ہویٰ میں وہ مزہ آتا ہے، جو خدا پرست کو عبادت میں؛ کیوں کہ جب اس نے اپنی ہویٰ ہی کو اپنا خدا بنالیا ہے، تو پھر اسی کی فرمان برداری اس کو خدا کی فرمان برداری نظر آنی چاہیے؛ اس لیے جتنا ایک خدا پرست ہدیٰ کے اتباع کی سعی کرتا ہے، اس سے زیاہ ایک ہویٰ پرست اپنی ہویٰ کے اتباع کے پیچھے رہتا ہے اور تیسری بات یہ کہ اتباعِ ہویٰ اور ضلالت

لازم وملزوم ہیں۔‘‘(۱)

الغرض یہ خواہشات کی پیروی کا مرض، ہدایت سے انسان کو ہٹا کر ضلالت وگمراہی کے غار میں جا گراتا ہے اور وہ غلو کو دین کا عنوان لگا کر خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہی میں پھنساتا ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں بے شمار بدعات وخرافات اور رسومات کو جاری کرنے والے یہی خواہشات کے پجاری لوگ ہیں، جو محض اپنی جاہی وباہی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے ان کا چکر چلا رہے ہیں اور لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔

اسی طرح مختلف فرقوں نے اتباعِ ہویٰ کی وجہ سے گمراہی کا دروازہ کھولا؛ کیوں کہ اس سے ان کی اغراض پوری ہوتی تھیں اور ان کی خواہشات کے لیے مواقع فراہم ہوتے تھے۔

کعب بن اشرف یہودی کا اتباعِ ہویٰ وبے ایمانی

خواہشات کا اتباع اور شہوات کی پیروی کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی اس کا انجام بے ایمانی و بے دینی اور ایمان ویقین سے محرومی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

کتبِ تاریخ وسیر نے یہ واقعہ محفوظ کیا ہے کہ یہودی نژاد عالم کعب بن اشرف اور حیی بن اخطب، جو مدینے میں یہودیوں کے سردار تھے، وہ اپنے ساتھ کچھ لوگوں کو لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف کفارِ مکہ سے ساز باز کرنے کے لیے مکہ آئے اور ابوسفیان سے ملاقات کی اور اہلِ اسلام کے خلاف مکے والوں سے تعاون کرنے کی پیش کش کی؛ مگر اہلِ مکہ ان یہودیوں کی فطرت سے

(۱) ترجمان السنۃ: ۱/۵۴-۵۵

واقف تھے؛اس لیے انھوں نے کہا کہ تم دھوکے باز قوم ہو،اس لیے ہمیں تم پر یقین نہیں کہ تم اپنا وعدہ نبھاؤ گے؛لٰہذا تم اگر سچے ہو؛ تو ہمارے بتوں (جن کے نام ’’جبت و طاغوت‘‘ ہیں) کے سامنے سجدہ کرو۔اس پر ان یہودیوں نے بتوں کو سجدہ کیا؛ حال آں کہ وہ اس کو شرک سمجھتے تھے اور ان کو معلوم تھا کہ اس سے آدمی مشرک ہو کر یہودی مذہب سے خارج ہو جاتا ہے؛ مگر محض ہوائے نفسانی کی بنا پر اور کفار سے سازباز کرنے کے لیے اپنا ایمان بھی کھودیا۔(۱)

اسی کے متعلق قرآن میں یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوتِ وَ يَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هٰٓؤُلَآءِ أَهْدٰى مِنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا سَبِيلاً ، أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا﴾ (النساء :۵۱-۵۲)

(کیا آپ نے ان کو نہیں دیکھا؟ جنھیں کتاب کے علم کا ایک حصہ ملا ہے کہ وہ بت و شیطان پر ایمان رکھتے ہیں اور کفار کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ مسلمانوں سے زیادہ راہ راست پر ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت ہے اور جس پر اللہ کی لعنت ہو؛ اس کا کوئی مددگار تجھے نہ ملے گا۔)

اس واقعے سے عبرت کا سبق سناتے ہوئے مفسر قرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَهُ اللّٰهُ اپنی ’’معارف القرآن‘‘ میں لکھتے ہیں:

’’اس سے معلوم ہوا کہ کتاب کا محض علم کافی نہیں ہوسکتا، جب تک کہ صحیح معنی میں اس کا اتباع نہ ہو اور محض دنیوی طمع اور سفلی خواہشات کی پیروی سے مکمل اجتناب نہ ہو؛ ورنہ آدمی اپنے مذہب جیسی عزیز چیز کو بھی

---

(۱) جامع البیان:۴۶۸/۸، معالم التنزیل:۲۳۵/۲، الدر المنثور:۴۸۱/۴

اپنی خواہشات کی بھینٹ چڑھانے سے نہیں بچتا۔ آج کل بھی بعض لوگ اس قسم کے ہیں، جو مادی وسیاسی اغراض ومقاصد کے حصول کے لیے اپنے حق مسلک کو آسانی سے چھوڑ دیتے ہیں اور لادینی عقائد ونظریات کو اسلام کا لباس پہنانے کی پوری کوشش کرتے ہیں، نہ ان کو خدا کے عہد ومیثاق کی کچھ پرواہوتی ہے اور نہ آخرت کا خوف۔ یہ سب کچھ صحیح اور حق مسلک کو چھوڑ کر شیطان کے اشاروں پر چلنے سے ہوتا ہے۔"(۱)

مزاراتِ اولیا پر ہویٰ پرستوں کا قبضہ

ہویٰ پرستی ولذت شعاری کا ایک واضح نقشہ ونمونہ حضراتِ اولیاء اللہ کے مزاراتِ مقدسہ پر نظر آتا ہے، جہاں غلامانِ ہویٰ وہوس ان اکابر اولیا کے نام سے امت کو لوٹنے کے لیے اور اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے بے شمار خلافِ شریعت امور جیسے نذر ونیاز وفاتحہ، صندل وعرس، طواف وسجدے، گانا بجانا، کھیل وتماشے، وغیرہ بدعات وشرکیات کا لمبے چوڑے سلسلے کو دین وشریعت کے نام سے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

ان سب امور کو تعظیمِ اولیا وتکریمِ شعائر اللہ کا نام دیا جاتا ہے اور اس پر قرآنی استدلال بھی پیش کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تعظیمِ شعائر اللہ کا حکم دیا ہے اور شعائر اللہ میں اولیاء اللہ کی مزارات بھی داخل ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ اگر یہ سارے امور تعظیمِ شعائر اللہ میں داخل ہیں، تو اس حکمِ خداوندی کی تعمیل اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم نے کیوں نہیں کی؟ اور لوگوں کو اس میں اپنا نمونہ کیوں نہیں دیا؟ بل کہ اس کے

---

(۱) معارف القرآن: ۲/۴۳۳-۴۳۴

برخلاف اللہ کے رسول ﷺ نے قبروں کو اونچا کرنے، ان پر قبے بنانے اور ان کو لیپنے سے منع فرمایا ہے۔ لیجیے! چند احادیث ملاحظہ کیجیے!

ابوالہیاج اسدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا:

" أَلا أَبعثُکَ علی ما بَعَثَنِي علیه رَسُولُ اللّٰه ﷺ ؟ أنْ لا تَدَعَ تِمْثالًا إلاّ طَمَسْتَه، و لا قَبراً مُشرفاً إلّا سوّيتُه."

(کیا میں تم کو اس کام کے لیے نہ بھیجوں، جس کے لیے مجھے اللہ کے نبی ﷺ نے بھیجا تھا یعنی یہ کہ کوئی تصویر نہ چھوڑوں؛ مگر یہ کہ اس کو مٹادوں اور نہ کوئی اونچی قبر کو چھوڑوں؛ مگر یہ کہ اس کو برابر کردوں۔)(۱)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

" نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ يُجَصَّصَ القَبْرُ، وَ أَنْ يُقْعَدَ عَلَيْهِ، وَ أَنْ يُبْنٰی عَلَيْهِ."

(نبی کریم ﷺ نے قبر کو پختہ کرنے اور اس پر بیٹھنے اور اس پر عمارت بنانے سے منع فرمایا۔)(۲)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ زَائِراتِ الْقُبُورِ، وَ الْمُتَّخِذِيْنَ عَلَيْهَا الْمَسَاجِدَ، وَ السُّرُجَ."

---

(۱) الصحیح للمسلم:۹۶۹، و اللفظ له، سنن أبي داود:۳۲۱۸، سنن الترمذي:۱۰۴۹، سنن النسائي:۲۰۳۱، مسند أحمد:۷۴۱، المستدرک للحاکم :۱/۵۲۴

(۲) الصحیح للمسلم:۹۷۰، مسند أحمد:۱۴۱۸۲، مصنف ابن أبي شيبة:۳/۲۵، مشکوٰة المصابیح:۱۴۸

(رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اور قبروں پر مساجد بنانے اور چراغاں کرنے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔)(۱)

ان احادیث میں اللہ کے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ نے اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان امور سے منع کیا ہے، جن کو یہ قبروں کی مجاوری کرنے والے لوگ تعظیم شعائر کے عنوان سے کرتے ہیں۔ کیا اللہ کے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ سے بڑھ کر کوئی قرآن سمجھ سکتا ہے اور آپ سے زیادہ کوئی اس پر عمل پیرا ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں اور واقعی نہیں؛ تو معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ کی مزارات پر ہونے والے یہ کام شعائر اللہ کی تعظیم میں داخل نہیں اور نہ اللہ نے اس کا حکم دیا ہے؛ بل کہ یہ سارے کام ممنوع و ناجائز ہیں، جو محض غلامانِ ہوی و ہوس کی ایجاد کہلانے کے مستحق ہیں اور دین سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

بدعاتِ زمانہ اور خواہش پرستی

اسی طرح ہوی پرستوں نے دین کے نام سے دین میں نئے نئے کام ایجاد کر کے لوگوں کو اسی میں مشغول کر دیا۔ ان کو نماز و روزہ، حج و زکوۃ، ذکر و تلاوت، عبادت و اطاعت، خوف و خشیت، تقویٰ و طہارت وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں، ان کو تو ہر وقت اس کی دھن لگی ہوئی ہے کہ جمعہ و جمعرات کی فاتحہ ہو، بچے کی پیدائش کی رسمیں انجام دی جائیں۔ جیسے عقیقے کی رسمیں، چھٹی کی رسمیں، بسم اللہ خوانی کی رسمیں وغیرہ، اسی طرح منگنی و شادی بیاہ کا موقعہ آئے، تو ان کی رسمیں ہوں، موتیٰ کے موقعے پر سوم، دہم، چہلم و برسی کی رسمیں کی جائیں۔

---

(۱) سنن أبي داود: ۳۲۳۶، سنن الترمذي: ۳۲۰، سنن النسائي: ۲۰۴۳، مسند أحمد: ۲۰۳۰، صحیح ابن حبان: ۷/۴۵۲، المستدرک للحاکم: ۱/۵۳۰، مشکوۃ المصابیح: ۱/۷

پھر مختلف مہینوں کی مختلف رسمیں کا ایک سلسلہ قائم کر دیا گیا ہے:

''محرم الحرام'' میں دیکھو تو پنجے بٹھائے جا رہے ہیں اور ان کو لیے گشت کیا جا رہا ہے، ''یا علی دولھا، حسن حسین'' کے ناموں کے نعرے بے ادبی کے ساتھ لگائے جا رہے ہیں، ان بزرگوں کے نام سے تعزیے وعَلم نکالے جا رہے ہیں، ان پر منتیں مانی جا رہی ہیں اور ان کو عقیدت سے چوما جا رہا ہے۔ اسی طرح کھچڑے و چونگے و شربت بنا کر کھا رہے ہیں اور لوگوں میں تقسیم کر رہے ہیں اور سمجھانے کی کوشش بھی کی جا رہی ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جو بھوکے و پیاسے شہید ہو گئے، ان کو اس شربت و کھانے سے تسکین ملے گی۔

ماہِ ''صفر'' کے ابتدائی تیرہ ایام کو منحوس سمجھ کر ان میں خرید و فروخت، شادی بیاہ کو برا خیال کیا جاتا ہے، پھر اسی کے آخری بدھ کو ''آخری چہار شنبہ'' کا عنوان دے کر باغات و تفریحی مقامات کی سیر کی جاتی ہے اور اس کام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔

''ربیع الاول'' میں ''بارھویں یا عیدِ میلاد'' کے نام سے جلسے و جلوس کیے جاتے ہیں اور ان میں ہر قسم کی بے راہ روی و خلافِ شرع کام کیے جاتے ہیں۔

''ربیع الثانی'' میں ''گیارھویں'' کا رواج لازم سمجھا جاتا ہے، اس کے لیے اگر روپیہ نہ ہو، تو قرض لے کر انجام دینے کی فکر ہوتی ہے اور نہ کرنے کی صورت میں نحوستوں کے وارد ہونے کا نظریہ قائم کر لیا گیا ہے۔

اسی طرح ''رجب'' کے مہینے میں ''کونڈے کی رسم'' ادا کی جاتی ہے، اس کے ثبوت کے لیے بے تکے واقعات کا سہارا لیا جاتا ہے، بزرگوں کی جانب اس کو منسوب کیا جاتا ہے، جب کہ وہ حضرات اس سے بری ہیں۔ نیز معراج کی رات بہ طور عید منانے کا اہتمام کیا جاتا ہے اور اس رات مساجد میں چراغاں کرنے اور

مخصوص قسم کی نمازیں پڑھنے کا التزام کیا جاتا ہے۔

''رمضان شریف'' کا ورود ہوا، تو اس کی آخری جمعہ کو''الوداع'' کی رسم ادا کی جارہی ہے۔

''شعبان'' کا مہینہ آیا، تو ''شب برأت'' کو بہ طور عید مناتے ہیں۔ اس رات قبرستان جانے کا اور ایصالِ ثواب کا اہتمام کرتے ہیں۔ نیز''شبِ برأت کا حلوہ'' اور گھروں کی لپائی پتائی اور مرحومین کی اس رات حاضری کا عقیدہ رکھتے ہوئے ان کے لیے بھی دعوت کا اہتمام وغیرہ رسمیں کرتے ہیں اور بعض تو حد یہ کرتے ہیں کہ اس رات میں آتش بازی کی ایک حرام رسم کو اس میں داخل کرتے ہیں۔

نیز عید و بقر عید کی رسمیں وغیرہ انجام دی جاتی ہیں۔ ان سب بدعات و بے اصل باتوں کے پیچھے جو دماغ کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ وہی ہویٰ وہوس کے غلاموں کا دماغ ہے۔

احکامِ شرعیہ پر عمل میں ہویٰ پرستی کا دخل

ہویٰ پرستی کا ایک نمونہ ہمیں وہاں بھی ملتا ہے، جہاں لوگ حضراتِ ائمہؒ کرام کی تقلید کو حرام قرار دے کر اپنے خیال کے مطابق دین وشریعت پر عمل کرتے ہیں اور ہویٰ پرستی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور نصوصِ قرآن وسنت کو من مانی مفاہیم پہنا کر راہِ حق سے کٹ جاتے ہیں۔

شروع دور سے اب تک امت نے - جن میں حامیینِ تقلید و تارکینِ تقلید دونوں شامل ہیں اور حامیینِ تقلید میں چاروں ائمہ کے مقلدین داخل ہیں - وضو کے مسائل میں قرآن وسنت کی روشنی میں یہ طے کیا ہوا تھا کہ اگر کوئی چمڑے کے موزے پہنا ہوا ہے، تو وہ ان پر مسح کرسکتا ہے اور اگر موزے نہیں پہنا ہے، تو اس کو پیروں کا دھونا فرض

ہے اور چمڑے کے وہ موزے جو عربوں میں معروف ومروج تھے، وہی موزوں سے مراد لیے جاتے تھے اور کسی نے کبھی "مسح علی الخفین" سے یہ نہیں سمجھا کہ سوتی ونیلون وغیرہ کے موزوں یا جوتوں پر مسح بھی "مسح علی الخفین" ہے؛ لہٰذا ان پر بھی مسح جائز ہے؛ لیکن اب خود اجتہادی کے اس دور میں سارے ائمہ وعلما؛ بل کہ جمہورِ اہلِ اسلام کے خلاف یہ نظریہ بعض لوگوں نے قائم کرلیا ہے کہ موزے کے نام سے جو بھی چیز سامنے آجائے اس پر مسح جائز ہے؛ لہٰذا سوتی موزوں، نیلون کے موزوں؛ بل کہ عام جوتوں پر بھی مسح جائز ہے۔ یہ ہویٰ پرستی نہیں تو اور کیا ہے کہ جس میں سہولت دیکھی وہی مسلک بنالیا؟

اسی طرح ہوا پرستی کا ایک نمونہ یہ نظر آتا ہے کہ بعض لوگ حضراتِ ائمہ کے مختلف مسالک میں سے، ان امور ومسائل کو اپنا لیتے ہیں، جو آسان وسہل معلوم ہوتے ہیں اور ان امور واحکام کو چھوڑ جاتے ہیں، جن میں کوئی مشقت و دقت معلوم ہوتی ہے، اس طرح ہوائے نفسانی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

علامہ قاضی عیاض مالکی رحمہ اللہ نے "ترتیب المدارک" میں اور امام شاطبی رحمہ اللہ نے "الموافقات" میں لکھا ہے کہ مالکی فقیہ امام بہلول بن راشد رحمہ اللہ، جو امام مالک رحمہ اللہ کے شاگردِ رشید تھے، ان کے پاس ایک مرتبہ اسی زمانے کے ایک اور فقیہ اور امام مالک رحمہ اللہ ہی کے شاگرد امام ابن اشرس رحمہ اللہ حاضر ہوئے، امام بہلول رحمہ اللہ نے پوچھا کہ کیسے تشریف لائے؟ تو کہا کہ ایک مسئلہ درپیش ہے کہ ایک شخص پر سلطان نے ظلم کیا، تو میں نے اس شخص کو کہیں چھپا دیا اور تین طلاق کی قسم کھالی کہ اگر میں نے اس کو چھپایا ہے، تو میری بیوی پر تین طلاق، اس میں کیا حکم ہے؟ حضرت بہلول رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ طلاق پڑ گئی۔ ابن اشرس رحمہ اللہ نے

کہا کہ ہاں! میں نے بھی امام مالک رَحِمَہُ اللّٰہُ سے یہ سنا ہے؛ مگر میں اس کے علاوہ کسی اور کا قول ہو، تو وہ چاہتا ہوں۔ امام بہلول رَحِمَہُ اللّٰہُ نے کہا کہ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں۔ جب دو تین بار وہ یہی پوچھتے رہے، تو تیسری یا چوتھی بار امام بہلول رَحِمَہُ اللّٰہُ نے فرمایا:

"یا ابن اشرس ! ما أنصفتم الناس ، إذا أتوكم في نوازلهم قلتم: "قال مالک": فإذا نزل بكم النوازل طلبتم الرخص."

(اے ابن اشرس! تم نے لوگوں سے انصاف نہیں کیا، جب لوگ تمھارے پاس اپنے مسائل لے کر آتے ہیں، تو تم کہتے ہو کہ امام مالک رَحِمَہُ اللّٰہُ نے یہ فرمایا؛ لیکن جب تمھیں مسائل پیش آئے، تو تم رخصت تلاش کرنے لگے۔)

پھر کہا کہ امام حسن بصری رَحِمَہُ اللّٰہُ کا قول ہے کہ اس صورت میں طلاق نہیں پڑی۔ یہ سن کر ابن اشرس نے کہا: " الله أكبر ". پس اس میں انھوں نے حضرت حسن رَحِمَہُ اللّٰہُ کی تقلید کرلی۔(۱)

اسی نوع کا واقعہ سنا تھا کہ ایک صاحب جو خون نکل جانے سے وضو کے ٹوٹ جانے کا نظریہ رکھتے تھے کہ ایک بار سخت سردی کے ایام میں خون نکل جانے کی وجہ سے ان کا وضوٹوٹ گیا؛ مگر سردی کی شدت سے وضو کرنے کی ہمت نہ ہوئی، تو کہنے لگے کہ بعض ائمہ جیسے امام شافعی رَحِمَہُ اللّٰہُ کے نزدیک خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا؛ لہٰذا میں اب امام شافعی رَحِمَہُ اللّٰہُ کے مسلک پر عمل کرتا ہوں، یہ سوچ کر انھوں نے وضو نہیں کیا اور نماز کے لیے چلے، راستے میں ایک عورت سے ٹکر ہوگئی اور امام شافعی رَحِمَہُ اللّٰہُ کے مسلک میں عورت سے ٹکر یا مس ہو جانے سے وضوٹوٹ جاتا ہے۔ وہ جس مصیبت سے بچنے کے لیے مسلک تبدیل کر رہے تھے، یہاں وہی مصیبت

---

(۱) ترتیب المدارک:۱/۱۱۴، الموافقات:۵/۸۴

گلے پڑ گئی؛ لہٰذا کہنے لگے کہ اب میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک پر عمل کرتا ہوں کہ ان کے یہاں اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

اب غور کریں کہ ان صاحب کا وضو، نہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک پر باقی ہے اور نہ امام شافعی رحمہ اللہ کے مسلک پر؛ مگر وہ نماز پڑھ رہے ہیں۔

امام بیہقی رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ قاضی اسماعیل بن اسحاق رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں امیر المؤمنین معتضد کے پاس حاضر ہوا، تو انھوں نے مجھے ایک کتاب دی، میں نے دیکھا کہ اس میں علما کی لغزشوں کو جمع کر کے بادشاہ کے لیے رخصت فراہم کی گئی ہے اور اس میں ہر عالم کی وہ دلیل بھی مذکور ہے، جس سے اس نے حجت پکڑی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یا امیر المؤمنین! اس کتاب کا مصنف تو زندیق ہے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ کیا اس میں جو احادیث ہیں، وہ صحیح نہیں ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ احادیث تو اپنی جگہ صحیح ہیں؛ لیکن جس نے کسی نشہ آور کو جائز کہا، اس نے متعہ کو جائز نہیں کہا اور جس نے متعہ کو جائز کہا، اس نے گانے اور نشہ آور کو جائز نہیں کہا، ہر عالم سے کوئی لغزش ہوتی ہے؛ لہٰذا جو ان کو جمع کرے اور ان کو اختیار کر لے، تو اس کا دین ہی رخصت ہو جاتا ہے۔ یہ سن کر بادشاہ نے اس کتاب کو جلا دینے کا حکم دیا اور وہ جلا دی گئی۔ (۱)

امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص ہر رخصت پر عمل کرے اور نبیذ کے بارے میں اہلِ کوفہ کا قول اور سماع کے بارے میں اہلِ مدینہ کا قول اور متعہ کے بارے میں اہلِ مکہ کا قول اختیار کر لے، تو وہ فاسق ہے۔ (۲)

اور اصولِ فقہ کی معروف کتاب " المسودۃ " - جس کی تالیف علامہ مجد

---

(۱) السنن للبيهقي: ۲۱۱/۱۰

(۲) البحر المحيط للزركشي: ۶۰۲/۴

الدین ابن تیمیہ رَحِمَہُ اللّٰہُ نے شروع کی تھی، پھر ان کے صاحب زادے علامہ عبد الحلیم رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اس میں اضافہ کیا اور ان کے صاحب زادے علامہ شیخ الاسلام احمد ابن تیمیہ رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اس کی تکمیل کی- میں اسی قول کو امام احمد رَحِمَہُ اللّٰہُ کے حوالے سے امام یحییٰ القطان رَحِمَہُ اللّٰہُ کی جانب منسوب کیا ہے۔(۱)

ممکن ہے کہ یہ بات امام احمد رَحِمَہُ اللّٰہُ نے امام یحییٰ رَحِمَہُ اللّٰہُ سے سنی ہو اور اسی کو اپنالیا ہو اور اپنی جانب سے بھی وہی بات فرمائی ہو، اس طرح یہ دونوں کا قول ہو گیا۔

امام خلال رَحِمَہُ اللّٰہُ نے بہ حوالہٗ امام عبد الرزاق، حضرت معمر رَحِمَہُمَا اللّٰہُ سے اسی طرح کا قول نقل کیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں:

" لو أن رجلاً أخذ بقول أهل المدينة في استماع الغناء و إتيان النساء في أدبارهن ، و بقول أهل مكة في المتعة ، والصرف و بقول أهل الكوفة في المُسكِر كان شَرَّ عِبادِ اللّٰه. "

(اگر کوئی شخص گانا سننے اور بیویوں سے پیچھے کی راہ سے جماع کے بارے میں اہلِ مدینہ کا اور نکاحِ متعہ اور سونے چاندی کی بیع میں زیادتی کے بارے میں اہلِ مکہ کا اور نشہ آور چیز یعنی نبیذ کے بارے میں اہلِ کوفہ کا قول اختیار کرلے، تو وہ اللہ کے بندوں میں سب سے بدتر بندہ ہوگا۔)(۲)

اسی لیے علما نے محض خواہشات کی پیروی میں متعدد ائمہ کے مسالک سے اپنے پسند کے احکام اختیار کر لینے اور ان میں رخصت کو تلاش کرنے، اسی طرح محض خواہشات کی پیروی میں مسلک کے بدلنے کو ناجائز قرار دیا ہے۔

---

(۱) المسودة:۴۶۳

(۲) الأمر بالمعروف للإمام الخلال:۲۰۹، التلخيص الحبير لابن حجر:۳۹۸/۳

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”وقد نص الإمام أحمد- رحمہ اللہ -و غيره على أنه ليس لأحد أن يعتقد الشيء واجبا أو حراما ، ثم يعتقده غير واجب أو محرم بمجرد هواه..................

فمثل هذا ممن يكون في اعتقاده حل الشيء ، وحرمته ، و وجوبه ، وسقوطه بسبب هواه ، هو مذموم مجروح خارج عن العدالة ، و قد نص أحمد- رحمہ اللہ - وغيره على أن هذا لايجوز .“

(امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی چیز کو واجب یا حرام سمجھے، پھر اسی کو محض اپنی نفسانی خواہش کی وجہ سے غیرِ واجب یا غیرِ حرام قرار دے دے..............(پھر اس کی مثالیں دے کر خلاصے کے طور پر کہتے ہیں) تو جو شخص اس قسم کے معاملات میں محض اپنی خواہش نفس کی وجہ سے کسی چیز کی حلت یا حرمت یا وجوب و جواز کا فیصلہ کرتا ہو، وہ نہایت ہی قابلِ مذمت و قابلِ جرح اور دائرۂ عدالت سے خارج ہے، امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ یہ عمل ناجائز ہے۔)(۱)

اسی طرح ایک اور مقام پر شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے جس میں کسی نے یہ پوچھا تھا :

”ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں؛ مگر اس عورت کے نکاح کا جو ولی تھا، وہ فاسق تھا اور بعض ائمہ کے نزدیک فاسق کی

---

(۱) الفتاوی الکبری:۹۵/۵

ولایت کا اعتبار نہیں، تو کیا وہ ان ائمہ کے مسلک کے مطابق یہ قرار دے سکتا ہے کہ وہ نکاح فاسد تھا اور اس وجہ سے یہ تین طلاقیں بھی اس پر واقع نہیں ہوئیں ؛ لہٰذا اس عورت سے وہ دوبارہ بلا حلالہ کے نکاح کر سکتا ہے؟''

اس کا جواب دیتے ہوئے آپ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

" وهذا القول يخالف إجماع المسلمين ، فإنهم متفقون على أن من اعتقد حل الشيء كان عليه أن يعتقد ذلک سواء وافق غرضه أو خالفه ، و من اعتقد تحريمه كان عليه أن يعتقد ذلک في الحالين. "

(یہ قول اجماعِ مسلمین کے خلاف ہے؛ کیوں کہ مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ جو شخص کسی بات کے حلال ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے، تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس عقیدے پر رہے، خواہ اس کی غرض کے وہ موافق ہو یا اس کے خلاف اور جو شخص کسی چیز کے حرام ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے، اس پر لازم ہے کہ وہ دونوں صورتوں میں اسی کا عقیدہ رکھے۔)(۱)

امام شاطبی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الموافقات'' میں اس پر تفصیلی کلام کیا ہے اور لکھا ہے کہ رخصتوں کا تلاش کرنا نفسانی خواہشات کی جانب میلان ہے اور شریعت میں اس سے منع کیا گیا ہے۔(۲)

علامہ شامی رحمہ اللہ نے " الفتاوی التاتارخانية " کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک صاحب جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے لوگوں میں سے تھے، انھوں نے

---

(۱) الفتاوی الکبری:۲۰۵/۳

(۲) الموافقات:۹۹/۵

ایک محدث کی لڑکی کو پیغام نکاح دیا، ان محدث نے نکاح اس شرط پر منظور کیا کہ وہ صاحب حنفی مسلک چھوڑ دیں اور ان کا مسلک اختیار کرلیں۔ ان صاحب نے ایسا ہی کیا کہ اپنا مسلک چھوڑ کر ان کا مسلک اختیار کرلیا اور ان کی لڑکی سے شادی کرلی۔ یہ زمانہ امام ابوبکر جوزجانی رحمۃ اللہ کا تھا، ان سے یہ مسئلہ معلوم کیا گیا، تو انھوں نے فرمایا کہ نکاح تو ہوگیا؛ مگر مجھے خوف ہے کہ نزع کے وقت کہیں اس کا ایمان سلب نہ ہو جائے؛ کیوں کہ اس نے اس مسلک کا استخفاف کیا، جس کو وہ حق سمجھتا تھا اور اسے محض ایک دنیا کی ناپاک چیز یعنی عورت کی خاطر چھوڑ دیا۔(۱)

الغرض ہوائے نفسانی کی بنا پر مسلک بدلنا اور ائمہ کے مسالک میں سے رخصتوں کو تلاش کرنا جائز نہیں اور غلو فی الدین کا سبب ہے۔ ہاں! اگر کوئی عالم جو دلیل کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے، وہ کسی دلیل کی وجہ سے یا ضرورتِ شرعیہ کی وجہ سے ایسا کرتا ہے، تو وہ جائز ہے، جیسا کہ ہمارے ائمہ نے خود فرمایا: ''یہ ناجائز ہونا اس وقت ہے، جب کہ کسی غرضِ صحیح کی بنا پر نہ ہو۔''(۲)

نیز شامی رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ اس معاملے میں تعصب نہ برتنا چاہیے؛ ورنہ ائمۂ کرام کی برکات سے محروم ہو جائیں گے۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

''وأما إذا تبين له ما يوجب رجحان قول على قول إما بالأدلة المفصلة إن كان يعرفها ، و يفهمها ؛ و إما بأن ترى أحد رجلين أعلم بتلك المسئلة من الآخر ، أو هو أتقى لله فيما يقول ، فيرجع عن قول إلى قول فهذا يجوز

(۱) رد المحتار:۴/۸۰

(۲) رد المحتار:۷/۱۴۸

بل يجب ، و نص الإمام أحمد على ذلک .''

(لیکن اگر آدمی کے سامنے ایک قول کا دوسرے قول پر راجح ہونا ظاہر ہو جائے، خواہ مفصل دلائل کی وجہ سے، جب کہ وہ دلائل کو جانتا اور سمجھتا بھی ہو، یا یہ کہ تم دیکھو کہ دو اماموں میں سے ایک، اس مسئلے کا زیادہ علم رکھنے والا ہے، یا وہ زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہے؛ اس لیے وہ ایک قول سے دوسرے قول کی جانب رجوع کرتا ہے، تو یہ جائز ہے؛ بل کہ واجب ہے۔)(١)

الغرض دین کو اپنے مقاصد یا اپنی خواہشات کا تابع بنانا کسی طرح جائز نہیں ؛ بل کہ دین میں نفسانی خواہشات کا دخل خود ایک بے دینی کی بات ہے۔

عقل پرستی

ایک اور سبب غلو فی الدین کی بیماری کا عقل پرستی اور عقل کو حاکمیت کے درجے پر فائز کر دینا ہے۔ چناں چہ ماضی میں متعدد باطل فرقوں کا جنم اسی غلط نظریے و فکر کا مرہونِ منت ہے، چناں چہ ''معتزلہ'' و ''قدریہ''، ''جہمیہ'' وغیرہ فرقوں کا سب سے بڑا نظریہ یہی تھا کہ عقل کے خلاف کوئی بات قابل قبول نہیں ؛ لہٰذا انھوں نے اللہ کی صفات میں بے جا تاویلات سے کام لیا اور بہت سے حقائق کو توڑ مروڑ کر اس کو بے جان کر دیا اور عصرِ حاضر میں بھی جدت پسند و جدید تعلیم یافتہ طبقے میں یہی بیماری پرورش پا رہی ہے۔

یہ لوگ قرآن و حدیث کے قبول کرنے اور ان کے حقائق و احکام کی صحت کے لیے اپنی عقل کو معیار مانتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ عقل سے جو بات سمجھ میں آئے، وہ

---

(١) دیکھو: الفتاوی الکبری:٥/٩٥

حق اور جو اس کے خلاف ہو وہ قابل تاویل یا قابل رد ہے؛ لہٰذا ان کے نزدیک حق و باطل کا معیار عقل ہے، اس کو انھوں نے قرآن وحدیث اور علومِ دین پر حاکم بنایا ہوا ہے اور اس باطل نظریے وفکر کی بنیاد پر ان لوگوں نے آخرت میں رؤیت باری، حشر اجسام، صراط، میزان، عذاب وثوابِ قبر وغیرہ حقائق کو تاویل کے پردے میں رد کر دیا۔ وجہ صرف یہ کہ یہ باتیں ان کی عقل میں نہیں آتی تھیں، گویا ان لوگوں نے عقل کو شریعت پر حاکم بنا دیا کہ جو عقل کہے، اس کو مانیں گے اور جو عقل نہ مانے، اس کو یہ بھی نہیں مانیں گے، اس طرح ان لوگوں نے غلو فی الدین کا دروازہ کھول دیا۔

عقل کو شریعت پر حاکم بنانا سنگین غلطی ہے

عقل کو دین وشریعت پر حاکم بنا دینا کس قدر سنگین غلطی ہے؟ اس کا اندازہ ان لوگوں کو نہیں ہے؛ ورنہ ان کا طرزِ فکر یہ نہ ہوتا؛ کیوں کہ اس کا حاصل تو یہ نکلا کہ اگر شریعت کا حکم عقل نے مانا، تو وہ قابلِ قبول ہے؛ ورنہ قابلِ رد۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ حضرات انبیا کے مبعوث ہونے اور آسمانی صحائف کے نازل کیے جانے کی کیا ضرورت تھی؟

بات یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے عقل نہ بالکل بے کار چیز ہے اور نہ اس قدر قابلِ اعتبار کہ ہم اس کو دین وشرع پر حاکم قرار دے دیں اور اسلام نہ عقل کے خلاف ہے اور نہ عقل کو برتنے کا منکر؛ بل کہ اسلام سب سے زیادہ معقول مذہب اور عقل سے کام لینے کا برملا وتاکیدی حکم دیتا ہے؛ مگر عقل کو برتنے کا یہ مطلب نہیں کہ ہر انسان کی عقل کو حاکم تسلیم کر لیا جائے اور جو بات اس کی عقل میں نہ آئے، اس کو رد کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر عقل کے استعمال کا یہ مطلب ہو، تو پھر دنیا ودین کی کسی بھی چیز کا کوئی ثبوت نہ ہو سکے گا؛ کیوں کہ تمام انسانوں کی عقل ایک درجے ومعیار کی نہیں ہے؛ لہٰذا

اگر ہر کوئی کسی بھی بات کو یہ عذر بیان کر کے رد کر دے کہ میری سمجھ میں نہیں آتی، تو کیا اس کو عقل کا تقاضا کہا جائے گا یا یہ کہ ظن وگمان کی پیروی کا نام دیا جائے گا؟ ظاہر ہے کہ حقائق کو یہ کہہ کر رد کرنا محض اتباعِ ظن ہے، جس سے منع کیا گیا ہے۔

چناں چہ قرآن میں اتباعِ ظن سے منع فرمایا گیا:

﴿إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ﴾ (النجم: ۲۸)

(یہ لوگ نہیں اتباع کرتے؛ مگر صرف اپنے خیال کا۔)

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا﴾ (یونس: ۳۶)

(اور ان میں سے اکثر لوگ صرف اپنے خیال کی اتباع کرتے ہیں۔)

یہ اتباعِ ظن بھی دراصل جہالت کی ہی ایک شاخ ہے؛ کیوں کہ اندازے و تخمینے کا درجہ سوائے ناواقفیت کے کچھ نہیں؛ لہٰذا قرآن و حدیث کے مقابلے میں عقل کا استعمال دراصل عقل کا استعمال نہیں؛ کیوں کہ قرآن و حدیث عقل کے خلاف کبھی نہیں ہو سکتے۔ ہاں! یہ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص اپنی بے عقلی کو عقل سمجھ جائے اور اسی کا اتباع کر کے حقائق کو ٹھکرائے اور باطل و غلط باتوں کو دل سے لگالے؛ یہاں تک کہ اسے اچھے و برے اور حق و باطل کے مابین امتیاز ہی نہ رہے۔ اس لیے قرآن اس کو رد کرتا ہے اور اس کو اتباعِ ظن قرار دیتا ہے۔

عقل کی ایک عمدہ مثال

حضرت حکیم الامت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے عقل کی ایک بہترین مثال دی ہے، جس سے اس کا درجہ و مقام بھی معلوم ہوگا اور اس کی حدود کا بھی پتہ چلے گا۔ اسے میں اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہوں، وہ یہ کہ عقل کی مثال ایسی ہے جیسے پہاڑ پر

چڑھانے کے لیے گھوڑا؛ نیز اس سلسلے میں تین قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں: ایک تو وہ جو گھوڑے پر سوار ہو کر پہاڑ تک پہنچیں اور پھر پہاڑ پر بھی اسی پر سوار ہو کر چڑھنے لگیں، دوسرے وہ جو یہ سوچ کر کہ گھوڑا پہاڑ پر چڑھائی کے لیے تو کام نہیں دیتا؛ لہٰذا گھر سے بھی اس پر سوار ہو کر جانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ گھر ہی سے پیدل چل پڑے، یہ بھی غلطی پر ہے؛ کیوں کہ وہ گھر سے پیدل چل کر پہاڑ پر چڑھنے سے پہلے ہی تھک جائے گا اور پہاڑ پر چڑھنے سے رہ جائے گا اور تیسرے وہ جو پہاڑ پر چڑھنے کے لیے اپنے گھر سے نکلتا ہے اور گھوڑے پر سوار ہو کر پہاڑ تک پہنچتا ہے اور پہاڑ کے پاس اس سے اتر کر پہاڑ کی چڑھائی کو عبور کرتا ہے۔

ان تین شخصوں میں سے پہلے دو کی رائے غلط ہے: پہلے کی تو اس لیے کہ اس نے گھوڑے کو گھر سے پہاڑ تک جانے کے لیے بھی اور پھر پہاڑ پر چڑھائی کے لیے بھی دونوں کے لیے مفید و کار آمد سمجھا، حال آں کہ یہ صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ کسی نہ کسی جگہ سیدھی چڑھائی پر یہ سوار شخص اور وہ گھوڑا دونوں گر سکتے ہیں اور دونوں کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے اور دوسرا اس لیے غلطی پر ہے کہ اس نے گھوڑے کو دونوں جگہ بے کار سمجھ لیا، حال آں کہ گھر سے پہاڑ تک اس کو استعمال کر سکتا تھا اور تیسرے کی رائے صحیح ہے، جس نے پہاڑ تک گھوڑے کو استعمال کیا اور پہاڑ پر خود چڑھا اور یہ سمجھا کہ گھوڑا سڑک پر چلنے کے کام تو آ سکتا ہے؛ مگر پہاڑ پر چڑھنے کے لیے کار آمد نہیں۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ اس مثال کو دے کر فرماتے ہیں:

> ''یہی حال عقل کا ہے کہ عقل سے بالکل کام نہ لینا بھی حماقت ہے اور اخیر تک کام لینا بھی غلطی ہے۔ بس عقل سے اتنا کام لو کہ توحید و رسالت کو سمجھو اور کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا معلوم کر لو، اس سے آگے فروع میں عقل سے کام نہ لینا چاہیے؛ بل کہ اب خدا اور رسول کے

آگے گردن جھکا دینی چاہیے، چاہے ان کی حکمت، عقل میں آئے یا نہ آوے۔''(۱)

اس مثال سے معلوم ہوا کہ عقل اللہ کی ایک ایسی نعمت ہے، جس سے انسان ضرورت کے مواقع پر اسے حدود میں استعمال کرے، تو بڑا فائدہ ہوتا ہے؛ لیکن اگر اس کو موقعہ و بے موقعہ استعمال کرے، تو نتائج غلط رونما ہو سکتے ہیں۔ جیسے آج کل کے مدعیانِ عقل نے عقل کو ہر جگہ استعمال کرتے ہوئے دھوکہ کھایا ہے۔

عقل پرستی کے خطرناک نتائج

عقل پرستی کے اس رجحان نے دین میں غلو کا ایک طول طویل سلسلہ جاری کر دیا اور مختلف قسم کے عقل پرستوں نے مختلف امور میں اس کا مظاہرہ کیا ہے۔ مثلاً:

(۱) ایک یہ کہ ان لوگوں نے معجزاتِ انبیا کا انکار کیا یا ان کی ایسی تاویل کی، جس سے ان کی حقیقت ہی فوت ہوگئی۔

(۲) بعض مدعیانِ عقل نے اسلامی عقائد میں عقل چلانے کی کوشش کی اور مضحکہ خیز باتوں کا ایک طومار جمع کر دیا۔

جیسے ملائکہ کے بارے میں کہا کہ اگر یہ کوئی جوہر والی مخلوق ہوتی، تو محسوس ہوتی؛ مگر ہم اس کو کبھی محسوس نہیں کرتے؛ لہٰذا ملائکہ کا کوئی وجود ہی نہیں اور بعض نے انکار تو نہیں کیا؛ مگر ان کی تاویل یہ کی کہ ملائکہ سے مراد ''روحانی قوت'' ہے۔ اسی طرح جنات وشیاطین کا انکار کیا؛ یا بے ہودہ تاویلات سے کام لیا۔

اور جیسے معراج کے واقعے کی تکذیب کر دی اور اس تکذیب کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ عقل میں نہیں آتا یا یہ کہ عقل کے خلاف ہے۔

---

(۱) وعظ: تفصیل الدین: مندرجہ خطبات حکیم الامت رحمہ اللہ: ۳/۸۵-۸۶

اسی طرح عذابِ قبر کا اس لیے انکار کیا کہ وہ نظر نہیں آتا اور جو نظر نہ آئے، وہ کیسے مان لیں؟ یہ بھی ان عقل پرستوں کی بے عقلی کا نتیجہ ہے؛ ورنہ خود عقل یہی کہتی ہے کہ بہت سی چیزیں نظر نہیں آتیں؛ مگر ان کو مانا جاتا ہے۔ جیسے خود انسان کی روح، وہ موجود تو ہے،؛ لیکن نظر نہیں آتی۔

(۳) بعض نے بعض شرعی احکامات کا مدار اپنے ذہن و عقل سے تراشیدہ مصلحتوں پر سمجھ کر ان احکامات کو ان مصلحتوں کے تابع کر دیا۔

مثلاً وضو کی حکمت و مصلحت نظافت قرار دے دی اور یہ سمجھا کہ اگر کسی کو پہلے سے نظافت حاصل ہے، تو نماز کے لیے وضو کی کوئی ضرورت نہیں۔

بعض نے یہ کہا کہ نماز کی مصلحت کسرتِ بدن وریاضتِ جسمانیہ ہے؛ لہٰذا اصل مقصود یہ ورزش و کسرت ہے، خواہ کسی بھی طریقے سے حاصل ہو جائے، لہٰذا اگر کوئی یوگا (Yoga) کے ذریعے اسے حاصل کر لے، تو نماز ادا ہو گئی۔

بعض نے کہا کہ نماز کا مقصود تہذیب و ترتیب و تنظیم ہے اور یہ ایک ٹریننگ کورس ہے۔

بعض نے قربانی کو غیر ضروری؛ بل کہ خلافِ عقل کہہ کر رد کر دیا اور کہنے لگے کہ عیدِ قربان کے ایک دو دنوں میں لاکھوں جانوروں کو ذبح کرنے کے بہ جائے اس رقم کو کسی مصرفِ خیر میں لگانا عقل کا تقاضا ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اپنی کتاب ”الانتباہات المفیدۃ“ میں اس قسم کی ذہنیت رکھنے والوں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

”بعض نے ان میں یہ غلطی کی ہے کہ احکام کو مقصود بالذات نہیں سمجھا؛ بل کہ ہر حکم کی اپنی رائے سے حکمت نکال کر اس حکم کو مقصود سمجھا اور ان حکمتوں اور مصلحتوں کو دوسرے طرق سے حاصل کر سکنے کے بعد پھر ان

احکام کی ضرورت نہیں سمجھی۔ مثلاً نماز میں تہذیبِ اخلاق کو اور وضو میں صرف تنظیف کو اور روزے میں تعدیلِ قوتِ بہیمیہ کو اور زکوۃ میں ایسے لوگوں کی دست گیری کو جو ترقی کے ذرائع پر قادر نہیں اور حج میں اجتماع تمدنی اور ترقی و تمرنِ تجارت کو اور تلاوتِ قرآن میں صرف مضامین پر مطلع ہونے کو اور دعا میں صرف نفس کی تسلی کو اور اعلائے کلمۃ اللہ میں صرف امن و آزادی کو مصلحت قرار دے کر جب ان مصالح کی ضرورت نہ رہی یا وہ مصالح دوسرے اسباب سے حاصل ہو سکیں، ان حالتوں میں ان احکام کو لایعنی قرار دیا اور نفس کو جب اتنا سہارا ملا، پھر مصالح کے حصول کا بھی انتظار نہ رہا، بالکل ان کو چھوڑ کر معطل ہو بیٹھے۔"(۱)

عقل پرستوں کی بے راہ روی کی بنیادیں

یہاں یہ ذکر کر دینا بھی مناسب ہے کہ عام طور پر ان مدعیانِ عقل و دانش کی چند بنیادی اغلاط ہیں، جن کی وجہ سے وہ دوسروں سے ہٹ کر اپنا ایک الگ نظریہ قائم کر لیتے ہیں، حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ نے ان ہی لوگوں کی خاطر ایک رسالہ "الانتباہات المفیدۃ فی حل الاشکالات الجدیدۃ" تحریر فرمایا ہے، جس کا مطالعہ ایسے لوگوں کے لیے ناگزیر ہے۔

میں یہاں اختصاراً چند بنیادی امور پیش کرتا ہوں، جن میں ان لوگوں کو غلطی لگتی ہے۔

(۱) ان لوگوں کی ایک بنیادی غلطی یہ ہے کہ یہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا یعنی اپنی عقل میں نہ آنا، اس کے باطل ہونے کی دلیل ہے؛ حال آں کہ یہ

(۱) الانتباہات المفیدۃ: ۶۵

بات اصولاً بالکل غلط ہے؛ کیوں کہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں، جو ہر کس و نا کس کی سمجھ میں نہیں آتیں ؛مگر ان کو ہر ذی عقل و ہوش تسلیم کرتا ہے۔مثلاً موجودہ دور میں عجیب و حیرت انگیز ایجادات میں سے کتنی ایسی ہیں! جو ہر شخص کی عقل میں پوری طرح نہیں آتیں: ٹی وی، کمپیوٹر، انٹرنیٹ وغیرہ۔تو کیا یہ کہا جائے گا کہ یہ باطل ہیں؟ یا یہ کہا جائے گا کہ یہ عقل کے خلاف نہیں ؛مگر فلاں کی عقل کی کمزوری کی وجہ سے اس کی سمجھ میں نہیں آتیں!

اسی طرح دین و شرع میں اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے،تو یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ فلاں کی عقل میں کمزوری کی وجہ سے اس کو سمجھ میں نہیں آئی ؛مگر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ چیز باطل ہے۔

جیسے پل صراط کے بارے میں شریعت میں بتایا گیا ہے کہ وہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے اور لوگوں کو اس پر چلنا پڑے گا۔اگر کسی کی عقل میں یہ بات نہ آئے تو یہ غلط ہونے کی دلیل نہیں ہے؛لہٰذا جو لوگ عقل میں نہ آنے کی وجہ سے اس کو باطل کہتے ہیں،وہ انتہائی غلطی پر ہیں۔

(۲) دوسرے یہ کہ یہ لوگ عموماً خلافِ عقل اور خلافِ عادت کے درمیان فرق نہیں کرتے ؛بل کہ دونوں کو ایک سمجھنے کی بنیادی و اساسی غلطی میں مبتلا رہتے ہیں، جس کی وجہ سے بہت سی ایسی باتوں کا انکار کر جاتے ہیں، جو محض خلافِ عادت ہوتی ہیں،خلافِ عقل نہیں ہوتیں۔

جیسے بعض جدت پسندوں یا عقل کے مدعیوں نے واقعۂ معراج کا اور دیگر معجزات کا اسی لیے انکار کر دیا کہ یہ ان کے نزدیک خلافِ عقل ہیں؛ حال آں کہ یہ خلافِ عقل نہیں،خلافِ عادت ہیں یعنی عام طور پر ایسا نہیں ہوتا،بل کہ کبھی کبھی جب اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں ایسے کام حضرات انبیا کے ہاتھوں صادر کرا دیتے ہیں،روز روز

ایسے واقعات نہیں ہوا کرتے۔

جو بات بار بار نہ ہو، وہ خلافِ عادت کہلاتی ہے اور خلافِ عادت کام کے واقع ہو جانے پر کوئی اشکال نہیں ہونا چاہیے، جیسے جب تک دنیا میں ہوائی جہاز کا وجود نہیں ہوا تھا، اس وقت تک ہوائی جہاز کی اڑان کو ایک خلافِ عادت واقعہ تو کہہ سکتے ہیں؛ مگر خلافِ عقل نہیں کہہ سکتے، اگر یہ خلافِ عقل ہوتا؛ تو اس کا وجود و وقوع کیسے ہو گیا؟

(۳) تیسرے یہ کہ علت و حکمت کا فرق یہ لوگ نہیں جانتے، جس کی وجہ سے دونوں کے ساتھ یکساں معاملہ کرتے ہیں اور علت کی طرح مدارِ احکام، حکمت کو بھی سمجھتے ہیں؛ حال آں کہ یہ غلط ہے؛ کیوں کہ مدارِ احکام، علت ہوا کرتی ہے، حکمت مدارِ احکام نہیں۔

مثلاً نماز کے مشروع ہونے کی علت تو اللہ کا حکم ہے کہ حکم ہوا اور نماز فرض ہوئی، یہ الگ بات ہے کہ اس حکمِ خداوندی میں کیا کیا مصلحتیں و حکمتیں ہیں؟ نماز سے یہ مصلحتیں حاصل نہ ہوں یا کسی اور ذریعے سے بھی حاصل ہو جائیں، بہ ہر صورت نماز فرض رہے گی۔ یہ لوگ حکمت ہی کو علت سمجھتے اور اس حکمت کے ہونے یا نہ ہونے کو حکم کا مدار قرار دیتے ہیں، جو کہ بداہۃً غلط ہے۔ اسی طرح وضو، زکاۃ، حج و عمرہ، قربانی وغیرہ کی حکمتوں کو علت کا درجہ دے کر گمراہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

(۴) اور ایک غلطی ان لوگوں کی یہ ہے کہ جو چیز موجود ہو، اس کے محسوس و مشاہد ہونے کو لازم سمجھتے ہیں اور اگر وہ چیز محسوس و مشاہد نہیں ہے، تو اس کو موجود بھی نہیں سمجھتے۔ یہ بھی ایک عجیب مغالطہ ہے، حال آں کہ خود ان کو بھی معلوم ہے کہ ان کی روح موجود ہے، جو مشاہد نہیں۔ کیا روح کے مشاہد نہ ہونے کی وجہ سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ روح موجود نہیں؟ نہیں اور ہر گز نہیں! تو پھر نظر میں نہ آنے کی وجہ سے عذابِ قبر و ملائکہ و جنات وغیرہ کا انکار کیوں کر درست ہو سکتا ہے؟

(۵) ایک اور غلطی ان لوگوں کی یہ ہے کہ دلیل ونظیر میں فرق نہیں کرتے اور کسی چیز کے ثبوت کے لیے جس طرح دلیل کی ضرورت ہوتی ہے، یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کے لیے نظیر و مثال بھی لازم وضروری ہے۔

حال آں کہ کسی چیز کے ثابت کرنے کے لیے دلیل کافی ہوتی ہے اور جب کسی چیز کی دلیل بیان کر دی جائے، تو اس سے چیز کا ثبوت ہو جائے گا، مثال ونظیر پر اس کا ثبوت موقوف نہیں؛ مگر ان عقل پرستوں کا بھی عجیب حال ہے کہ کسی چیز کے ثبوت کے لیے مثال کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مثلاً یہ لوگ کہتے ہیں کہ معراج کا واقعہ ایسا ہے کہ اس کی کوئی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی؛ لہٰذا یہ واقعہ ثابت نہیں اور غلط ہے۔ حال آں کہ یہ بات خود عقل کے خلاف ہے؛ کیوں کہ اگر کسی بھی چیز کے ثابت ہونے کے لیے مثال دینا ضروری ہو، تو پھر کوئی بھی چیز حتی کہ یہ دنیا وکائنات بھی ثابت نہیں ہو سکتی؛ کیوں کہ سب جانتے ہیں کہ اس دنیا کے وجود سے پہلے کوئی دنیا نہیں تھی، اسی طرح کوئی سورج و چاند کی نظیر و مثال کا مطالبہ کرے اور کہنے لگے کہ میں سورج و چاند کو اسی وقت مانوں گا، جب اس کی کوئی مثال دی جائے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ کبھی سورج و چاند کا قائل نہ ہو؛ لہٰذا یہ اصول ہی غلط ہے کہ کسی چیز کے ثبوت کے لیے دلیل کے بہ جائے نظیر و مثال کا مطالبہ کیا جائے۔

اس لیے معلوم ہونا چاہیے کہ کسی چیز کے ثبوت کے لیے دلیل کا مطالبہ تو کیا جا سکتا ہے؛ مگر نظیر کا مطالبہ کرنا غلط ہے۔

الغرض عقل پرستی کے دعوے کے باوجود، یہ لوگ خود بہت سی باتیں خلافِ عقل و دانش کہہ جاتے ہیں، جو ان کی غلط فہمی کا راز ہے۔

شریعت کے احکام خلافِ عقل نہیں

اوپر کی اس تفصیل سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ شریعت کے احکام خلافِ عقل ہوتے یا

ہو سکتے ہیں، یا احکامِ شریعت میں کوئی حکمت و مصلحت نہیں ہوتی۔ نہیں؛ بل کہ ہمیں یہاں کہنا اور بتانا یہ ہے کہ ہر کس و ناکس اپنی اپنی عقل سے احکام کو عقل کی بنیاد پر پرکھنے لگے اور اس پر احکام کے ردو قبول کا مدار رکھے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دین و شریعت ایک کھیل ہو کر رہ جائیں گے؛ بل کہ اس کے اصول و ضوابط کے مطابق کام کرنا چاہیے۔

لہٰذا اولاً تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ قانونِ شریعت کا اعجاز ہے کہ اس میں معقولیت و عقلیت پسندی پائی جاتی ہے، اس کا کوئی حکم خلافِ عقل نہیں اور نہ حِکم و اسرار سے خالی ہے۔ چناں چہ حضراتِ علما و ائمہ نے قانونِ شریعت کی معقولیت کو اپنی تصانیف و تالیفات میں پوری شرح و بسط کے ساتھ واضح کیا ہے۔

امام غزالی، امام رازی، علامہ ابن تیمیہ، علامہ ابن القیم اور پھر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور حضرت مولانا قاسم نانوتوی پھر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہم اللہ وغیرہ نے اس پہلو پر سیر حاصل بحثیں فرمائی ہیں۔

علامہ ابن تیمیہ رَحِمَہُ اللّٰہُ نے کیا خوب فرمایا:

”لا یوجد نص یخالف قیاساً صحیحا ؛ کما لا یوجد معقول صریح یخالف المنقول الصحیح.“

(کوئی نص ایسی نہیں ملتی، جو قیاسِ صحیح کے خلاف ہو، جس طرح کہ کوئی صریح معقول ایسا نہیں ملتا، جو منقولِ صحیح کے خلاف ہو۔)(۱)

نیز ایک اور موقعے پر فرماتے ہیں:

”ما عُلِمَ بصریح العقل لا یُتَصَوَّرُ أن یُعارِضَه الشرعُ البتةَ؛بل المنقول الصحیح لا یعارضه معقول صریح قط.“

---

(۱) الفتاوی الکبری:۱/۱۵۸، إقامة الدلیل علی إبطال التحلیل:۴/۱۸۶

(جو بات عقلِ صریح سے معلوم ہو، اس میں یہ بات متصور ہی نہیں ہوسکتی کہ شرع اس کے معارض ہو؛ بل کہ معقولِ صریح کے خلاف منقولِ صحیح کبھی نہیں ہوسکتا۔)(۱)

اور علامہ ابن تیمیہ رَحِمَہُ اللہُ نے یہ بھی فرمایا ہے:

" وقد تدبرت ما أمكنني من أدلة الشرع فما رأيت قياسا صحيحا يخالف حديثاً صحيحاً؛ كما أن المعقول الصريح لا يخالف المنقول الصحيح. "

(میں نے دلائلِ شرع میں جس قدر ممکن تھا غور کیا، پس میں نے کوئی قیاسِ صحیح ایسا نہیں پایا، جو حدیثِ صحیح کے خلاف جاتا ہو، جیسے کہ بلا شبہ معقولِ صریح، منقولِ صحیح کے خلاف نہیں ہوتا۔)(۲)

اور علامہ ابن القیم رَحِمَہُ اللہُ نے اپنی کتاب "إعلام الموقعين" میں ایک فصل مستقل اس عنوان پر قائم فرمائی ہے: " فصل في بيان أنه ليس في الشريعة شيء على خلاف القياس" (یہ فصل اس بیان میں ہے کہ شریعت میں کوئی بات خلاف عقل نہیں)

اسی فصل میں بہت طویل کلام کے بعد آخر میں فرماتے ہیں:

" فهذه نبذة يسيرة تطلعك على ما ورائها من أنه ليس في الشريعة شيء يخالف القياس ، ولا في المنقول عن الصحابة الذي لا يعلم لهم فيه مخالف ، و أن القياس الصحيح دائر مع أوامرها ، و نواهيها وجودا ، و عدما ؛

---

(۱) درء تعارض العقل و النقل :۱/۸۳

(۲) مجموع الفتاویٰ:۲۰/۵۶۷

كما أن المعقول الصحيح دائر مع أخبارها وجودا ، و عدما ، فلم يخبر الله رسوله بما يناقض صريح العقل ، و لم يشرع ما يناقض الميزان ، والعدل. "

(یہ چند چیزیں ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ نہ شریعت میں کوئی شے خلافِ عقل ہے اور نہ ہی صحابہ سے منقول متفق علیہ کسی بات میں اور یہ کہ قیاسِ صحیح اس کے اوراوامر ونواہی کے ساتھ وجوداً وعدماً دائر ہے، جس طرح معقولِ صحیح اس کے اخبار کے ساتھ وجوداً وعدماً دائر ہے؛ لہٰذا اللہ نے اپنے رسول کو ایسی بات کی خبر نہیں دی، جو عقلِ صریح کے خلاف ہو اور نہ ایسی چیز کو مشروع کیا، جو عدل وانصاف کے مناقض ہو۔)(۱)

اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رَحِمَہُ اللہُ نے " حجة الله البالغة" کے مقدمے میں فرمایا:

"بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ احکامِ شرعیہ میں مصلحتوں کی رعایت نہیں کی گئی ہے اور اعمال میں اور ان کی جو اللہ نے جزا مقرر کی ہے، اس میں کوئی مناسبت نہیں ہے اور شریعت کا مکلّف بنانا ایسا ہی ہے جیسے آقا اپنے غلام کی عبدیت وغلامی کا امتحان لینا چاہتا ہے، تو کبھی پتھر اُٹھانے یا کسی درخت کو چھونے کا حکم دیتا ہے، جس میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ امتحان ہو جائے، جب وہ اطاعت کرتا ہے یا مخالفت کرتا ہے، تو اس کے مطابق اس کو بدلہ دیا جاتا ہے؛ مگر یہ گمان وخیال فاسد ہے، جس کی حدیث وخیر القرون کا اجماع تکذیب کرتے ہیں۔"(۲)

---

(۱) إعلام الموقعين: ۲/۱۷

(۲) حجة الله البالغة: ۱/۴-۵

معلوم ہوا کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے، جس کے تمام احکام عین عقل کے موافق ہیں اور ان میں حکم و اسرار کا لحاظ بھی ہے؛ لیکن غور کیجیے کہ کس قدر فرق ہے احکامِ الٰہیہ وقواعدِ شرعیہ کے اس عقلی تجسس میں؟ جو ان احکام کو مانتے ہوئے اس لیے جاری رکھا جائے کہ اللہ کے احکام کی حکمتوں کو سمجھا جائے اور اپنے ایمان میں اضافہ کیا جائے اور اس عقلی تجسس میں جس کا منشا احکام کے ردوقبول کے لیے اس کو معیار قرار دینا ہو؛ تاکہ سمجھ میں آجائے تو مان لیا جائے؛ ورنہ ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے۔

یادرکھنا چاہیے کہ مسلمان عقلی وتجربی حکمتوں ومصالح پر ایمان نہیں لاتا؛ بل کہ وہ بلا کسی شرط کے اللہ ورسول پر ایمان لاتا ہے، خواہ کوئی حکمت سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

تقلید آبا یا اتباعِ عادات

غلو فی الدین کی ایک اہم وجہ تقلیدِ آبا یا اتباعِ عادات ہے۔ ایک جانب قرآن و سنت کا حکم ہو اور دوسری جانب آبا و اجداد کا طریقہ ہو یا لوگوں میں پھیلا ہوا رسم و رواج ہو، تو اہلِ سنت کا موقف یہ ہے کہ ہمیں قرآن وسنت کے طریقے کو ماننا اور اسی پر چلنا ہے؛ مگر گمراہوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ تقلیدِ آبا کو اور اپنے معاشرے کے رسم و رواج کو دلیل بناتے اور قرآن وسنت کو اس کا تابع بناتے ہیں، یہ حدود سے باہر نکلنا ہے، جس کو غلو کہا جاتا ہے؛ حال آں کہ اس پر قرآن نے کفار کی مذمت کی ہے۔

رسم ورواج وہاں قابلِ احترام ہوسکتا ہے، جہاں اس کے خلاف نص اور قرآن و حدیث کے واضح بیانات نہ ہوں۔ جہاں نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا اسوہ موجود ہو، قرآن کے واضح ارشادات موجود ہوں، وہاں رسم ورواج سے حجت پکڑنا باطل فرقوں کا طریقہ ہے۔

کفار ومشرکین کا طریقہ

اور یہی کفار ومشرکین کا بھی طریقہ تھا، قرآنِ پاک میں مذکور ہے :

﴿ وَ اِذَا قِیۡلَ لَھُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلۡفَیۡنَا عَلَیۡہِ اٰبَآءَ نَا اَوَلَوۡ کَانَ اٰبَآؤُھُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ شَیۡئًا وَّ لَا یَھۡتَدُوۡنَ ﴾ (البقرۃ :۱۷۰)

(اور جب ان (کفار ومشرکین) سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی جانب سے نازل کردہ دین وشریعت کی اتباع کرو، تو وہ کہتے ہیں کہ بل کہ ہم تو اس طریقے کی اتباع کریں گے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے۔ کیا اگرچہ کہ ان کے باپ دادا کسی چیز کی عقل نہ رکھتے ہو اور ہدایت یافتہ بھی نہ ہوں) (تب بھی ان کے طریقے کی اتباع کریں گے؟)

معلوم ہوا کہ یہ تقلیدِ آبا و اتباعِ عادات کی بیماری دراصل کفار ومشرکین کی بیماری ہے، جس کی وجہ سے وہ گمراہی کا شکار ہو گئے اور ہدایت الٰہی سے محروم رہے۔

قرآن نے متعدد جگہ کفار کے اس طرزِ عمل کا ذکر کیا ہے اور اس کی مذمت کی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کا بھی یہی طرزِ عمل ذکر کیا، فرمایا :

﴿ وَاتۡلُ عَلَیۡھِمۡ نَبَاَ اِبۡرٰھِیۡمَ اِذۡ قَالَ لِاَبِیۡہِ وَ قَوۡمِہٖ مَا تَعۡبُدُوۡنَ، قَالُوۡا نَعۡبُدُ اَصۡنَامًا فَنَظَلُّ لَھَا عٰکِفِیۡنَ ، قَالَ ھَلۡ یَسۡمَعُوۡنَکُمۡ اِذۡ تَدۡعُوۡنَ ، اَوۡ یَنۡفَعُوۡنَکُمۡ اَوۡ یَضُرُّوۡن ، قَالُوۡا بَلۡ وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَ نَا کَذٰلِکَ یَفۡعَلُوۡنَ ﴾ (الشعراء :۶۹-۷۴)

(آپ ان لوگوں کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ

بیان کیجیے، جب انھوں نے اپنے باپ اور قوم کے لوگوں سے کہا کہ تم کس کی عبادت کرتے ہو؟ کہا کہ ہم تو بتوں کی عبادت کرتے ہیں اوران کے سامنے جمے بیٹھے رہتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا یہ بت تمھاری بات سنتے ہیں، جب تم ان کو پکارتے ہو؟ یا تمھیں کچھ نفع پہنچا سکتے یا نقصان دے سکتے ہیں؟ کہنے لگے کہ بل کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو اسی طرح کرتے پایا ہے۔)

یعنی عقل ونقل کی کوئی دلیل ان کے پاس اپنے اس بدترین کام کی نہیں تھی، بس حوالہ کچھ تھا، تو یہ تھا کہ ہمارے بڑے ایسا ہی کرتے تھے؛ لہٰذا ہم بھی اسی طرح کرتے ہیں۔

ایک جگہ قرآن کہتا ہے کہ تمام رسولوں اور پیغمبروں کے ساتھ ان کی کفار قوموں کا یہی طرز عمل رہا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ مَآ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ إِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى أُمَّةٍ وَّإِنَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ﴾ (الزخرف: ۲۳)

(اسی طرح ہم نے آپ سے پہلے کسی بھی قریے میں کوئی رسول نہیں بھیجا؛ مگر وہاں کے خوشحال لوگوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔)

یہی وہ علت و بیماری ہے، جس کی بنیاد پر آج بے شمار لوگوں کو بدعات ورسومات کے دلدل میں پھنسا ہوا پاتے ہیں، ان کے پاس ان کی کوئی توجیہ و دلیل نہیں ہے، سوائے اس کے کہ ان کے ماں باپ، دادا، دادی، نانا، نانی کے یہاں یہ سب کام ہوا کرتے تھے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن وسنت کے مقابلے میں ان رواجی ورسمی امور کو ترجیح دینے کی بدعت کس قدر خطرناک و بدترین بات ہے؟ اور غلو کی کس قدر حیرت انگیز صورت ہے؟

ایک انتباہ

یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ تقلیدِ آبا کا جو ذکر یہاں ہوا، اس سے کسی کو دھوکہ نہ ہونا چاہیے کہ تقلیدِ ائمہ کا حکم بھی یہی ہے۔ نہیں! ہرگز نہیں! کیوں کہ وہ تقلید نصوص کے مقابلے میں اور حق سے اعراض وانکار کے لیے تھی اور تقلیدِ ائمہ نصوص کو قبول کرنے اور ان کی مراد کو پانے اور حق سے وابستہ ہونے کے لیے ہوا کرتی ہے؛ اس لیے جو لوگ ائمہ کی تقلید کرتے ہیں، وہ یہ سمجھ کر تقلید کرتے ہیں کہ ان ائمہ نے دین کو کما حقہ اور ہم سے زیادہ اچھے طور پر سمجھا ہے؛ کیوں کہ وہ دین کے فہم میں اور اخلاصِ نیت میں اور تلاشِ حق میں ہم سے بہت آگے تھے۔ مقلدین ان کو شارعِ دین نہیں سمجھتے؛ بل کہ صرف شارحِ دین سمجھتے ہیں اور ان دونوں باتوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اس کے برعکس کفار کا حال یہ تھا کہ وہ اللہ ورسول کی باتوں اور احکام کے مقابلے میں اپنے آبا کی تقلید کیا کرتے تھے، یہ حرام ہی نہیں؛ بل کہ صریح کفر ہے۔

غلو فی الدین کی قسمیں

غلو فی العقیدہ

غلو فی العمل

پانچویں فصل

غلو فی الدین کی قسمیں

اس کے بعد ایک اہم بات یہ سمجھ لینی چاہیے کہ دین میں غلو کی دو قسمیں ہیں: غلو فی العقیدہ اور غلو فی العمل۔

غلو فی العقیدہ

''عقیدے میں غلو'': یہ ہے کہ عقیدے کی جو حدیں مقرر کی گئی ہیں، ان میں غلو و تجاوز کیا جائے۔ جیسے یہود و نصاریٰ نے حضرات انبیا علیہم السلام کو خدائی کے مقام پر پہنچا دیا اور مشرکینِ عرب نے ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں قرار دے دیا اور کسی نے سورج و چاند کی، کسی نے ستاروں کی پرستش کر کے ان کو خدا بنا ڈالا۔

اسی طرح آج جو لوگ اولیاء اللہ کو حاجت روا و مشکل کشا اور عالم الغیب اور حاظر و ناظر ٹھہرا کر ان کی مزاروں کے سامنے سجدے کرتے اور ان کو طواف کرتے اور ان سے اپنی حاجتیں مانگتے، ان کی نذر و نیاز کرتے ہیں، یہ سب وہی عقیدے میں غلو کی صورتیں ہیں، جن سے قرآن و حدیث میں منع کیا گیا ہے۔

غلو فی العمل

دوسرا ''غلو فی العمل'' ہے: اور وہ یہ ہے کہ عمل میں غلو کیا جائے۔ جیسے عیسائی لوگوں نے رہبانیت اختیار کی اور اس کی بہت سی شکلیں نکالیں اور دین کے نام سے ان کو رواج دیا اور حدود سے تجاوز کرنے لگے تھے۔ اسی طرح مشرکین کا ننگے ہو کر طواف کرنا اور احرام کی حالت میں گھروں کے پچھواڑوں سے گھروں میں داخل ہونا

اسی غلو فی العمل کی مثالیں ہیں۔

اسی طرح بعض لوگ جو حلال چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں اور اس چیز کے کھانے کو برا جانتے ہیں۔ جیسے بعض لوگ گائے کا گوشت کھانے کو برا سمجھتے ہیں، یہ بھی حرام و ناجائز ہے۔ ہاں اگر کسی مصلحتِ طبعی و شرعی سے نہ کھائے، تو الگ بات ہے۔ جیسے کسی کو گائے کا گوشت کھانے سے کوئی نقصان ہوتا ہو؛ اس لیے وہ احتیاط کرے تو جائز ہے؛ لیکن اس کو برا سمجھنا جائز نہیں۔

قرآنِ کریم میں اسی کا رد کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ وَ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴾

(اے ایمان والو! تم ان پاک چیزوں کو حرام نہ ٹھیرالو، جن کو اللہ نے تمھارے لیے حلال کیا ہے اور حد سے آگے نہ بڑھو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ حد سے گزر جانے والوں کو پسند نہیں کرتے اور تم ان چیزوں میں سے کھاؤ، جو اللہ نے تم کو حلال و پاک عطا کی ہیں اور اللہ سے ڈرو، جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔) (المائدۃ: ۸۷-۸۸)

اس آیت کا شانِ نزول یہ بیان کیا گیا ہے کہ بعض صحابہ جن میں حضرت علی، حضرت مقداد، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت سالم مولی ابی حذیفہ رضی اللہ عنہم تھے، یہ حضرات گھروں میں بیٹھ گئے اور یہ خیال کیا کہ نصاریٰ کی طرح کھانے، کپڑے اور عورتوں کو حرام کرلیں اور رہبانیت اختیار کرنے کا ارادہ کرلیا؛ حتی کہ بعض نے گوشت وغیرہ چیزوں سے پرہیز شروع کر دیا، جب اس کی اطلاع حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی، تو آپ نے

فرمایا کہ جو میرے طریقے سے روگردانی کرے؛ وہ مجھ سے نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ آیت ان ہی کے بارے میں نازل ہوئی۔ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی حلال چیز کو حرام کرنا بھی غلو کی قسم ہے، جو ممنوع و ناجائز ہے۔

---

(۱) أحکام القرآن لابن العربي: ۳/۲۴۷

دین میں غلو کی مختلف صورتیں

- افراط و مبالغہ
- تفریط
- دین و شریعت میں نئی بات پیدا کرنا
- دینی احکام میں ترجیحات و ترتیبات سے غفلت و اعراض
- کتاب اللہ و رجال اللہ میں تفریق
- شریعت کے ظاہری و باطنی احکام میں تفریق
- منصوص و غیر منصوص میں فرق نہ کرنا
- وسائل و مقاصد میں تمیز نہ کرنا
- دینی امور و شعبوں کی تحدید یا ان میں تقابل
- وسائل و مقاصد میں تمیز نہ کرنا
- اصطلاحاتِ شرعیہ کے مفہوم میں تبدیلی یا کمی و زیادتی
- اختلاف کی صورت میں حدود سے تجاوز
- دین میں تشدد کا مظاہرہ
- الہام و کشف و خواب سے استدلال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چھٹی فصل

دین میں غلو کی مختلف صورتیں

پھر یہ غلو مختلف صورتوں و شکلوں سے پیدا ہوتا ہے، یہاں نہایت اختصار کے ساتھ اس کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے اور اس کی تفصیل کو کسی اور موقعے کے حوالہ کیا جاتا ہے۔

افراط و مبالغہ

افراط یا مبالغہ کیا ہے؟

افراط یا مبالغہ یہ ہے کہ دین کی مقررہ حدود سے آگے بڑھا جائے ، جیسے مثال کے طور پر اسلام نے حضراتِ انبیاو رسل کی تعظیم و توقیر کی حدیں مقرر کی ہیں اور ان کو ایک جانب اللہ کا بندہ قرار دیا اور دوسری جانب ان کو ایک عظیم منصب ''منصبِ نبوت و رسالت'' کا حامل بھی بتایا ؛ لہٰذا اگر کوئی ان حدود سے تجاوز کرتا ہے اور ان حضرات کو اس منصب و مقام سے بڑھا کر خدائی صفات و مقام کا حامل بناتا ہے، تو یہ افراط ہے ، جیسے عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور یہود نے حضرت

عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دے کر یہی حرکت کی تھی، اسی طرح اگر کوئی حضراتِ اولیاء اللہ کو ان کے مقام سے بڑھاتا اور ان کو بھی حاجت روا یا مشکل کشا اور عالم الغیب مانتا اور قرار دیتا ہے، تو وہ یہی افراط ہے جس سے شریعت نے منع کیا ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ آیت ﴿لا تغلوا في دينكم﴾ کے تحت اس غلو کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"أي لا تجاوزوا الحد في اتباع الحق ، ولا تطروا مَن أُمِرتُم بتعظيمه فتبالغوا فيه ، حتى تخرجوه من حيز النبوة إلى مقام الإلٰهية ، كما صنعتم في المسيح ، وهو نبي من الأنبياء ، فجعلتموه إلهاً من دون الله ، و ما ذاک إلا لاقتدائكم بشيوخ الضلال الذين هم سلفكم ممن ضل قديماً ."

(یعنی تم اتباعِ حق میں حد سے آگے مت بڑھو اور جن لوگوں کی تعظیم کا تمھیں حکم دیا گیا ہے، ان کی تعظیم میں غلو کر کے مبالغہ نہ کرو، یہاں تک کہ ان کو مقامِ نبوت سے نکال کر "مقام الوہیت" تک پہنچا دو، جیسے تم لوگوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں کیا تھا حال آں کہ وہ اللہ کے پیغمبروں میں سے ایک نبی تھے، پس تم نے ان کو اللہ کے علاوہ معبود بنا لیا اور یہ اس لیے ہوا کہ تم نے شیوخِ ضلال کی اقتدا کر لی، جو تم سے پہلے گمراہ ہو چکے ہیں۔)(۱)

یہ ظاہر ہے کہ اس افراط سے کس قدر بڑی گمراہی پیدا ہوئی اور ہوتی ہے کہ مخلوق

---

(۱) تفسیر ابن کثیر:۱۵۹/۳

کوخدا جیسا سمجھ لیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جاتا ہے، جو اللہ کے ساتھ ہونا چاہیے۔

تعریف میں افراط و مبالغے کی ممانعت

اسی لیے خود ہمارے آقا حضرت نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے باوجود یہ کہ آپ اللہ کے سب سے زیادہ مقرب و محبوب ہیں، اپنے بارے میں غلو کرنے اور تعریف میں مبالغے سے کام لینے سے منع فرمادیا۔

چناں چہ حدیث میں ہے کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

" لَا تُطْرُوْنِي كَمَا أَطْرَتِ النَّصٰارٰى ابْنَ مَرْيَمَ ، إِنَّمَا أَنَا عَبْدٌ فَقُوْلُوْا: عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلِه."

(میری تعریف میں مبالغہ نہ کرو! جیسا کہ نصاری نے حضرت عیسی بن مریم عَلَیْہِ السَّلَام کے بارے میں کیا، پس میں تو اللہ کا بندہ ہوں؛ لہٰذا مجھے اللہ کا بندہ ورسول کہو۔)(۱)

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت انس رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ نے فرمایا کہ کچھ لوگوں نے کہا: اے اللہ کے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم! ہم میں سے سب سے بہتر اور سب سے بہتر کے بیٹے اور ہمارے سردار اور سردار کے بیٹے! یہ سن کر نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

"يا أَيُّهَا النَّاسُ ! قُوْلُوْا بِقَوْلِكُمْ ، وَ لَايَسْتَهْوِيَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ ، أَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ ، وَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ، وَاللّٰهِ مَا أُحِبُّ أَنْ تَرْفَعُوْنِي فَوْقَ مَا رَفَعَنِي اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ -- وفي

---

(۱) الصحيح للبخاري:۳۴۴۵،صحيح ابن حبان:۶۲۳۹،الشمائل للترمذي:۳۲۲

روایة -- إِنِّي لا أُرِيْدُ أَنْ تَرْفَعُوْنِي فَوْقَ مَنْزِلَتِي الَّتِي أَنْزَلَنِيْهَا اللّٰهُ تَعَالٰى ، أَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ ، عَبْدُهٗ ، وَ رَسُوْلُه."

(اے لوگو! تم نے جتنا کہا، بس اتنا ہی کہو، کہیں شیطان تم پر غالب نہ آجائے، میں تو عبداللہ کا بیٹا محمد ہوں، اللہ کا رسول ہوں، میں پسند نہیں کرتا کہ تم مجھ کو میرے اس درجے اور مقام سے بلند کرو، جتنا کہ اللہ نے مجھے بلند کیا ہے--ایک روایت میں اس طرح آیا ہے-- آپ نے فرمایا کہ میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے اس مقام سے بڑھا دو، جس مقام میں کہ اللہ نے مجھے رکھا ہے، میں تو عبداللہ کا بیٹا محمد اور اللہ کا بندہ ورسول ہوں۔)(۱)

معلوم ہوا کہ نبی کو بھی اس کے مقام سے بڑھانا جائز نہیں اور خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس سے منع کردیا ہے۔

مقامِ نبوت میں افراط

مگر اس کے باوجود امت کے ایک طبقے نے بالکل اسی روش کے مطابق جو یہود ونصاری نے اپنائی تھی، حضرت سید الانبیا وسرورِ کائنات محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں انتہائی غلو وحدود سے تجاوز سے کام لیا ہے اور آپ کو مقامِ نبوت سے اٹھا کر خدائی کے مقام پر فائز کردیا ہے۔

چناں چہ یہ طبقہ آپ کی بشریت کا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ کو بشر ماننا، آپ کی شان کے خلاف اور توہین ہے؛ لہٰذا آپ بشر نہیں اور جب بشریت سے آپ

---

(۱) مسند أحمد:۱۳۵۵۳،السنن الكبرىٰ للنسائي: ۶/۷۱،مسند عبد بن حميد:۱/۳۹۷

کو نکال دیا، تو ظاہر ہے کہ آپ کے لیے کوئی بات طے بھی کرنی تھی کہ آخر آپ کون ہیں؟ تو اس دریا کو بھی تدریجاً اس طرح عبور کر دیا گیا۔

ان میں سے بعض کا شعر ہے:

محمد سرِ قدرت ہے، کوئی رمز اس کی کیا جانے
شریعت میں تو بندہ، حقیقت میں خدا جانے

اس کا مطلب صاف یہ ہوا کہ یہ شاعر حضرت نبی عربی محمدِ مدنی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو حقیقت کے لحاظ سے بندہ نہیں مانتا اور یہ ظاہر ہے کہ جب بندہ نہیں، تو خدا ہونا چاہیے۔

ان ہی لوگوں میں سے ایک کا شعر ہے:

ممکن میں قدرت کہاں، واجب میں عبدیت کہاں
حیران ہوں، یہ بھی ہے خطا، یہ بھی نہیں، وہ بھی نہیں

اس میں حضور سید الانبیا صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بارے میں شاعر، ''ممکن'' ہونے کا انکار دبے دبے لفظوں میں کر رہا ہے اور آپ کو ''ممکن'' ماننا ایک خطا قرار دیتا ہے، پھر آگے تو مسئلہ صاف ہو گیا کہ نہیں نہیں! آپ تو واقعی اور درحقیقت خدا ہی تھے، چناں چہ لیجیے ''دیوانِ محمدی'' کا مؤلف کہتا ہے:

محمد مصطفٰی محشر میں '' طٰہٰ'' بن کے نکلیں گے
اٹھا کر میم کا پردہ ہویدا ہو کے نکلیں گے
حقیقت جن کی مشکل تھی، تماشا بن کے نکلیں گے
جسے کہتے ہیں بندہ ﴿قل ھو اللہ﴾ بن کے نکلیں گے
بجاتے تھے جو '' إِنِّیْ عبدُہ '' کی بنسری ہر دم
خدا کے عرش پر ﴿إِنِّي أَنَا اللّٰه﴾ کہہ کے نکلیں گے

اس میں حضرت فخرِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو بعینہٖ خدا مانا گیا ہے اور یہ بتایا گیا

ہے کہ جو اپنی پوری زندگی میں " إني عبده " کہتے رہے، وہ دراصل خدا ہی ہیں؛ اس لیے محشر میں عرش پر وہی ﴿إنّي أنَا اللّٰه﴾ کہہ کر ظاہر ہو جائیں گے۔

اور جب آپ کو خدائی کے مقام پر فائز کر دیا، تو ظاہر ہے کہ پھر آپ کے لیے خدائی کے تمام اختیارات اور وہ ساری صفات و کمالات بھی ثابت کرنا ضروری ہو گیا؛ لہٰذا آپ کو عالم الغیب و مشکل کشا و حاجت روا، رزق کا کفیل، ساری طاقتوں کا مالک سبھی کچھ کہا جانے لگا۔

مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی نے "حدائق بخشش" میں کہا ہے:

میں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیب
یعنی محبوب و محبّ میں نہیں میرا تیرا

اس کی شرح میں مولانا فیض احمد اویسی لکھتے ہیں:

"یعنی اے رب العالمین کے پیارے! میں تو آپ کو دونوں جہاں کا مالک و حاکم ہی مانتا ہوں؛ اس لیے کہ مالکِ حقیقی و ذاتی خداوندِ قدوس جل شانہ کے آپ پیارے اور چہیتے محبوب ہیں اور محبّ و محبوب کے درمیان بیگانگی اور غیریت نہیں ہوا کرتی؛ بل کہ محبّ اور دوست اپنی ساری چیزوں میں اپنے محبوب اور پیارے کو اجازت و اختیار دے دیا کرتا ہے، جو پیار و محبت کا پورا پورا تقاضا ہے، یوں ہی محبّ محبوب سے کوئی شَے چھپاتا نہیں؛ بل کہ ہر شَے کا اختیار دیتا ہے۔" (۱)

اور اسی قسم کے نظریات کی ایک کتاب "بہارِ شریعت" کے مصنف نے صاف لکھا ہے:

"حضورِ اقدس صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم اللہ تعالیٰ کے نائبِ مطلق ہیں،

---

(۱) شرح حدائق بخشش: ۱/۴۰

تمام جہاں حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے تحت تصرف کردیا گیا، جو چاہیں کریں، جسے چاہیں دیں، جس سے جو چاہیں واپس لیں، تمام جہاں میں ان کے حکم کا پھیرنے والا کوئی نہیں، .....آگے لکھتے ہیں:.....

"ملکوت السمٰوات والأرض" حضور کے زیرِ فرمان، جنت و نار کی کنجیاں دستِ اقدس میں دے دی گئی ہیں، رزق و خیر اور ہر قسم کی عطائیں حضور ہی کے دربار سے تقسیم ہوتی ہیں، دنیا و آخرت حضور کی عطا کا ایک حصہ ہے، احکامِ تشریعیہ حضور کے قبضے میں کردیے گئے کہ جس پر جو چاہیں، حرام فرمادیں اور جس کے لیے جو چاہیں حلال کردیں اور جو فرض چاہیں، معاف فرمادیں۔"(۱)

کیا انتہا ہے غلو کی! اب خدا کی کوئی ضرورت ہی نہ رہی اور سب کچھ آپ ہی سے ہوگا، حتی کہ احکامِ شرع میں بھی کلی تصرف کا اختیار آپ کو دے دیا گیا ہے، جس چیز کو چاہیں حلال کردیں اور جس کو چاہیں حرام فرمادیں۔ اس عقیدے کا موازنہ کیجیے ان آیات سے اور ان احادیثِ مبارکہ سے جن میں خدائی و بندگی کے مقامات و درجات اور اختیارات، صفات میں امتیاز کی تعلیم دی گئی ہے اور غلو سے منع کیا گیا ہے اور تعریف میں بھی مبالغے سے پرہیز کا حکم دیا گیا ہے، پھر فیصلہ کیجیے کہ کیا یہ حق و سچ ہے، جو ان لوگوں نے لکھا اور بیان کیا ہے؟ اگر حق کی تلاش و انصاف کا جذبہ ہو، تو دو اور دو چار کی طرح یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ سب وہی غلو ہے، جو شریعت میں ممنوع و حرام ہے۔

حضرت علی رَضِیَ اللہُ عَنْہُ کے بارے میں ایک فرقے کا غلو

اسی غلو نے حضرت علی رَضِیَ اللہُ عَنْہُ کے بارے میں ایک گروہ کو اس پر ابھارا کہ وہ

(۱) بہارِ شریعت: ۱/۱۶

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو (نعوذ باللہ) خدا قرار دیں یا یہ کہ خدا کے ان میں حلول کا عقیدہ رکھیں اور یہ فرقہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں وجود میں آ گیا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو آگ میں جلا دیا تھا، جس کا ذکر متعدد کتب تاریخ میں موجود ہے۔

چناں چہ علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ نے "فتح الباري" میں امام ابو طاہر المخلص کی مجالس کے حوالے سے لکھا ہے کہ شریک العامری نے بیان کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ یہاں مسجد کے دروازے پر کچھ لوگ ہیں، جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ ان کے رب و خدا ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو بلایا اور پوچھا کہ تمھارا برا ہو! تم کیا کہتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ آپ ہمارے رب و خالق و رازق ہیں، آپ نے فرمایا کہ تمھارا بُرا ہو! میں تو تم جیسا ایک بندہ ہوں، تم جیسا کھاتے ہو میں بھی کھاتا ہوں اور تم جیسا پیتے ہو میں بھی پیتا ہوں، اگر میں اللہ کی فرماں برداری کروں؛ تو وہ چاہے تو مجھے ثواب دے گا اور اگر نافرمانی کروں؛ تو مجھے خوف ہے کہ وہ مجھے عذاب میں گرفتار کر دے، پس تم اللہ سے ڈرو اور واپس ہو جاؤ؛ مگر ان لوگوں نے اس سے انکار کیا اور جب دوسرا دن ہوا، تو صبح صبح پھر آ گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے غلام "قنبر" نے کہا کہ وہ لوگ وہی بات کہتے ہوئے آئے ہیں، آپ رضی اللہ عنہ نے پھر ان کو اپنے پاس بلایا اور وہی باتیں کیں جو کل فرمائی تھیں، پھر تیسرا دن ہوا تو آپ رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ اگر تم نے وہی بات کہی، تو میں تم کو بری طرح قتل کر دوں گا؛ مگر اس کے باوجود انھوں نے وہی بات کہی، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے "قنبر" سے فرمایا کہ کچھ مزدوروں کو پھاؤڑوں کے ساتھ بلاؤ، پس ان کو مسجد اور قصرِ شاہی کے درمیان خندقیں کھودنے کا حکم دیا، پھر لکڑیاں منگوائیں اور خندقوں میں ان کو آگ لگا کر ڈلوایا اور ان لوگوں سے کہا کہ میں تم کو اس میں ڈال دوں گا یا نہیں تو تم لوگ باز آ جاؤ! انھوں نے باز آنے سے انکار کیا، پس آپ رضی اللہ عنہ نے ان کو ان خندقوں میں

پھینک دیا یہاں تک کہ وہ جل گئے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اس کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ اس کی سند حسن درجے کی ہے۔(۱)

حضراتِ اولیاء اللہ کے بارے میں افراط

اسی طرح آج مزاراتِ اولیاء اللہ پر جا کر دیکھو کہ اسی غلو و افراط نے لوگوں کو حضراتِ اولیاء اللہ کی محبت وعقیدت کے نام پر کس قدر گمراہی میں مبتلا کر رکھا ہے؟! وہاں طواف وسجدے بھی کیے جاتے ہیں، مراقبے واعتکاف بھی کیے جاتے ہیں، منتیں ونذریں بھی مانی جاتی ہیں، جانور بھی ان پر قربان کیے جاتے ہیں، فاتحہ وعرس کے میلے لگائے جاتے ہیں، پھر دیکھیے تو کوئی وہاں کے ستونوں سے چمٹا ہوا عرض معروض کر رہا ہے، کوئی سسکیاں بھر رہا ہے، کوئی جوشِ عقیدت میں چیخ رہا ہے، کوئی اپنی مصیبتوں کی داستان سنا کر التجائیں کر رہا ہے، کوئی ادب و ہیبت کے لحاظ سے دم بہ خود ہے؛ یہ سب اس لیے کہ اولیاء اللہ کو مشکل کشا و حاجت روا خیال کر لیا گیا ہے اور عالم الغیب والشہادۃ ہونے کا تصور قائم کر لیا گیا ہے، گویا وہ عبد نہیں؛ بل کہ خود خدائی مقام کے حامل ہو گئے ہیں۔

مقامِ غور ہے کہ جب نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اپنے بارے میں یہ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے مقام سے نہ بڑھاؤ اور میری تعریف میں حدود سے تجاوز نہ کرو، تو کسی ولی، بزرگ، شیخ، استاذ، پیر وغیرہ کو حد سے بڑھانا اور خدائی مقام پر بٹھا دینا، ان کو حاجت روا و مشکل کشا سمجھنا اور ان سے اپنی حاجتیں مانگنا، ان کے لیے نذرانے چڑھانا، ان کی مزاروں پر سجدے کرنا اور ان کی تعریف میں حدود کی رعایت نہ رکھنا، یہ سب کس طرح درست ہو سکتا ہے؟

---

(۱) فتح الباري:۱۲/۲۷۰

کس قدر افسوس ہے کہ آج امتِ مسلمہ کا ایک طبقہ ان تمام شرکیہ اعمال و افعال میں مبتلا ہے اور اس سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ اسی کو صحیح اسلام بھی سمجھتا اور قرار دیتا ہے اور صحیح اسلام، جس میں یہ مبالغہ اور حد سے تجاوز کو منع کیا گیا ہے، اس کو غلط قرار دینے کی جاہلانہ جسارت کرتا ہے۔

اسی صورت حال کی عکاسی کرتے ہوئے علامہ حالی رَحِمَهُ اللهُ نے اپنے اشعار میں کہا تھا :

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر
جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
کہے آگ کو اپنا قبلہ تو کافر
کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر

مگر مؤمنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں
اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں
شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں

نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

وہ دین جس سے توحید پھیلی جہاں میں
ہوا جلوہ گر حق زمین و زماں میں
رہا شرک باقی نہ وہم و گماں میں

وہ بدلا گیا آ کے ہندوستاں میں
ہمیشہ سے اسلام تھا، جس پہ نازاں
وہ دولت بھی کھو بیٹھے آخر مسلماں

الغرض اہل اللہ و اولیاء اللہ کے سلسلے میں امت نے اسی غلو کو جاری کرلیا، جس سے بالتخصیص ہمیں منع کیا گیا تھا اور یہ سب افراط کا نتیجہ ہے۔

نوٹ: اس سلسلے میں ہماری کتاب ''التوحید الخالص'' اور دوسری کتاب ''امت میں اعتقادی و عملی بگاڑ اور علمائے امت کی ذمے داری'' کا مطالعہ بھی ان شاء اللہ العزیز چشم کشا و حقیقت نما ثابت ہوگا۔

تقلیدِ ائمہ میں جمود کا غلو

اسی غلو کی اس شکل میں حضراتِ ائمہ کرام کی تقلید میں غلو و حد سے تجاوز بھی داخل ہے، یہ بات مسلم ہے کہ حضراتِ ائمہ کی تقلید ایک شرعی ضرورت ہے، جس کے بغیر عوام الناس و عوامِ علما کو کوئی چارۂ کار نہیں اور اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اس پر دلائل کے انبار حضراتِ علما نے لگا دیے ہیں؛ لہٰذا یہ تو معلوم و مسلم ہے کہ ائمہ کرام کی تقلید کرنا لازم ہے؛ لیکن شریعت نے اس کی بھی ایک حد مقرر کردی ہے، اس سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے، وہ حد یہ ہے کہ حضراتِ ائمہ کرام کو ''شارعِ دین'' نہیں؛ بل کہ محض ''شارحِ دین'' سمجھنا چاہیے۔ اگر ایک شخص اپنے امام کو یہ سمجھتا ہے کہ وہ دین کی سمجھ خوب رکھتے تھے اور اللہ نے ان کو تفقہ و بصیرت سے خوب حصہ دیا تھا اور انھوں نے اس فقاہت و بصیرت سے کام لیتے ہوئے اللہ کی شریعت کو خوب سمجھا اور بلا کم و کاست، جوں کا توں لوگوں کو بتایا ہے؛ لہٰذا میں اللہ کی شریعت پر عمل کرنے کے لیے ان کی باتوں کو مانتا ہوں، تو یہ بالکل صحیح و جائز ہے؛ لیکن اگر اس حد

میں غلو کیا اور امام کو خود ایسا سمجھا کہ وہ جو چاہے حکم دے سکتے ہیں، وہ جو حکم دیں اور بتائیں وہی دین ہے، تو یہ تقلید حرام و ناجائز تقلید ہے، اسی طرح تقلید میں ایسا جمود کہ بلا سوچے سمجھے احادیث کے مقابلے میں ائمہ کی تقلید کو پیش کریں اور اس کے مقابلے میں احادیث کو رد کر دیں، یہ غلو بھی مذموم و ناجائز ہے۔

دیکھیے! حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَہُ اللہُ فرماتے ہیں:

"بعض اہلِ تعصب کو ائمہ کی تقلید میں ایسا جمود ہوتا ہے کہ وہ امام کے قول کے سامنے احادیثِ صحیحہ غیر معارضہ کو بے دھڑک رد کر دیتے ہیں، میرا تو اس سے رونگٹا کھڑا ہو جاتا ہے۔ چناں چہ ایک ایسے ہی شخص کا قول ہے: " قال قال "بسیار است، مرا "قال أبو حنيفة" درکار است" ،اس جملہ میں احادیثِ نبویہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ کیسی بے اعتنائی اور گستاخی ہے، خدا تعالیٰ ایسے جمود سے بچائے۔ ان لوگوں کے طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللہُ ہی کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں، اب اس تقلید کو کوئی "شرک فی النبوت" کہہ دے تو اس کی کیا خطا ہے؟ مگر یہ بھی غلطی ہے کہ ایسے دو چار جاہلوں کی حالت دیکھ کر سارے مقلدین کو "شرک فی النبوت" سے مطعون و متہم کیا جائے۔" (۱)

ایک اور موقعے پر آپ لکھتے ہیں:

"جس مسئلے میں کسی وسیع النظر عالم، ذکی الفہم، منصف مزاج کو اپنی تحقیق سے یا کسی عامہ کو ایسے عالم سے، بہ شرطیکہ متقی ہو، بہ شہادتِ قلب معلوم ہو جائے کہ اس مسئلے میں راجح دوسری جانب ہے، تو دیکھنا چاہیے کہ اس مرجوح جانب میں بھی دلیلِ شرعی سے عمل کی گنجائش ہے یا

(۱) اشرف الجواب: ۲/۱۲۷

نہیں؟ اگر گنجائش ہو تو ایسے موقعے پر جہاں احتمال فتنہ وتشویشِ عوام کا ہو، مسلمانوں کو تفریقِ کلمے سے بچانے کے لیے اولیٰ یہی ہے کہ اس مرجوح جانب پر عمل کرے اور اگر اس جانبِ مرجوح میں عمل کی گنجائش نہ ہو؛ بل کہ ترکِ واجب یا ارتکابِ امرِ ناجائز لازم آتا ہے اور بہ جز قیاس کے اس پر کوئی دلیل نہیں پائی جاتی اور جانبِ راجح میں صحیح صریح دلیل موجود ہے، اس وقت بلا تردد حدیث پر عمل کرنا واجب ہوگا اور اس مسئلے میں تقلید جائز نہ ہوگی؛ کیوں کہ اصلِ دین قرآن و حدیث ہے اور تقلید سے یہی مقصود ہے کہ قرآن وحدیث پر سہولت وسلامتی سے عمل ہو، جب دونوں (یعنی تقلیدِ امام اور قرآن وحدیث) میں موافقت نہ رہی، قرآن وحدیث پر عمل ہوگا، ایسی حالت میں بھی اسی (تقلید) پر جمارہنا یہی تقلید ہے؛ جس کی مذمت قرآن وحدیث و اقوالِ علما میں آئی ہے۔'' (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرات ائمہ کی تقلید تو کرنا چاہیے؛ مگر اس میں بھی غلو و حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے، جیسے امام ہی کو شارع کی طرح سمجھنا، یا اس کے قول کے مقابلے میں احادیثِ صحیحہ کو بھی رد کردینا، یا بے جا تاویل کرنا وغیرہ، یہ سب کیا ہے؟ اسی غلو فی الدین کا نتیجہ ہے، جس نے پچھلی امتوں کو ہلاکت وتباہی کے غار میں ڈھکیلا تھا۔

---

(۱) الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد: ۸۳-۸۵

تفریط

تفریط کی حقیقت

تفریط کا مطلب یہ ہے کہ اللہ و رسول نے جو حدود مقرر کی ہیں، ان میں کمی کی جائے اور چیزوں و شخصوں کے مقررہ درجے سے ان کو گھٹا دیا جائے، یہ بھی غلو کی ایک شکل ہے، جو کہ حرام ہے، اگرچہ عام طور پر اس کو غلو کے بہ جائے "تقصیر" سے تعبیر کیا جاتا ہے؛ لیکن چوں کہ غلو دراصل حد سے نکلنے کا نام ہے اور وہ نکلنا کبھی تو ہوتا ہے، حد سے بڑھنے سے اور کبھی اس طرح کہ حد میں کمی کر دی جائے۔ جیسے کسی حلال کو حرام کر لینا بھی غلو ہے اور کسی حرام کو حلال کر لینا بھی غلو ہے، ایک صورت میں غلو زیادتی سے ہو رہا ہے اور ایک صورت میں کمی سے؛ اس لیے بعض حضراتِ علما نے اس کو بھی غلو قرار دیا ہے؛ اس لیے ہم نے بھی اس کو یہاں ذکر کیا ہے۔

چناں چہ علامہ قرطبی رَحِمَهُ اللهُ نے "آیتِ غلو" کی تفسیر میں لکھا ہے :

"و يعني بذلك فيما ذكره المفسرون غلو اليهود في عيسى -- عَلَيْهِ السَّلَامُ -- حتى قذفوا مريم --عليها السلام-- و غلو النصارى فيه حتى جعلوه رباً ، فالإفراط ، والتقصير كله سيئة ، و كفر."

(مفسرین کے بیان کے مطابق اس آیت سے مراد یہود کا حضرت عیسیٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ کے بارے میں غلو کرنا ہے، یہاں تک کہ انھوں نے حضرت مریم علیہا السلام پر تہمت لگا دی اور مراد عیسائیوں کا حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں غلو ہے، یہاں تک کہ انھوں نے ان کو خدا بنالیا، پس افراط و تقصیر دونوں گناہ و کفر ہیں۔)(۱)

اس میں علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے جس طرح عیسائیوں کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حد سے تجاوز کرنے اور ان کو مقامِ نبوت سے اٹھا کر مقامِ الوہیت پر پہنچا دینے کو غلو کہا ہے، اسی طرح یہودیوں کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کمی کرنے اور ان کو (نعوذ باللہ) حرامی قرار دینے اور حضرت مریم علیہا السلام پر بہتان لگانے کو بھی غلو قرار دیا ہے؛ حال آں کہ پہلی صورت میں حد سے زیادتی ہے، تو دوسری صورت میں حد سے کمی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس کی تائید امام ابن فارس لغوی رحمہ اللہ کی تحقیق سے بھی ہوتی ہے، آپ نے ''معجم مقاییس اللغة'' میں لکھا ہے کہ ''فرط'' کے اصل معنے کسی چیز کو اس کے جگہ سے ہٹا دینے کے ہیں، پھر یہ لفظ کبھی ''افراط'' (باب افعال سے) سے بولا جاتا ہے ''تجاوز عن الحد'' کے لیے، لوگ کہتے ہیں: '' أفرط'' (حد سے آگے بڑھ گیا) اور کہتے ہیں: ''إیاک و الفرط'' (حد سے تجاوز نہ کرو) ابن فارس رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہی اس ''مادے'' میں قیاس ہے؛ کیوں کہ جب وہ حد سے آگے بڑھا، تو اس نے وہ چیز اس کے مقام سے ہٹادی، اسی طرح ''تفریط'' جو تقصیر کے معنی میں ہے، کہ جب کسی چیز میں کمی و تقصیر کرتا ہے، تو اس کے رتبے و مقام سے اس کو گرا دیتا ہے، جو اس کے لیے مقرر تھا۔

امام ابن فارس رحمہ اللہ کی عبارت کا خلاصہ درج کیا گیا، ان کی اصل عبارت اہلِ علم کے لیے نقل کرتا ہوں اور وہ یہ ہے:

'' فرط : الفاء ، والراء ، والطاء أصل صحیح یدل علی

---

(۱) التفسیر للقرطبي:۶/۲۱

إزالة شيء من مكانه ، و تنحيته عنه . يقال : فرطت عنه ما كرهه ، أي نحيته . هذا هو الأصل . ثم يقال: أفرط ، إذا تجاوز الحد في الأمر ، يقولون : إياک والفرطَ، أي لا تجاوز الحد . وهذا هو القياس ؛ لأنه إذا جاوز القدر فقد أزال الشيء عن جهته . وكذلک التفريط، و هو التقصير ؛ لأنه إذا قصر فيه فقد قعد به عن رتبته اللتي هي له ."(۱)

معلوم ہوا کہ حد میں کمی کرنا بھی افراط اور غلو کی ایک صورت ہے، جیسے اسلام نے حضراتِ انبیا واولیا کا ایک مقام بتایا ہے؛ حضراتِ انبیا کو مقامِ نبوت دیا تو اولیا کو مقامِ ولایت عطا فرمایا ہے؛ لٰہذا اس مقام سے ان کو گھٹانا، ان کی تعظیم وتوقیر نہ کرنا یا ان سے عداوت رکھنا، ان کی مخالفت کرنا، یہ سب تفریطِ ممنوع میں داخل ہے۔

جیسے یہود نے حضرت عیسیٰ عَلَيْهِ السَّلَام کو نبی نہ مان کر ان کو (نعوذ باللہ) جھوٹا و مکار قرار دیا اور اسی طرح ان کو "حرامی" کہہ کر ان کی توہین کی اور اسی طرح بہت سے انبیا کو قتل کیا، ان کو جھوٹا ٹھیرایا اور ان کی ہجو کی، یہ ان کے مقام میں تفریط و کمی کرنا ہے جو کہ حرام ہے۔

ایک اہم افادہ

یہ دو امور: "افراط وتفریط"۔ اکثر و بیشتر بدعات کی اصل واساس ہیں، علامہ محمد بن ابراہیم الوزیر رَحِمَهُ اللّٰهُ اپنی کتاب "إيثار الحق علی خلق" میں لکھتے ہیں:

" فاعلم أن منشأ معظم البدع يرجع إلى أمرين واضح

(۱) معجم مقاييس اللغة :۴/۴۹۰

بطلانهما ، فتأمل ذلک بإنصاف ، و شد علیه یدیک ، و هذان الأمران الباطلان : هما الزیادة في الدین بإثبات ما لم یذکره اللّٰه تعالی ، و رسله علیهم السلام من مهمات الدین الواجبة ، و النقص منه بنفي بعض ما ذکره اللّٰه تعالی ، و رسله من ذلک بالتأویل الباطل''

(جان لو کہ اکثر بیشتر بدعات کا منشا دو امور کی طرف لوٹتا ہے، جن کا بطلان واضح ہے، پس بہ نظرِ انصاف اس میں غور کرو اور اس کو مضبوط تھام لو اور وہ باطل امور یہ ہیں: ایک دین میں ان باتوں کو ثابت کر کے جنھیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں نے دین کے مہمات واجبہ میں سے ذکر نہیں کیا، دین میں اضافہ و زیادتی کرنا اور دوسرے: دین میں سے بعض ان باتوں کی باطل تاویل کے ذریعے نفی کر کے جنھیں اللہ و رسولوں نے ذکر کیا ہے، دین میں کمی کرنا۔)(۱)

حضراتِ انبیا کی تنقیص

اب آیئے! ذرا جائزہ لیں کہ امت میں غلو کی اس صورت نے کیا کیا گل کھلائے ہیں؟ تفریط و تقصیر کے غلو نے امت میں ایسے نظریات بھی پیدا کر دیے کہ انھوں نے حضراتِ انبیا جیسی عظیم ہستیوں کو بھی نہ چھوڑا اور ان کے درپئے تنقیص ہو گئے۔

(۱) منکرینِ حدیث نے ان مقدس ذوات کو اپنے جیسا انسان و بشر سمجھ کر ان کے روحانی کمالات سے منکر ہو گئے اور ان کو ان کے خصوصی مقامات سے بھی گرا دیا، حتی کہ ان کو مقامِ عصمت سے گرا کر ایک عام انسان جیسا قرار دے دیا۔

---

(۱) إیثار الحق:۸۵

چناں چہ منکرِ حدیث مولوی احمد الدین امرتسری نے لکھا ہے:

”اگر رسولِ خدا میں فطرت الناس سے کوئی جدا فطرت تھی یا حضور میں کوئی خاص قوت یا سمجھ یا باریک بینی ایسی تھی، جو قیامت تک دوسرے بشروں کو نہیں مل سکتی، تو حضور کا یہ فرمانا کہ میں تمھارے جیسا بشر ہوں، اگر میں نے قرآنِ مجید کو خود بنالیا ہے، تو تم بھی اس کی مثل بنا سکتے ہو، بالکل غلط ہو جاتا ہے۔“(۱)

نیز لکھا ہے:

”پس سورج کی طرح روشن ہے کہ رسولِ خدا کی وہی فطرت تھی، جس پر خدا تعالیٰ نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا ہے اور آپ کی وہی عقل تھی جو دوسرے بشروں کو مل سکتی تھی۔“(۲)

منکرینِ حدیث نے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے حق میں قرآن میں وارد لفظِ ”بشر“ سے یہ سمجھ لیا کہ آپ عام بشر کی طرح ہیں اور کسی مزید خصوصیت و کمال سے عاری ہیں؛ اس لیے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم میں اور دیگر انسانوں میں ان کے نزدیک کوئی فرق ہی نہیں، یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی رسالت کے منکروں نے آپ کی بشریت سے استدلال کرتے ہوئے سرے سے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو نبی و رسول ہی ماننے سے انکار کر دیا۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے متعدد جگہ کفار کا یہ طریقِ استدلال بیان کیا ہے، ایک جگہ حضرت نوح عَلَیْہِ السَّلَام کی قوم کا قول نقل فرمایا:

﴿فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ إِلَّا بَشَرٌ

(۱) برہان القرآن: ۱۴۵

(۲) برہان القرآن: ۱۴۶

مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ أَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَ لَوْشَآءَ اللّٰهُ لَأَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْأَوَّلِيْنَ﴾ (المؤمنون: ۲۴)

(پس ان کی قوم کے سرداروں نے کہا کہ یہ (حضرت نوح علیہ السلام) تو بس تم جیسا ایک بشر ہے، جو تم پر تفوق چاہتا ہے اور اگر اللہ چاہتا؛ تو فرشتوں کو نازل کر دیتا، ہم نے تو یہ بات اپنے اگلے باپ دادوں میں نہیں سنی۔)

اسی سے ذرا آگے یہ آیات ہیں:

﴿وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَ اَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مَا هٰذَآ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَ يَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ وَ لَئِنْ أَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذًا لَّخٰسِرُوْنَ﴾

(المؤمنون: ۳۳-۳۴)

(اوران کےقوم کے سردار جنھوں نے کفر کیا اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا اور جنھیں ہم نے دنیا کی زندگی کا عیش دیا تھا، وہ کہنے لگے کہ یہ تو محض تم جیسا ایک بشر ہے، ان ہی چیزوں میں سے کھاتا ہے، جس سے تم کھاتے ہو اور ان ہی چیزوں میں سے پیتا ہے، جس سے تم پیتے ہو اور اگر تم نے ایک اپنے جیسے بشر کی اطاعت کر لی ؛تو تم بلا شبہ اس وقت گھاٹے والے ہو۔)

ایک جگہ مطلق پیغمبروں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی قوموں کا جواب یوں نقل کیا ہے:

﴿قَالُوْٓا إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيْدُوْنَ أَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَأْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ﴾ (ابراهيم: ۱۰)

(انھوں نے کہا کہ تم تو ہم جیسے ہی بشر ہو! تم چاہتے ہو کہ ہمیں ان چیزوں کی عبادت سے روک دو، جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے؛ لہٰذا کوئی کھلی ہوئی سند لاؤ۔)

ایک جگہ ہمارے رسول حضرت محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بارے میں کفارِ مکہ کا قول اس طرح نقل کیا ہے:

﴿وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْأَسْوَاقِ لَوْلَآ أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا﴾

(اور انھوں نے کہا کہ یہ کیسا رسول ہے؟ جو کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا ہے، اس رسول کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا کہ وہ اس کے ساتھ لوگوں کو ڈرانے والا ہوتا؟) (الفرقان: ۷)

ان ساری آیات میں اور ان کے علاوہ دیگر آیات میں رسولوں کی رسالت و نبیوں کی نبوت کو جھٹلانے والوں کا طرزِ استدلال ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کے پیغمبروں کو بشر و انسان کہہ کر ان کی رسالت و نبوت کا انکار کرتے تھے یا حضراتِ انبیا کی خصوصیات و کمالات کی نفی پر اس سے استدلال کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ اس سے بڑی کیا گمراہی ہو سکتی ہے؟ گویا ان کے نزدیک رسولوں و نبیوں کا بشر ہونا، رسالت و نبوت کے منافی تھا؛ حال آں کہ اللہ نے جتنے پیغمبر بھیجے، وہ سب بشر ہی تھے، جیسا کہ قرآن میں جگہ جگہ اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

حضراتِ انبیا بشر ہیں - ایک اہم نکتہ

یہاں یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ حضراتِ انبیا کو قرآن نے خود "بشر" کہا اور نبیوں کی زبان سے بھی کہلوایا ہے اور یہ بات ماننا عین ایمان ہے؛ کیوں کہ اللہ و رسول کی بات

ہے اور اسی بشریت کو کفار نے بھی پیش کیا اور اس سے ان کی رسالت و نبوت کی نفی پر دلیل پکڑنے لگے اور یہ عین کفر ہے؛ لہٰذا ''نبی'' کو ''بشر'' کہنے والے دو طرح کے ہیں:

(۱) ایک وہ جو بہ طور بیانِ حقیقتِ واقعیہ ''بشر'' کہتے ہیں، اس میں توہین نہیں؛ بل کہ بیانِ شرافت ہے کہ انبیا انسان و بشر اور اشرف المخلوقات ہیں، فرشتہ یا جن وغیرہ مخلوق نہیں ہیں؛ لہٰذا اس لحاظ سے انبیا کو بشر کہنے سے توہین سمجھنا جہالت بھی ہے اور قرآن و حدیث سے واضح انحراف بھی ہے۔

(۲) دوسرے وہ جو بہ راہِ توہین و تحقیر حضراتِ انبیا کو بشر کہتے ہیں کہ ان میں کوئی کمال نہیں، وہ ہم جیسے ہی ہیں؛ لہٰذا وہ قابلِ اتباع و لائقِ اقتدا نہیں یا ان میں کوئی خصوصیت کا پہلو نہیں، وہ عام انسانوں کی طرح ایک انسان ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس لحاظ سے انبیا کو بشر کہنا کفار کا طریقہ رہا ہے۔

پہلی صورت سے حضراتِ انبیا کو بشر سمجھنا اور کہنا اگر عین ایمان ہے؛ تو دوسرے پہلو سے ان کو بشر سمجھنا اور کہنا عین کفر ہے۔

(۳) بعض لوگوں نے حضراتِ انبیا کی عصمت کا انکار کر دیا اور کہا کہ یہ حضرات معصوم نہیں ہیں؛ بل کہ ان سے بھی ایسے ہی گناہ ہو سکتے ہیں۔ جیسے دیگر انسانوں سے سرزد ہوتے ہیں۔

ایک معروف مصنف نے اپنی کجروی کی بنا پر لکھا ہے:

''عصمت در اصل انبیا کے لوازمِ ذات سے نہیں ہے؛ بل کہ اللہ تعالیٰ ان کو منصبِ نبوت کی ذمے داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لیے مصلحتہً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمالیا ہے؛ ورنہ اگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت تھوڑی دیر کے لیے ان سے جدا ہو جائے، تو جس طرح عام انسانوں سے بھول چوک اور غلطی ہوتی ہے، اسی طرح انبیا سے بھی ہو

سکتی ہے اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزشیں سرزد ہو جانے دی ہیں؛ تاکہ لوگ انبیا کو خدا نہ سمجھ لیں کہ یہ بشر ہیں، خدا نہیں۔''(۱)

یہی مصنف حضرت داود عَلَیْہِ السَّلَام کے متعلق لکھتے ہیں:

''حضرت داود عَلَیْہِ السَّلَام نے جو کچھ کیا تھا، اگر چہ وہ بنی اسرائیل کے ہاں ایک عام دستور تھا اور اسی دستور سے متأثر ہو کر ان سے یہ لغزش سرزد ہوگئی تھی''۔(۲)

نیز لکھا:

''حضرت داود عَلَیْہِ السَّلَام نے اپنے عہد کی اسرائیلی سوسائیٹی کے عام رواج سے متأثر ہو کر ''اُوریا'' سے طلاق کی درخواست کی تھی۔''(۳)

یہی مصنف اپنی تفسیر میں حضرت سیدنا آدم عَلَیْہِ السَّلَام کے متعلق لکھتے ہیں:

''بس ایک فوری جذبے نے جو شیطانی تحریص کے زیر اثر ابھر آیا تھا، ان (یعنی حضرت آدم عَلَیْہِ السَّلَام) پر ذہول طاری کر دی اور ضبطِ نفس کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی وہ طاعت کے مقامِ بلند سے معصیت کی پستی میں جا گرے۔''(۴)

نیز حضرت نوح عَلَیْہِ السَّلَام کے تذکرے میں لکھا:

---

(۱) تفہیمات:۲/۵۶-۵۷

(۲) تفہیمات:۲/۴۷

(۳) تفہیمات:۲/۵۶

(۴) تفہیم القرآن:۳/۱۳۳

”انبیا بھی انسان ہی ہوتے ہیں اور کوئی انسان بھی اس پر قادر نہیں ہوسکتا کہ ہر وقت اس بلند ترین معیارِ کمال پر قائم رہے، جو مؤمن کے لیے مقرر کیا گیا ہے، بسا اوقات کسی نازک نفسیاتی موقعے پر نبی جیسا اعلیٰ و اشرف انسان بھی تھوڑی دیر کے لیے اپنی بشری کمزوری سے مغلوب ہوجاتا ہے۔“(۱)

یہ چند نمونے ہیں ان لوگوں کی مسموم ذہنیت کے جو حضرات انبیا علیہم السلام کے مقام و مرتبے سے یا تو ناآشنا ہیں یا منکر اور جب مقام سے ناآشنا یا منکر ہیں، تو ظاہر کہ ان کے القاب و آداب کا کیا لحاظ کریں گے؟! لہٰذا لامحالہ اس کا وہ نتیجہ ظاہر ہونا تھا، جو ابھی ملاحظہ کیا گیا۔

(۴) بعض جدت پسندی کی لہر میں جذب ہوجانے والوں اور اسلامی تعلیمات سے بے خبری کے شکار لوگوں نے یہ غضب کیا کہ حضرت نبی کریم ﷺ کو اور دیگر حضراتِ انبیا کو ان کے مقدس ترین مقام سے گرا کر ایک سیاسی قائد و لیڈر کا درجہ دیا یا ان کو مصلح و ریفارمر کے لقب سے یاد کیا ہے اور ان کی دعوت و پیغام، ان کے لائے ہوئے دین و شریعت اور ان کے برپا کردہ نظامِ حیات کو سیاسی اصطلاحات و جدید تعبیرات کے ذریعے ایک ناقص و محدود؛ بل کہ کہنا چاہیے کہ ایک گھٹیا مفہوم و معنی پہنا کر ان ذواتِ مقدسہ کی شان میں تنقیص و تقصیر اور ان کی دعوت و پیغام کے حق میں توہین و تحقیر کا ارتکاب کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ حضراتِ انبیا کے بلند ترین و مقدس مقام کے لحاظ سے ان لوگوں کا ان حضرات کو ایک لیڈر یا ریفارمر مان لینا یا ان کی دعوت و پیغام کو ایک تحریک یا انقلاب سے تعبیر کرنا ایک شدید ترین غلطی اور ان کے حق میں کھلی ہوئی ناانصافی ہے۔

(۱) تفہیم القرآن: ۲/۳۴۴

یہ سب وہی تفریط کا غلو ہے، اگر یہ لوگ قرآن و حدیث میں مقام انبیا کا مطالعہ کرتے اور اپنی ناواقفیت و بے خبری کا پردہ چاک کر کے ان حقائق پر نظر کرتے، جن کا اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے بارے میں تذکرہ کیا ہے، تو یہ لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ حضراتِ انبیا کا مقام و کام سیاسی لیڈروں سے نہایت مختلف، عام مصلحین و ریفارمروں سے بالکل الگ، عام قائدین سے ماوراء ہوتا ہے۔

حضراتِ انبیا کی خصوصیات

حضراتِ انبیا کو دیگر عقلا و علما، مصلحین و قائدین، سیاسی مدبرین و مبصرین سے کئی طرح امتیاز حاصل ہے:

(۱) ایک تو یہ کہ حضراتِ انبیا اگرچہ کہ انسان ہوتے ہیں؛ مگر اللہ تعالیٰ ان کو ایسی خصوصیات و صلاحیتوں سے نوازتا ہے، جن کی وجہ سے وہ، وہ دیکھتے اور سنتے ہیں، جو دوسرے دیکھ اور سن نہیں سکتے۔ وہ حضرات اس عالم کا مشاہدہ کرتے ہیں، جس کا مشاہدہ نہ کوئی مصلح و ریفارمر کر سکتا ہے، نہ کوئی سیاسی مدبر و مبصر کر سکتا ہے، نہ بڑے بڑے عقلائے زمانہ اس میں ان کے شریک و سہیم ہو سکتے ہیں اور وہ ان امور و حوادث کا پتہ دیتے ہیں، جو حواسِ انسانی یا محض عقل و دانش کے عام ذرائع سے ممکن نہیں ہو سکتے۔

اسی لیے وہ حضرات امورِ غیب کی خبریں اس طرح دیتے ہیں جیسے ایک مشاہد دیتا ہے؛ کیوں کہ انھوں نے عالمِ غیب کا مشاہدہ کیا ہوا ہے، اس کے برخلاف عقل و دانش اور حکمت و دانائی میں یکتائے روزگار زعما و عقلا، سائنس و ٹکنالوجی کے ماہرین، علوم و فنون میں بصیرت کے حاملین، سیاسی قائدین و مبصرین (اپنے علم و فن اور اپنی بصیرت و مہارت کے حوالے سے کتنے ہی بلند ترین مقام پر فائز ہوں) نہ اس عالم کا

مشاہدہ کر سکتے ہیں، نہ وہاں کی کوئی بات بتا سکتے ہیں۔

اسی لیے جب نبی کی باتوں کی تکذیب وتردید کرنے والوں نے محض اپنی عقل و دانش، اپنی دنیوی امور میں مہارت و قابلیت کی بنا پر تکذیب وتردید کی تو قرآن نے ان کا جواب یہ دیا:

﴿أَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ، وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً أُخْرٰى ، عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ، عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ، إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ، مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ، لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى﴾ (النجم: ۱۲-۱۸)

(تو کیا ان (پیغمبرِ خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سے ان باتوں پر تم جھگڑتے ہو؟ جس کا انھوں نے مشاہدہ کیا ہے؟ اور آپ نے اس (فرشتے) کو ایک اور بار بھی دیکھا ہے، ''سدرۃ المنتہیٰ'' کے قریب، جہاں جنت الماویٰ ہے، جب کہ سدرے کو وہ چیزیں لپٹ رہی تھیں، جو لپٹ رہی تھیں، آپ کی نگاہ نہ تو ان سے ہٹی اور نہ بڑھی، آپ نے اپنے رب کی (قدرت) کے بڑے بڑے عجائبات دیکھے۔)

ان آیات میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ آپ نے قدرتِ خداوندی کے بڑے عجائبات دیکھے ہیں، اللہ کے فرشتے کو دیکھا ہے، ''سدرۃ المنتہیٰ'' دیکھا ہے، جنت الماویٰ دیکھا ہے؛ لہٰذا جب آپ کوئی غیبی خبر بیان کریں؛ تو ان کو قبول کرنا چاہیے، نہ یہ کہ اس پر آپ سے جھگڑنا چاہیے۔

حدیث میں بھی یہ بات خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بیان ہوئی ہے، ایک حدیث میں آپ فرماتے ہیں:

''إني أرى ما لا ترون ، و أسمع ما لا تسمعون ، أطت

السماء ، و حق لها أن تئط ، ما فيها موضع أربع أصابع إلا عليه ملک ساجد ، لو علمتم ما أعلم لضحكتم قليلا و لبكيتم كثيرا .“

(میں وہ چیزیں دیکھتا ہوں، جو تم نہیں دیکھ سکتے اور وہ باتیں سنتا ہوں، جو تم نہیں سن سکتے ؛ آسمان چرچراتا ہےاور اس کو حق ہے کہ وہ چرچرائے ،اس میں چار انگل کی جگہ نہیں ہے؛ مگر وہاں اللہ کا فرشتہ سجدہ کرتا ہوا ہےاور اگر تم ان باتوں کو جان لو؛ جو میں جانتا ہوں،تو تمھاری ہنسی کم اور رونا زیادہ ہو جائے۔)(۱)

لہٰذا یہی حضرات اس بات کے روادار ہوتے ہیں کہ وہ ان حقائق و معارف کے بارے میں گفتگو کریں، جن تک نہ تیز ترین احساساتِ انسانی کی رسائی ہو سکتی ہے، نہ عقل و دانش کی بہترین صلاحیتوں کی پہنچ ممکن ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ یہ حضرات اخلاق و کردار کے اس بلند ترین معیار پر قائم ہوتے ہیں، جو دوسرے لوگوں میں متصور نہیں ہو سکتا اور عصمت و پاکدامنی ان کی زندگی کا جزو لاینفک ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ گناہوں سے پاک و معصوم ہوتے ہیں،ان کی زندگیاں ایمان و یقین ، اخلاص و للّٰہیت ،توکل و اعتماد علی اللہ ،خشیت و خدا ترسی ،صداقت و سچائی ، دیانت و راست بازی ،مخلوق سے شفقت و ہمدردی ،محبت و دل سوزی ، ہر ایک کے ساتھ انصاف و رواداری کی آئینہ دار ہوتی ہیں اور دوسری جانب گناہ گاری و خطا کاری ،نفس پرستی و بوالہوسی ، لالچ و نفع اندازی ، مادی و فانی سے تعلق و انس ، دنیوی مال و متاع کی خواہش ،اپنے لیے معاوضے کی طلب سے پاک ہوتی ہیں۔

---

(۱) مسند أحمد : ۲۱۵۵۵، سنن الترمذي : ۲۳۱۲ ، سنن ابن ماجة : ۴۱۹۰، المستدرک للحاکم:۳۸۸۳

اسی لیے نبی اپنی زندگی کو ایک نمونے کے طور پر؛ بل کہ اپنی پاک دامنی و معصومیت کی دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے اور یوں کہتا ہے:

﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُراً مِّنْ قَبْلِهِ ، أَفَلا تَعْقِلُوْنَ﴾ (يُونس: ۱۶)

(میں نے تم میں اس سے پہلے ایک عمر گزاری ہے، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ؟)

کیا کوئی لیڈر، کوئی مصلح، کوئی مدبر، کوئی مبصر، کوئی ریفارمر بھی ایسا ہے، جو اپنی زندگی کو اس طرح پیش کر سکے اور اپنا بے داغ ہونا ثابت کر سکے؟ نہیں! یہ تو بس ان ہی حضرات کا حصہ ہے کہ وہ اپنی بے داغ زندگیوں کو مخلوق کے سامنے بہ طور اسوہ و نمونہ پیش کر کے اپنی اتباع کی جانب دعوت دے سکتے ہیں۔

(۳) تیسرے یہ کہ حضراتِ انبیا علیہم السلام اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان ایک واسطہ ہوتے ہیں اور اس واسطے سے وہ ایک جانب اللہ تعالیٰ کے احکام و فرامین، اس کی مرضیات و نامرضیات، بندوں سے اس کے مطالبات و تقاضے اور اس کی جانب سے اطاعت شعاروں کے حق میں خوش خبریاں اور نیک وعدے اور نافرمانوں کے لیے عذاب و عقاب کی دھمکیاں اور وعیدیں لاتے اور سناتے ہیں اور دوسری طرف بندوں کے ساتھ ہمدردی و شفقت کی بنا پر ان احکامات و فرامین خداوندی، مطالبات و تقاضائے ربانی پر ان کو چلانا چاہتے اور اس کی راہیں سمجھاتے اور بتاتے اور اس پر خود چل کر لوگوں کے لیے ایک اسوہ و نمونہ پیش کرتے ہیں۔

اور یہ بات کہ کوئی نبی ہو اور وہ خالق و مخلوق کے درمیان واسطے کی حیثیت میں ہو جائے، یہ محض اللہ کے اختیار و انتخاب کا نتیجہ ہے، اس میں نہ خود نبی کو دخل ہے، نہ کسی کی صلاحیت و قابلیت کو دخل ہے؛ بل کہ اللہ جس کو اس کے لیے منتخب فرمالے، وہی اس منصب پر فائز ہو سکتا ہے۔

لٰہذا کسی کی قابلیت وصلاحیت، کسی کا تقویٰ وطہارت، کسی کی خدمت ومحنت، کسی کا مجاہدہ وریاضت نبی ہونے کے لیے نہ کافی ہے، نہ لازم وضروری؛ بل کہ یہ منصب محض فضلِ الٰہی واصطفائے ربانی کا نتیجہ ہے۔

(۴) چوتھے یہ کہ یہ حضرات جس علم ومعرفت کو پیش کرتے اور جس کی جانب مخلوق خدا کو دعوت دیتے ہیں، وہ محض دنیوی تہذیب وتمدن کا سامان، صرف انسانی جسم کے بقاو تحفظ اور اس کی رہائش وآسائش، زیبائش ونمائش کے اسباب اور اس کے لیے ماکولات ومشروبات، مسکونات وملبوسات کی تیاری وفراہمی اور فانی زندگی کی سہولتوں و راحتوں، معیار عیش کی بلندیوں، خواہشات ولذات فانیہ کے لیے راہوں کی ہمواری کے ایک گھٹیا مقصد کی تحصیل وتکمیل کے لیے نہیں؛ بل کہ ان کے لائے ہوئے علم ومعرفت اور ان کی دعوت وپیغام کا اصل ہدف وحقیقی مقصد انسان کو اس کے خالق و مالک، اس کائنات کے مدبر ومنتظم کی ذات وصفات، اس کی مرضیات ونامرضیات، اس کے احکام وقوانین سے واقف کرانا، انسان ودیگر مخلوقات اور ان کے خالق و مالک کے باہمی تعلق کی صحیح نوعیت کو واضح کرنا، انسان کے مقصدِ تخلیق اور اس کے سفرِ حیات کی منزلیں ومدارج کی تعیین اور اس کی آخری منزل کی نشاندہی کرنا، اس کی زندگی میں کامیابی وناکامی کے اسباب، اس کی اخلاقی وروحانی قدروں اور اس صلاح وفلاح کے طریقوں کو واضح وروشن کرنا ہے؛ لٰہذا وہ حضرات اپنے اس عظیم مقصد کے پیشِ نظر انسان کو اللہ کی ذات وصفات کی معرفت، اس کے احکام وقوانین، صحیح عقائد ونظریات، اچھے ونیک اعمال وافعال، بلند ومحمود اخلاق و عادات، حق وباطل میں تمیز، شر وخیر میں امتیاز کی صلاحیت، آخرت کا خوف وفکر، آخرت میں جواب دہی کا احساس، جنت ودوزخ کے حالات وکیفیات، ثواب و عقاب کی تفصیلات وغیرہ امور کو اپنے منشور میں سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور

لوگوں پر ان ہی امور کے سلسلے میں محنت کرتے ہیں۔

اس کے برخلاف سیاسی قائدین و دنیوی مصلحین کی نگاہ میں سب سے زیادہ اہمیت، دنیوی فوز وفلاح، فانی لذات وخواہشات کی تکمیل، ظاہری تہذیب وتمدن کی ہمواری، کھانے و پینے، کپڑے ومکان، دنیوی زندگی کی راحت وآسائش کی تحصیل پر ہوتی ہے اور انسان کو انسان بنانے، اس کے اندر انسانیت واخلاق پیدا کرنے، اس کو اس کی اصلی وحقیقی منزل سے روشناس کرانے کے سلسلے میں ان کا کوئی کارنامہ نہیں ہوتا؛ بل کہ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ خود بھی اس سلسلے میں خوابِ غفلت میں پڑے ہوتے ہیں اور ان کو خود ان حضراتِ انبیا کی اسی طرح ضرورت ہوتی ہے، جس طرح ایک عام انسان کو ان کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۵) پانچویں یہ کہ یہ حضرات جس عظیم مقصد کے لیے مبعوث کیے جاتے ہیں، اس کے لیے یہ خود کو اس طرح وقف کر دیتے ہیں کہ اس کے بغیر ان کے وجود کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا، وہ اس کام کے لیے اپنے عیش و راحت، عزت و وقار، جان و مال سب کو قربان کر دیتے ہیں اور اس کام کو تکمیل کی راہ پر لگا جاتے ہیں اور اسی کا نتیجہ -بہ قول حضرت مفکرِ اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ - یہ سامنے آتا ہے:

"انھوں (یعنی حضراتِ انبیا) نے اپنی بعثت کے زمانے میں اپنی قوم وامت اور اپنے پورے معاشرے میں خیر کی محبت اور شر سے نفرت کے جذبے کو پروان چڑھایا، حق کی حمایت اور باطل کی مخالفت ان کی طبیعت وفطرت میں داخل کرنے کی کوشش کی اور طویل انسانی تاریخ میں جب بھی یہ جذبہ کمزور پڑا، انسانوں کی فطرت میں تغیر رونما ہوا اور ان میں بہیمیت اور درندگی کے آثار ظاہر ہوئے، انبیا علیہم السلام نے فوراً ان کا علاج کیا اور قساوت و بہیمیت کو رحمت ورافت اور شرافت وانسانیت

میں بدل دیا، انھوں نے اپنی اعلیٰ تعلیمات کی اشاعت کی، اس کے لیے مسلسل ومتواتر جدو جہد کی، عیش وآرام کی پروا نہیں کی، عزت ووقار کا خیال نہیں کیا؛ حتی کہ اپنے جسم و جان کی فکر نہیں کی اور اسی مسلسل و جانکاہ محنت و مشقت کے نتیجے میں انسانیت سے عاری حیوانوں اور پھاڑ کھانے والے درندوں میں ایسے نیک نفس لوگ پیدا ہوئے، جن کے انفاس سے دنیا معطر ہوگئی، جن کے حسن و جمال سے انسانیت کی تاریخ میں دل کشی و رعنائی آ گئی، جو رفعت و منزلت میں فرشتوں سے بھی آگے نکل گئے اور ان ہی برگزیدہ، مثالی اور قابلِ تقلید نفوس کی برکت سے تباہ و برباد ہونے والی انسانیت کو نئی زندگی مل گئی، عدل و انصاف کا دور دورہ ہو گیا، کمزوروں میں طاقت والوں سے اپنا حق وصول کرنے کی ہمت و طاقت پیدا ہوئی، بھیڑیوں نے بکریوں کی گلہ بانی کی، فضاؤں میں رحم و کرم کی خنکی چھا گئی، الفت و محبت کی خوشبو پھیل گئی، سعادت کا بازار گرم ہو گیا، دنیا میں جنت کی دکانیں سج گئیں، ایمان و یقین کی عطر بیز ہوائیں چلنے لگیں، انسانی نفوس ہوا و ہوس کی گرفت سے آزاد ہو گئے قلوب، بھلائیوں کی طرف کھینچنے لگے جیسے مقناطیس کی طرف لوہے کے ٹکڑے۔“(۱)

یہ ہیں حضراتِ انبیا، ان کے کمالات وصفات، ان کا کام و مشن، جس کے لیے ان کو مبعوث کیا جاتا ہے اور ان کی ان تھک محنت کے ثمرات و برکات!! بتاؤ کہ کیا وہ عام بشر کی طرح ایک بشر ہیں؟ اور نا قابل تقلید ہیں، یا بشر ہونے کے باوجود مافوق البشری کمالات کے حامل ہیں اور اس لیے ہر لحاظ سے قابلِ تقلید و اتباع ہیں۔

(۱) منصبِ نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین: ۵۹-۶۰

صحابہ رضی اللہ عنہم کے تقدس سے کھلواڑ

تفریط وتقصیر کے اس غلو نے امت کے بعض لوگوں اور طبقوں کو اس بات پر ابھارا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی تنقیص وتوہین کی جائے، جیسے ایک فرقہ ان حضرات کی شان میں گستاخیاں کرتا اور ان کے تقدس سے کھلواڑ کرتا اور بیشتر صحابہ رضی اللہ عنہم کو (نعوذ باللہ) کافر کہتا ہے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وحضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خاص طور پر ہدفِ تنقید بناتا ہے اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر (نعوذ باللہ) تہمت لگاتا ہے۔

حال آں کہ تاریخ کے وثائق پوری ذمے داری کے ساتھ گواہی دیتے ہیں کہ اس روئے زمین پر حضراتِ انبیا کے بعد کوئی بھی ایمان ویقین، اطاعت وبندگی، تقدس وتقوی، اخلاص وللّٰہیت، دینی حمیت وخدمت میں حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے بڑھ کر نہیں ہوا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے دین کی نصرت وخدمت، اس کی حفاظت واشاعت اور دعوت وتبلیغ اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ومعیت اور تائید وتقویت کے لیے منتخب فرمالیا تھا اور ان کی فضیلت میں قرآن وسنت دونوں کی نصوص دلالت کرتی ہیں اور واضح الفاظ میں ان کی عظمت وجلالت اور بزرگی بیان کرتی ہیں۔

عظمت وشانِ صحابہ رضی اللہ عنہم

یہاں مثالاً ان حضرات کے فضائل ومناقب میں قرآن وسنت سے چند دلائل پیش کیے جاتے ہیں:

ایک موقعے پر قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ

رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ، سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِکَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ أَجْرًا عَظِيْمًا﴾ (الفتح:۲۹)

(محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں، وہ کفار کے مقابلے میں سخت اور آپس میں رحیم ہیں، تو ان کو دیکھے گا کہ وہ اللہ کے فضل و رضا کی تلاش میں رکوع و سجدہ کر رہے ہیں، سجدے کی تاثیر سے ان کے چہروں پر ان کے آثارِ نماز ہیں، یہ ان کے اوصاف، تورات میں ہیں اور ان کی مثال انجیل میں یہ ہے کہ جیسے کھیتی کہ اس نے اپنی سوئی نکالی پھر اس نے سوئی کو مضبوط کیا پھر وہ اور موٹی ہوئی، پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہوگئی کہ کسانوں کو بھلی معلوم ہونے لگی؛ تاکہ کافر لوگ ان سے جلیں، اللہ نے ان ایمان والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ کیا ہے۔)

ایک دوسری جگہ مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم میں سے ''سابقینِ اولین'' اور ان کے بعد ایمان لانے والے صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذکر اس طرح کیا ہے:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْأَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْأَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ أَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ أَبَدًا ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ (التوبۃ:۱۰۰)

(اور جو مہاجرین و انصار میں سے مقدم و سابق ہوئے اور جنھوں نے نیکی میں ان کی پیروی کی، ان سے اللہ راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے اور اس نے ان کے لیے ایسی جنتیں تیار کی ہیں کہ ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں یہ ہمیشہ ہمیش کے لیے رہیں گے، یہی بڑی کامیابی ہے۔)

قرآنِ کریم میں اور بھی آیات ہیں، یہاں بہ طور نمونہ دو آیات پیش کی گئیں اور احادیث میں سے دو چار سنتے چلیں:

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"النجوم أمنة للسماء، فإذا ذهبت النجوم أتى السماء مايوعد، و أنا أمنة لأصحابي، فإذا ذهبت أتى أصحابي ما يوعدون، و أصحابي أمنة لأمتي فإذا ذهب أصحابي أتى أمتي ما يوعدون."(۱)

(ستارے آسمان کے لیے باعثِ امن ہیں، جب وہ غائب ہو جائیں، تو آسمان پر وہ مصیبت آجائے گی، جس کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے اور میں میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے امن کا باعث ہوں، جب میں چلا جاؤں گا؛ تو ان کو وہ مصیبت پیش آئے گی، جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم میری امت کے لیے باعث امن ہیں، جب وہ چلے جائیں؛ تو امت پر وہ مصائب پیش آئیں گے، جن کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔)

---

(۱) الصحیح للمسلم:۶۶۲۹، مسند أحمد:۱۹۵۸۴، صحیح ابن حبان:۷۲۴۹، مسند بزار:۳۱۰۲، مسند أبي يعلى:۷۲۷۶

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

" لا تسبوا أصحابي ، فلو أن أحدكم أنفق مثل أحد ذهباً ما بلغ مد أحدهم ، ولا نصيفهٔ."

(میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو برا بھلا نہ کہو! کیوں کہ اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کے برابر سونا بھی اللہ کے راستے میں خرچ کرے گا؛ تب بھی وہ ان حضرات کے ایک مد (کھجور) بل کہ اس کے آدھے کے برابر بھی نہیں پہنچ سکتا۔)(۱)

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"خدا سے ڈرو! خدا سے ڈرو، میرے صحابہ کے بارے میں! میرے بعد ان کو ہدفِ ملامت نہ بناؤ؛ کیوں کہ جو ان سے محبت کرتا ہے، وہ میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت کرتا ہے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے، وہ میرے سے بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھتا ہے اور جو ان کو تکلیف پہنچاتا ہے وہ مجھے تکلیف پہنچاتا ہے اور جو مجھے تکلیف دیتا ہے، وہ اللہ کو تکلیف دیتا ہے اور خدا کو تکلیف دینے والا قریب ہے کہ پکڑا جائے۔"(۲)

---

(۱) الصحیح للبخاری:۳۶۷۳، الصحیح للمسلم:۲۶۵۲، سنن الترمذي: ۳۸۶۱، سنن ابن ماجة:۱۶۱، مسند أحمد:۱۱۰۹۴، صحیح ابن حبان:۶۹۹۴

(۲) سنن الترمذي:۳۸۶۲، صحیح ابن حبان:۷۲۵۶، السنة لابن أبي عاصم:۹۹۲، شعب الإیمان:۱۴۲۴

ایک حدیث میں ہے:

''آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے پسند کرلیا اور میرے لیے میرے صحابہ کو چن لیا، پھران میں میرے وزیر و مددگار اور سسر بنائے، پس جو ان کو برا بھلا کہے، اس پر اللہ تعالیٰ اور فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے، اس سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ فرض قبول کرے گا نہ نفل۔''(۱)

یہ چند حدیثیں نمونے کے طور پر یہاں نقل کردی گئی ہیں، اگر کسی کو اس سلسلے میں تفصیل درکار ہو، تو وہ علامہ ابن حجر مکی رحمہ اللہ کی کتاب ''الصواعق المحرقة'' کا مطالعہ کرے۔

صحابہ کو رضی اللہ عنہم برا بھلا کہنا حرام؛ بل کہ بعض کے نزدیک کفر ہے

ان روایات سے معلوم ہوا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو برا بھلا کہنا حرام اور فحش محرمات میں سے ہے۔ چناں چہ حضراتِ علمائے اہلِ سنت نے پوری وضاحت وصراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ صحابہ پر سب وشتم اور ان کو برا بھلا کہنا حرام ہے؛ بل کہ امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو کفر قرار دیا ہے۔

مشہور مالکی محدث وفقیہ امام قاضی عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم پر سب وشتم کرنا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔(۲)

ملا علی قاری رحمہ اللہ ''شرح الفقه الأكبر''میں رقمطراز ہیں :

---

(۱) المستدرك للحاكم:۶۶۵۶، المعجم الكبير للطبراني:۱۳۷۹۴، معرفة الصحابة لأبي نعيم الأصفهاني:۴۷۵۵، معجم الصحابة:۱۶۲۸، السنة لابن أبي عاصم:۱۰۰

(۲) شرح المسلم:۲/۳۱۰

”(شرح العقائد) میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو برا کہنا اور ان پر طعن کرنا، اگر ان چیزوں سے ہے، جو دلائلِ قطعیہ کے مخالف ہیں، تو یہ کفر ہے، جیسے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگانا اور اگر ایسے امور میں نہ ہو، تو وہ بدعت وگناہ ہے۔“(۱)

امام علامہ شمس الدین ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”جو شخص حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم پر طعن کرتا یا ان پر سب وشتم کرتا ہے؛ وہ دین سے خارج اور ملتِ اسلام سے الگ ہے؛ کیوں کہ ان پر طعن کرنا صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ان کے حق میں برائیوں کا اعتقاد ہو اور دل میں ان سے بغض پوشیدہ ہو اور اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان کی جو تعریف کی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی جو فضیلت وبڑائی بیان کی ہے، اس سے انکار ہو، پھر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم چوں کہ دین کے پہنچانے والے اور اس کا بہترین ذریعہ ووسیلہ ہیں۔ اس لیے ان پر طعن کرنا گویا اصل (دین) پر طعن کرنا ہے اور ناقل کی توہین، منقول کی توہین ہے۔“(۲)

امام ابوزرعہ رازی رحمہ اللہ مشہورِ زمانہ محدث کا قول ہے:

”جب تم کسی کو صحابہ رضی اللہ عنہم کی تنقیص کرتے ہوئے دیکھو، تو سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے؛ کیوں کہ ہمارے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق پر ہیں اور قرآن حق ہے، قرآن وسنت ہم تک پہنچانے والے یہی حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں اور یہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تنقیص کرنے والے ہمارے

---

(۱) شرح الفقه الأكبر:۸٦

(۲) الکبائر:۲۳۸

گواہوں کو مجروح کرنا چاہتے ہیں؛ تاکہ کتاب وسنت کو باطل ثابت کریں؛ لہٰذا خود ان ہی کو مجروح کرنا زیادہ مناسب ہے؛ لہٰذا وہ زندیق ہیں۔"(۱)

علما کے ان بیانات سے صاف معلوم ہوا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم پر زبانِ طعن دراز کرنا، ان پر سب وشتم کرنا سخت گناہ اور بعض کے نزدیک کفر ہے۔

مشاجراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں اہلِ سنت کا موقف

آج سبائی پروپیگنڈے سے متاثر افراد، جو حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی توہین وتنقیص کرتے اور ان کے خلاف اپنی ناپاک زبانوں کو چلاتے رہتے ہیں، سب سے زیادہ جس چیز کو اچھالتے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے حق میں نقص و برائی پر استدلال کرتے ہیں، وہ حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین ہونے والے بعض مشاجرات واختلافات ہیں اور اس سلسلے میں ان کے پاس جو کچھ ہے، وہ تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق ہیں، جن میں صحیح وسقیم، قوی وضعیف، حق وباطل کی آمیزش ہے؛ کیوں کہ سبائی ایجنٹوں نے تاریخ کو اپنے ناپاک عزائم وحرکات سے پاک وصاف رہنے نہ دیا؛ اسی لیے اہلِ سنت علما نے لکھا ہے کہ ان تاریخ کے اوراق سے صرف وہی بات مانی جائے گی، جو صحابہ کرام کی عدالت وثقاہت کو- جس پر نصوصِ قطعیہ نے دلالت کی ہے- برقرار رکھنے والی ہے، اس کے خلاف کوئی بات نہ لی جائے گی؛ کیوں کہ اس میں سبائیوں نے خلط ملط کر دیا ہے اور جو صحیح روایات سے ثابت ہے، اس میں وہ حضرات معذور ہی نہیں؛ بل کہ ماجور بھی ہیں؛ کیوں کہ ان حضرات نے کسی غلط و برے ارادے ونیت سے ایسا نہیں کیا تھا؛ بل کہ نیک نیتی کے ساتھ اپنے

---

(۱) الكفاية في علم الرواية:۴۹

موقف پر وہ قائم رہے تھے، یہ ان کا اجتہاد تھا، جن میں ممکن ہے بعض سے خطا ہوئی ہو؛ مگر یہ خطا بھی معاف ہے اور اس پر ایک اجر بھی ثابت ہے۔ میں نے یہاں اہلِ سنت کا جو موقف پیش کیا ہے، یہ حضرات علمائے اہلِ سنت کی کتابوں میں وضاحت کے ساتھ موجود ہے، ہم یہاں اختصار کے پیش نظر صرف ایک حوالے پر اکتفا کرتے ہیں۔

علامہ ابن تیمیہ رَحِمَہُ اللّٰہُ اپنی کتاب ''العقیدة الواسطیة'' میں فرماتے ہیں:

''اہلِ سنت کے اصول میں سے یہ ہے کہ وہ روافض جو صحابہ رضی اللہ عنہم سے بغض رکھتے اور ان کو برا کہتے ہیں اور نواصب جو اہلِ بیت رسول رضی اللہ عنہم کو قول یا عمل سے ایذا دیتے ہیں، ان کے طریقے سے اپنے آپ کو بری کرتے ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے مابین جو اختلاف ہوا، اس کے بارے میں (اپنی زبان کو) روکتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ان روایات میں جن سے صحابہ رضی اللہ عنہم کی برائیاں معلوم ہوتی ہیں، بعض محض کذب اور جھوٹ ہیں اور ان میں سے بعض میں کچھ کمی بیشی کر دی گئی ہے اور ان کے اصل مفہوم سے ان کو بدل دیا گیا ہے اور ان میں سے جو صحیح ہیں، ان میں صحابہ رضی اللہ عنہم معذور ہیں یا مجتہد برحق ہیں یا مجتہد خطاوار ہیں۔'' (۱)

صحابہ رضی اللہ عنہم سب کے سب عدول و معیارِ حق ہیں

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظیم شخصیات کے سلسلے میں امت کے سوادِ اعظم کا شروع سے لے کر آج تک یہی عقیدہ چلا آ رہا ہے کہ وہ سب کے سب عدول و قابل

(۱) العقیدة الواسطیة: ۱۷

اعتماد و لائق اعتبار ہیں، خواہ وہ صحابی چھوٹے ہوں یا بڑے اور پہلے ایمان لانے والوں میں سے ہوں یا بعد میں ایمان قبول کرنے والوں میں سے ہوں؛ مگر بعض لوگ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض سے اتفاقاً کسی گناہ کے صدور کو دیکھ کر ان کی شخصیات کو داغ دار کرنے اور ان کو (نعوذ باللہ) فاسق کہنے کی جرأت کرتے ہیں، یہ خطرناک روش ہے۔ اوپر ہم نے وہ احادیث پڑھ لی ہیں، جس میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو برا بھلا کہنے سے منع کیا ہے اور اس میں یہ بھی داخل ہے کہ ان کو فاسق قرار دیا یا سمجھا جائے۔

تمام علمائے اہلِ سنت نے بلا کسی استثنا کے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو عدول قرار دیا ہے اور یہی اہلِ سنت کا عقیدہ بھی ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "مقامِ صحابہ رضی اللہ عنہم" میں اکابرینِ امت کے اس سلسلے میں بہت سے اقوال جمع کر دیے ہیں، جس کو شوق ہو اور وہ طالبِ انصاف ہو؛ وہ اس کا مطالعہ کرے۔ ہم یہاں چند اہم اقوال نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

(۱) مسلک حنبلی کے معتبر و مستند شارح و امام علامہ شمس الدین السفارینی الحنبلی رحمہ اللہ نے اپنی عظیم الشان کتاب " لوامع الأنوار البهية شرح الدرة المضيئة " میں جو عقائدِ اہلِ سنت پر نہایت مستند مانی جاتی ہے، اس میں لکھا ہے:

> "اہلِ سنت والجماعت نے جس بات پر اجماع کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ہر شخص پر واجب ہے کہ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے حق میں عدالت کو ثابت کرتے ہوئے اور ان کے حق میں طعن و تشنیع سے پرہیز کرتے ہوئے ان کو پاک وصاف سمجھے؛ کیوں کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں متعدد آیات میں

ان کی تعریف کی ہے۔ اس کے علاوہ اگر خدا تعالیٰ سے ان کی تعریف میں کوئی بات وارد نہ ہوتی اور نہ رسول اللہ ﷺ سے وارد ہوتی، تب بھی ان حضرات کے احوال، ہجرت، جہاد، دین کی نصرت، جان و مال کی قربانی، باپ دادوں اور اولاد کو اللہ کے لیے مروا دینا، دین کے بارے میں خیر خواہی، ایمان و یقین کی قوت وغیرہ جن پر وہ قائم تھے، یہ احوال ان کی عدالت و پاکیزگی پر یقین و اعتقاد کو لازم کرتے ہیں اور اس بات کو کہ یہ حضرات اپنے نبی ﷺ کے بعد پوری امت سے افضل ہیں۔ یہی تمام امت اور ان ائمہؒ کرام کا مذہب ہے، جن پر اعتماد کیا جاتا ہے۔“(۱)

(۲) علامہ ابن الصلاح رحمہ اللہ علم حدیث کے ائمہ میں سے ایک جلیل الشان امام گزرے ہیں، ان کی ایک عظیم کتاب ” علوم الحدیث“ جو مدارسِ اسلامیہ میں طلبائے علومِ حدیث کے لیے زیرِ درس ہے، اس میں آپ لکھتے ہیں:

”تمام صحابہؓ کرام کی ایک خصوصیت ہے، وہ یہ کہ ان میں سے کسی کی عدالت (قابل اعتبار و متقی ہونے) کے بارے میں بحث نہیں کی جائے گی؛ کیوں کہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے، جس سے فراغت پالی گئی ہے؛ کیوں کہ ان حضرات کا عادل وثقہ ہونا نصوصِ کتاب وسنت اور ان لوگوں کے اجماع سے ثابت ہے، جن کا اجماع میں اعتبار ہوا کرتا ہے۔“(۲)

(۳) دبستانِ فقہِ مالکی کے اہم ترین رکن و امام علامہ ابن عبد البر مالکی رحمہ اللہ اپنی کتاب ”الاستیعاب“ میں فرماتے ہیں:

---

(۱) لوامع الأنوار البهية:۲/۳۸۸

(۲) علوم الحدیث:۴۹۰

’’یہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم ہر زمانے کے لوگوں سے افضل ہیں اور خیرِ امت ہیں، جنھیں لوگوں کی بھلائی کے لیے ظاہر کیا گیا اور ان سبھی کی عدالت اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کی تعریف و توصیف سے ثابت ہے اور ان سے بڑھ کر کون عادل ہوسکتا ہے؟ جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ونصرت کے لیے پسند کرلیا ہو اور کسی کے حق میں عدالت وثقاہت کی شہادت اس اللہ ورسول کی شہادت وگواہی سے بڑھ کر نہیں ہوسکتی۔‘‘ (۱)

(۴) فقہ حنفی کے مایہ ناز و باکمال فقیہ ومجتہد علامہ کمال ابن الہمام رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ’’ المسایرۃ ‘‘میں لکھا ہے:

’’اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کا تزکیہ کیا جائے (گناہوں سے پاک ہونا بیان کیا جائے) ایک تو ان سب کے عادل ہونے کو ثابت کرنے سے اور دوسرے ان کے بارے میں طعن و تشنیع سے بچنے سے اور تیسرے ان کی اس طرح مدح سرائی کرنے سے جیسے اللہ نے فرمائی ہے۔‘‘ (۲)

(۵) علامہ عضد الدین بن عبد الرحمٰن رحمہ اللہ کی عقائدِ اسلامیہ پر مشہورِ زمانہ کتاب ’’ المواقف ‘‘میں اہلِ سنت کا صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں مسلک بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

’’تمام کے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعظیم اور ان کے بارے میں جرح

---

(۱) الاستیعاب:۱۵

(۲) المسایرۃ:۱۳۲

وقدح سے پرہیز واجب ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کئی جگہ ان کی تعریف کی ہے اور اللہ کے رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ان سے محبت کی اور بہت سی احادیث میں ان کی مدح فرمائی ہے، پھر جو شخص ان کی سیرت و کردار میں غور کرے گا اور ان کے کارناموں، ان کی دین کے سلسلے میں جد و جہد، ان کے اللہ و رسول کی نصرت میں جان و مال کے لٹانے پر واقف ہوگا، اسے ان کی عظمتِ شان میں اور ان مطاعن سے بری ہونے میں جو ان کی جانب اہلِ باطل منسوب کیا کرتے ہیں، کوئی شک ہی نہ ہوگا اور یہ بات اس کو ان میں طعن سے روکے گی اور وہ یہ دیکھے گا کہ ان میں طعن کرنا ایمان کے خلاف ہے۔'' (۱)

ان حضراتِ اکابر کے علاوہ بھی تقریباً تمام علمائے اہلِ سنت نے کسی نہ کسی حیثیت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کی عدالت و ثقاہت، ان کی عظمت و جلالت کا ذکر کیا ہے اور اہلِ سنت کے عقائد پر لکھی ہوئی تمام ہی کتابیں اس مسئلے کی وضاحت و صراحت سے لبریز ہیں۔

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی توہین و تنقیص حرام قطعی ہے اور بعض کے نزدیک تو کفر ہے، نیز ان کی عدالت و شرافت ایک مسلمہ امر ہے، جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، تو یہیں سے ایک بات یہ بھی سمجھ میں آگئی کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم معیارِ حق بھی ہیں، ان کے اقوال و افعال، ان کی باتیں اور طریقے بھی حق کو جاننے کا معیار ہیں۔

لہٰذا جو لوگ صحابہ رضی اللہ عنہم کو معیارِ حق نہیں مانتے، وہ بھی تنقیصِ صحابہ رضی اللہ عنہم کرتے ہوئے غلو کے مرتکب ہیں۔

---

(۱) المواقف: ۳/۲/۴۷

علما و اہل اللہ کی تنقیص و توہین

اسی طرح کوئی شخص اللہ کے سچے ولیوں و سچے عالموں کی توہین و تذلیل کرتا ہے یا ان کو تکلیف پہنچا تا ہے، ان کی شان میں گستاخی کرتا ہے، تو یہ بھی وہی دین میں غلو اور تفریط حرام ہے۔

آج اس میں بھی ابتلائے عام ہے، حتی کہ بعض دین دار کہلانے والے اور دینی جماعتوں سے منسلک لوگ بھی اس میں مبتلا نظر آتے ہیں، بالخصوص جدت پسند طبقے میں اور نئے تعلیم یافتہ لوگوں میں یہ بیماری شدت اختیار کی ہوئی ہے کہ وہ نہ اولیاء اللہ کی قدر کرتے ہیں، نہ حضراتِ اہلِ علم کی توقیر کرتے ہیں؛ بل کہ ان سب سے بدظنی میں مبتلا ہیں، حتی کہ ان کے فتاویٰ کو بھی بلاوجہ و بے دھڑک رد کر دیتے ہیں، اہلِ دین کا مذاق اڑاتے ہیں، دینی و دعوتی کام میں لگنے والوں سے استہزا و استخفاف کا معاملہ کرتے ہیں۔ یہ سب وہی غلوِ مذموم و تفریطِ ممنوع ہے۔

اہل اللہ کے بارے میں یہ حدیث بہ غور سن لینا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”قال اللّٰه تعالی : مَنْ عَادیٰ لِيْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُه بِالْحَرْبِ.“

(اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو میرے ولی سے عداوت رکھتا ہے، اس کو میں اعلانِ جنگ دیتا ہوں۔)(۱)

ایک حدیث میں یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا:

”من عادیٰ لي ولیا فقد آذاني.“(۲)

---

(۱) الصحیح للبخاري:۶۵۰۲،شرح السنة:۱۲۴۸

(۲) صحیح ابن حبان:۳۴۷

(جس نے میرے ولی سے دشمنی کی، تو اس نے مجھے تکلیف پہنچائی۔)

حضراتِ علما کے بارے میں ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہ تبلیغ و ترویجِ دین اور استحکام و تشریحِ شریعت کی ذمے داری اٹھائے ہوئے ہیں؛ لہٰذا ان کا وجود ہمارے لیے ایسا ہی ضروری ہے جیسے خود دین ضروری ہے؛ کیوں کہ دین، اہلِ دین و اہلِ علم ہی سے آتا ہے، اگر یہ طبقہ نہ رہے؛ تو دین کہاں سے آئے گا اور حق و باطل کی تمیز ہمیں کون سکھائے گا؟ سنت و بدعت کا فرق کون بتائے گا؟ نیز قرآن و سنت کی حفاظت جو اس طبقے سے ہو رہی ہے وہ کون پوری کرے گا؟ لہٰذا جو لوگ علمائے کرام سے بدظنی اور ان کی بدگوئی میں مبتلا ہوتے ہیں، وہ دراصل دین و شریعت سے بدظنی و بدگوئی میں مبتلا ہوتے ہیں۔

توہینِ علما و اولیا حرام اور بعض صورتوں میں کفر ہے

اسی لیے حضراتِ ائمہ و علما نے تصریح کی ہے کہ اہلِ علم کی قدر کرنا واجب ہے اور ان کی توہین و ایذا حرام ہی نہیں؛ بل کہ بعض صورتوں میں کفر ہے۔

''الفقہ الأکبر'' امام اعظم ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللّٰہُ کی کتاب ہے، اس کی شرح ملا علی قاری رَحِمَہُ اللّٰہُ نے لکھی ہے، اس میں اور دیگر کتبِ فقہ میں یہ مسئلہ لکھا ہے:

''من أبغض عالماً بغير سبب ظاهر خيف عليه الكفر''

(جو شخص بغیر کسی ظاہری سبب کے کسی عالم سے بغض رکھتا ہے، اس پر کفر کا اندیشہ ہے۔)(۱)

یہ مسئلہ بیان کر کے ملا علی قاری رَحِمَہُ اللّٰہُ کہتے ہیں:

''میں کہتا ہوں کہ ظاہر تو یہی ہے کہ وہ کافر ہی ہو جائے گا؛ اس لیے

---

(۱) الفقہ الأکبر:۲۸۷، لسان الحکام:۱/۴۱۵

کہ جب اس نے بلا کسی سبب دنیوی یا اخروی کے عالم سے بغض رکھا، تو اس کا یہ بغض دراصل شریعت سے بغض ہے اور اس میں کیا شک ہے کہ جو شریعت کا انکار کرے، وہ بھی جب کافر ہے، تو چہ جائے کہ جو اس سے بغض رکھے۔'' (۱)

علامہ محمود الآلوسی البغدادی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے ''تفسیر روح المعاني'' میں لکھا ہے:

''نعم من اتصف بصفات الأولياء ظاهرا يجب تعظيمه، و احترامه، والتأدب معه، والكف عن إيذائه بشيء من أنواع الإيذاء التي لا مسوغ لها شرعا كالإنكار عليه عنادا، و حسدا دون المنازعة في محاكمة، أو خصومة.''

(ہاں! جو ظاہراً اولیاء اللہ کی صفات سے متصف ہے، اس شخص کی تعظیم و احترام اور اس کے ساتھ ادب کا معاملہ کرنا بھی ضروری ہے اور ہر قسم کی ایذا و تکلیف سے رک جانا بھی واجب ہے، جس کی شرعاً اجازت نہ ہو۔ جیسے بغیر کسی جھگڑے وغیرہ کے اس کا محض حسد و دشمنی کی وجہ سے انکار کرنا۔) (۲)

حضرت شیخ الحدیث رَحِمَہُ اللّٰہُ نے ''فضائلِ تبلیغ'' میں ایک فصل قائم کی ہے، اس میں لکھتے ہیں:

''فصلِ سادس میں عامۃ المسلمین کو ایک خاص امر کی طرف متوجہ کرنا ہے، وہ یہ کہ اس زمانے میں علما کی طرف سے بدگمانی، بے توجہی

---

(۱) شرح الفقه الأكبر: ۲۸۷، لسان الحكام: ۴۱۵/۱

(۲) روح المعاني: ۱۱۴/۱۱

نہیں ؛ بل کہ مقابلہ وتحقیر کی صورتیں بالعموم اختیار کی جارہی ہیں۔ یہ امر دین کے لحاظ سے نہایت ہی سخت خطرناک ہے۔ (پھر علما پر کیے جانے والے شبہات اوران کے بارے میں وارد، فضائل کی احادیث ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں) جس قسم کے الفاظ اس زمانے میں علما اور علوم دینیہ کے متعلق اکثر استعمال کیے جاتے ہیں، ''فتاویٰ عالمگیری'' میں ان میں سے اکثر الفاظ کو الفاظِ کفریہ میں شمار کیا ہے؛ مگر لوگ اپنی ناواقفیت سے اس حکم سے غافل ہیں؛ اس لیے نہایت ضروری ہے کہ اس قسم کے الفاظ بالعموم استعمال کرنے میں زیادہ احتیاط کی جائے۔''(۱)

یہاں ان عبارات کو نقل کرنے سے مقصود یہ بتانا ہے کہ علما کا استہزا و مذاق، ان کو ایذا و تکلیف دینا، ان سے بدسلوکی کرنا، ان کی تحقیر و توہین کرنا کس قدر برا ہے، اس پر غور کیا جائے ؛ بل کہ بلا کسی دینی و دنیوی سبب کے ہو، تو کفر کا خوف بھی ہے؛ لہٰذا علما سے دین کے شارح و داعی و مبلغ ہونے کی وجہ سے محبت و عقیدت رکھنا، واجب وضروری ہے، یہ شریعت کی قائم کردہ حد ہے، اس میں کمی کرنا بھی غلو ہے۔

ائمۂ سلف کی گستاخی وتوہین کا فتنہ

اسی طرح آج جو ایک طبقے کی جانب سے حضراتِ ائمہ، بالخصوص امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللّٰہُ کی شان میں گستاخیاں یا کم از کم تحقیر وتوہین کی جاتی ہے، یہ بھی وہی غلو فی الدین میں داخل ہے؛ مگر افسوس یہ لوگ اسی کو دین کا لازمہ سمجھے ہوئے ہیں اور ان لوگوں کی دین داری کی علامت ہی یہ بن گئی ہے کہ وہ ائمہ کے خلاف زبانِ طعن دراز کرتے رہیں۔ غور کریں کہ شریعت نے جس چیز سے منع کیا وہی کام کر کے کوئی کیا

(۱) فضائل اعمال: ۱/۳۰۷-۳۰۹

دین دار بن سکتا ہے؟ ہاں! کسی کو ان کی تقلید نہیں کرنی ہے، تو نہ کرے، اس میں تو کوئی حرج نہیں، وہ کسی اور امام کی کر لے؛ تا کہ اس کا دین قائم و محفوظ رہے؛ لیکن کسی بھی عالم و امام کی توہین و تحقیر کر کے اپنے ایمان کو خراب نہ کرے۔

تقلید کو شرک و کفر قرار دینا بھی تفریط ہے

اور یہ بھی سمجھ لیں کہ ''ترکِ تقلیدِ ائمہ'' بھی دراصل اسی غلو و تقصیر کا افسوس ناک نتیجہ ہے، حال آں کہ جو لوگ تقلید کے منکر ہیں اور تقلید کو شرک کہتے ہیں، وہ بھی لازمی طور پر مختلف چیزوں میں کسی نہ کسی کی تقلید کرتے ہیں۔ جیسے احادیث کی صحت وضعف کے سلسلے میں محدثین کی تقلید بلا چوں و چرا کرتے ہیں؛ نیز ان کے قائم کردہ اصول کے بارے میں ان کی تقلید کو ضروری سمجھتے ہیں؛ مگر جب امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ و دیگر ائمہ کی تقلید کا ذکر آتا ہے، تو اس کو شرک سے تعبیر کرتے ہیں یا کم از کم فسق تو ہے ہی، حتی کہ بعض لوگ تقلیدِ ائمہ کے سلسلے میں قرآن کی ان آیات کو بے موقعہ استعمال کر کے عوام الناس کو دھوکے میں مبتلا کرتے ہیں، جو کفار و مشرکین کے بارے میں آئی ہیں، جیسے یہ آیت:

﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَآ أَنزَلَ اللّٰهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَآءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَّ لَا يَهْتَدُونَ ﴾ (البقرة: ۱۷۰)

(اور جب ان (کفار) سے کہا جاتا ہے کہ تم اس چیز کی اتباع کرو، جو اللہ نے نازل کی ہے، تو وہ کہتے ہیں کہ (نہیں) بل کہ ہم تو اس کی اتباع کریں گے، جس پر اپنے باپ دادوں کو ہم نے پایا ہے (اس کے جواب میں اللہ فرماتے ہیں) کیا اگرچہ ان کے یہ باپ دادا کچھ عقل نہ

رکھتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں؟)

اس آیت میں کفار و مشرکین کی قرآن و حدیث اور حضراتِ انبیا کی شریعتوں کے مقابلے میں ہٹ دھرمی کا ذکر ہے کہ دین پر چلنے کی دعوت دی جاتی ہے، تو اس کے مقابلے میں اپنے کفار و ہدایت سے محروم باپ دادوں کا طریقہ وعمل پیش کرتے ہیں۔غور کیجیے کہ کیا کوئی صحیح الدماغ اس سے یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس میں قرآن و حدیث کے مطابق ہمیں راستہ بتانے والوں، ہدایت یافتہ ائمہ کی اتباع وتقلید سے منع کیا گیا ہے اور یہ کہ اس میں ائمہ کی تقلید کی مذمت کی گئی ہے؟ مگر کس قدر افسوس کی بات ہے! کہ اس آیت کی "تحریفِ معنوی" کرتے ہوئے اس کو تقلیدِ ائمہ پر فٹ کیا جاتا ہے؛ بل کہ ایک جلسے میں ایک محترم نے تو کمال ہی کر دیا کہ آیت:

﴿وَقَالُوۡا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعۡنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوۡنَا السَّبِيۡلَا ، رَبَّنَاۤ اٰتِهِمۡ ضِعۡفَيۡنِ مِنَ الۡعَذَابِ وَالۡعَنۡهُمۡ لَعۡنًا كَبِيۡرًا﴾

(الأحزاب:٦٦-٦٧)

(وہ (کفار) کہیں گے کہ اے پروردگار! ہم نے ہمارے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی، پس انھوں نے ہمیں راستے سے گمراہ کر دیا، اے پروردگار! ان کو دگنا عذاب دیجیے اور ان پر بڑی لعنت بھیجئے!)

اس آیت کو پیش کر کے کہتے ہیں کہ اس سے مراد ائمہ اور ان کے مقلدین ہیں، قیامت میں مقلدین لوگ اپنے ائمہ کے بارے میں یہ بات کہیں گے۔ لَا حَوۡلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰه!! اس پر کتنا بھی افسوس کیا جائے وہ کم ہے!

دونوں تقلیدوں میں واضح فرق موجود ہے، کفار کی تقلید تو جاہلوں و کافروں و ہدایت سے دور لوگوں کی تقلید ہے اور یہ شریعتِ الٰہی کے مقابلے وعین معارضے میں ہے، اس کے برخلاف ائمہ کی تقلید اہلِ علم واہلِ ہدایت کی تقلید ہے اور قرآن وسنت پر

عمل کرنے کے لیے ہے، مقابلے میں نہیں ہے۔ کیا اس قدر واضح فرق کے باوجود کوئی علم کا مدعی ایک کو دوسرے پر قیاس کرسکتا ہے؟

الغرض تقلیدِ ائمہ ایک لازمی وضروری چیز ہے، شرعاً بھی اور طبعاً بھی، حتی کہ خود تارکینِ تقلید کو بھی اس سے مفر نہیں؛ لہٰذا اس کا انکار کرنا بھی وہی غلو فی الدین کا لازمی نتیجہ ہے۔

علما کی تعلیمی وتدریسی وتحقیقی خدمات کی تحقیر

آج کل ایک اور طرح علمائے کرام کی بے توقیری اور ان کے کاموں کی تحقیر کا سلسلہ جاری ہوا ہے، وہ یہ کہ حضراتِ علما جو دینی خدمات انجام دیتے ہیں، مثلاً تعلیم و تعلم، جس میں قرآن وحدیث وفقہ وغیرہ علوم کی تعلیم ہوتی ہے، اس کی یہ کہہ کر تحقیر کی جاتی ہے کہ اس تعلیم وتعلم سے کچھ نہیں ہوتا، مدارس سے کچھ نہیں ہوتا؛ نیز ان کی ضرورت سے انکار تک کیا جاتا ہے۔ یہ غلو فی الدین نہیں تو اور کیا ہے؟

علما و مدارس کے بارے میں اس قسم کے لوگ جن نظریات وخیالات کا اظہار کرتے اور ان کو ناکارہ قرار دیتے اور ان کی افادیت پر سوالیہ نشان لگاتے ہیں، یہ سب حقیقت سے ناواقفیت اور اہلِ علم و مدارس سے دوری کا نتیجہ اور تکبر وغرور کا نشہ ہے۔

ہم ایسے لوگوں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ کی نماز کسی امام کے پیچھے ہوتی ہوگی، یہ امام کس کی دَین ہے؟ تراویح کی نماز میں قرآن کی تلاوت سننے کا شرف ملتا ہوگا، یہ قرآن سنانے والے حفاظ کہاں سے پیدا ہو رہے ہیں؟ آپ کو مسائل جاننے کی ضرورت ہوتی ہے، تو مفتیانِ کرام فتوی دیتے ہیں، یہ کہاں کی پیداوار ہیں؟ بدعات وخرافات سے کون ٹکر لیتا ہے؟ حق کو کون واضح کرتا ہے؟ سنت کی ترویج و

اشاعت کا کام کون کرتا ہے؟ ”امر بالمعروف ونہی عن المنکر“ کی انجام دہی کس طبقے سے ہورہی ہے؟ ملت پر کوئی نازک وقت آتا ہے اور دین پر کوئی حملہ ہوتا ہے، تو وہ کون طبقہ ہے؟ جو تیغِ براں بن کر کھڑا ہوتا ہے؟ دنیا بھر میں اس گئے گزرے دور میں بھی حفاظ وقرا، علما ومفتیان، مفسرین ومحدثین وغیرہ کہاں سے وجود میں آرہے ہیں اور دنیا بھر میں یہ علم کے چرچے اور دین کی رونق، مساجد کی آبادی کا سامان کہاں سے ہورہا ہے؟ کیا اس کا جواب اس کے سوا کچھ اور بھی ہے کہ علما واہلِ مدارس ہی ہیں، جو یہ سب کام انجام دیتے آرہے ہیں اور اہلِ مدارس کا یہ کہنا بالکل بجا ہے :

چراغوں کی لو سے ستاروں کی ضو تک
تجھے ہم ملیں گے جہاں رات ہوگی

کیا کوئی اس کے انکار کی جرأت کرسکتا ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں! تو پھر بات صاف ہے کہ ان مدارس واہلِ مدارس کی تدریسی وتعلیمی، دعوتی واصلاحی خدمات سے بہت کچھ ہی نہیں؛ بل کہ سب کچھ ہورہا ہے۔

اسی طرح علمائے کرام کبھی ضرورتِ شرعی کی بنا پر اہلِ باطل کے رد میں بیان کرتے یا لکھتے ہیں، تو یوں کہہ کر ان کی تحقیر کی جاتی ہے کہ یہ سب امت میں اختلاف وانتشار پیدا کرنے کے کام ہیں، یہ فساد کیا جارہا ہے، اس سے امت ٹوٹ جائے گی وغیرہ، یہ بھی حقیقت سے بے خبری وجہالت کی وجہ سے ”غلو فی الدین“ ہے اور بعض وقت اس کا منشا محض علما سے بغض وتعصب ہوتا ہے۔ اللہ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے۔

نوٹ : احقر نے اپنی کتاب ”امت میں اعتقادی وعملی بگاڑ اور علمائے امت کی ذمے داری“ میں اس موضوع پر خاصا تفصیلی کلام کیا ہے کہ اہلِ حق کا ہمیشہ سے یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ بدعات وخرافات واہلِ بدعت واہلِ باطل کا رد وانکار کرتے رہے

ہیں؛ تاکہ دین اسی شکل میں محفوظ رہے جو محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے امت کے سامنے پیش کیا اور وہ تحریفات وتلبیسات سے پاک رہے اور یہ کہ یہ اہلِ حق کی ایک بڑی نشانی ہے؛ لہٰذا جولوگ اس کو غلط قرار دینے کی احمقانہ کوشش کرتے ہیں، ان کو اپنے دل ودماغ کی اصلاح کر لینی چاہیے۔

مدارسِ اسلامیہ سے معاندانہ سلوک

اسی تفریطی غلو کی ایک دَین یہ ہے کہ بعض لوگ آئے دن مدارسِ اسلامیہ کی شرعی وعرفی حیثیت کو داغ دار بنانے اور ان کے خلاف کیچڑ اچھالنے، ان کی ضرورت واہمیت اور ان کی افادیت ونافعیت پر سوالیہ نشان قائم کرنے اور ان کے نظام وکردار کو درہم برہم کرنے کی شرمناک کوشش کرتے رہتے ہیں۔

سب سے پہلے مدارس کو نشانۂ ملامت وہدفِ تنقید؛ بل کہ ہدفِ تضحیک بنانے کی مہم کا آغاز مغربی لابی اور اسلام دشمن عناصر واخلاق وشرافت سے محروم کچھ بدقسمتوں نے کیا تھا، جن کو مدارس کی عظمت وجلالت اور علمائے مدارس کے وقار وشان نے اور ان کی مساعیٔ جمیلہ کے اسلامی معاشرے میں مؤثر رول وکردار نے حسد وبغض کی نفسیاتی بیماریوں میں اس طرح مبتلا کر دیا تھا کہ وہ ان مدارس اور یہاں کے علما وفضلا کی کردارکشی کی مہم چلانے ہی میں خود کے لیے سامانِ تسلی سمجھنے لگے، جس طرح حاسدین کا عموماً مشغلہ یہی ہوتا ہے۔

پھر ان اسلام دشمن عناصر کی بار بار کی رٹ اور جھوٹے پروپگنڈے سے متأثر ومرعوب ہو کر مسلمانوں میں کا ایک طبقہ، جو بصیرت سے محروم ہونے کے ساتھ ساتھ بصارت سے بھی محروم ہوتا ہے اور اس لیے خود کی آنکھوں اور دل ودماغ کو آزادانہ استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، نہ ہمت؛ اور ہمیشہ غیروں کی آنکھوں اور عقل و

دل سے دیکھنے اور سوچنے کا عادی ہو چکا ہے، وہ بھی اس شرمناک مہم میں ان کے دوش بہ دوش چلنے لگا اور وہی رٹ لگانے اور اسی پروپگنڈہ بازی و انگشت نمائی کا کام کرنے لگا، جو اسلام دشمنوں کا مشغلہ و محبوب عمل تھا۔

اس پروپیگنڈہ مہم میں ان مغربی لابیوں و سامراجی طاقتوں کی ہاں میں ہاں ملانے والے اور ان کے پروپگنڈے کو حقیقتِ واقعیہ سمجھ کر پھیلانے والے دو قسم کے لوگ ہیں: ایک وہ ہیں جو پہلے ہی سے دین و مذہب سے بیزار اور اس کو ایک فرسودہ نظام قرار دیتے، ایک فالتو چیز سمجھتے ہیں اور اس کی ہدایت و رہنمائی کو کسی طرح قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو اسلام کو بہ حیثیت ایک دین و مذہب تسلیم کرتے ہیں اور اس کو ایک حد تک اپنی زندگی میں نافذ بھی کرتے ہیں؛ لیکن اسی کے ساتھ مغربی افکار و نظریات نے ان کو اس قدر مرعوب کر رکھا ہے کہ ان کی سوچ و فکر سب ان ہی افکار و نظریات پر مبنی ہوتی ہے، وہ اس کے خلاف سوچ نہیں سکتے اور نہ اس کے خلاف بولنے کی ان کو ہمت ہوتی ہے۔ اب یہ لوگ مدارس کے خلاف اس مہم میں اسلام دشمنی ہی کے لیے شامل ہو گئے ہیں یا محض اسلام دشمنوں کی بلا سوچے سمجھے تقلید کرتے ہیں؟ یہ تو میں نہیں جانتا، تاہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان حضرات کے بارے میں حسنِ ظن تو یہی ہے کہ یہ حضرات اسلام دشمن عناصر کی چالاکی و مکاری سے ناواقفیت کی وجہ سے اور ان کی اس مہم کے خطرناک نتائج سے بے خبری کی بنا پر اس کو فروغ دینے میں مشغول ہیں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ تاریخی وثائق نے ہم تک پوری ذمے داری سے یہ شہادت پہنچائی ہے کہ اہلِ اسلام کی بساط الٹنے، مسلم سماج کو تباہی کا نشانہ بنانے اور ملت کے سرسبز و شاداب درخت کو اجاڑنے کے لیے اسلام دشمن عناصر نے ہمیشہ اس کی کوشش کی ہے کہ علمائے اسلام و مسلم عوام کے آپسی روابط و تعلقات ختم ہو جائیں اور علما پر

عوام کا اعتماد برقرار نہ رہے اور اس مقصد میں کامیابی کے لیے جو ہتھیار استعمال کیا گیا، وہ یہ تھا کہ علما و فضلائے مدارس کی اور خود مدارسِ اسلامیہ کی توہین و تحقیر کی اور ان کو بدنام کرنے کے نت نئے طریقے اختیار کیے اور تشہیری مہم کے ذریعے یہ باور کرانے کی زبردست کوشش کی گئی کہ یہ مدارس دہشت گردی کے اڈے ہیں اور وہاں کے علما دہشت گرد اور ملک و ملت کے غدار ہیں، نیز یہ دقیانوسیت کے علم بردار ہیں، تاریک خیالی و تنگ نظری کے شکار ہیں، ملک و ملت کے کسی کام کے نہیں، تہذیب و تمدن سے عاری اور سماج پر ایک بھاری بوجھ ہیں؛ لہٰذا مدارس کی امداد و تائید سے دست کش ہو جانا چاہیے۔

مگر ظاہر ہے کہ اس مہم کو وہ اس قدر آسانی سے سر نہیں کر سکتے تھے؛ اس لیے انھوں نے مدارس کی تعلیم اور وہاں کے نظام، وہاں کے نصاب، وہاں کے طریقۂ کار سب کو مشکوک بنانے کی سعیٔ لاحاصل شروع کر دی اور یہ کہا جانے لگا کہ مدارس کی تعلیم امت کے لیے ایک بے فائدہ تعلیم ہے؛ کیوں کہ اس سے نہ کوئی ڈاکٹر و انجینئر تیار ہوتا ہے، نہ کوئی ماہر اقتصادیات سامنے آتا ہے، نہ کوئی سیاسی سمجھ بوجھ کے افراد پیش ہوتے ہیں، نہ ان لوگوں کو انگریزی زبان آتی ہے، نہ وہ موجود آرٹ سے واقف ہوتے ہیں؛ لہٰذا صرف قرآن و حدیث پڑھنے سے کیا فائدہ اور اس سے امت کو کیا نفع؟

یہ وہ خیالات ہیں، جو آئے دن اخبارات کی زینت بن کر اسلامی ماحول کو متعفن و عوام الناس کے دل و دماغ کو پراگندہ و منتشر کرتے رہتے ہیں۔

مغربی طاقتوں کی مدارس کے خلاف مہم کی وجہ؟

اب رہا یہ سوال کہ مغربی طاقتوں نے مدارس کے خلاف یہ مہم کیوں چلائی ہے،

جس میں شعوری و غیر شعوری طور پر یہ مغرب زدہ لوگ شامل ہو گئے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ برِ صغیر میں مغربی و سامراجی طاقتوں کو توڑنے اور اس کے اثر و نفاذ کو روکنے میں ان مدارس نے جو انتہائی مؤثر ترین رول انجام دیا ہے، وہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے کہ اس کا کوئی منصف انکار نہیں کرسکتا، چناں چہ جہاں جہاں یہ مدارس موجود تھے اور جہاں جہاں علمائے اسلام موجود تھے، وہاں وہاں مغربی سیلاب کی ایسی مزاحمت ہوئی اور اس کی راہ میں وہ رکاوٹ پیدا ہوئی، جس کا ان مغربی لابیوں کو شاید پہلے سے کوئی اندازہ نہیں تھا؛ اسی لیے برِ صغیر ساری دنیا میں وہ واحد خطہ ہے، جہاں مغربی اثر و نفوذ سب سے کم ہوا ہے؛ لہٰذا یہ مدارس ان کی آنکھ کا کانٹا بن گئے اور وہ ان کے خلاف پروپگنڈہ مہم چلانے ہی میں اپنی کامیابی تصور کرنے لگے؛ کیوں کہ ان کو یہ تو معلوم تھا کہ اس پروپیگنڈے کا اثر اتنا تو ہوگا کہ خود مسلمان قوم میں سے کچھ لوگ اس سے متاثر و مرعوب ہو کر ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں گے اور یہی ہوا بھی جیسا کہ عرض کیا جاچکا۔ یہ ہے وہ اصلی وجہ، جس کی وجہ سے مدارس کو بدنام کرنے اور ان کو کبھی دہشت گردی کے اڈے قرار دینے اور کبھی بے مصرف و فضول باور کرانے، کبھی یہاں کے نصاب و نظام کو فرسودہ دور کے یادگار ٹھہرانے اور کبھی یہاں کے علما و فضلا کو دقیانوسی و تاریک خیال و تنگ نظر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مدارس کا اصلی رول

مگر یاد رکھنا چاہیے کہ یہ سب باتیں محض ناواقفیت کی بنیاد پر کہی جاتی ہیں یا ان کی بنا تعصب و عناد ہے، اگر تعصب کی عینک نکال کر اور حقیقت شناسی کی نیت سے مدارس کا جائزہ لیا جائے؛ تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ مدارس کا اصلی کام اور حقیقی

مقصد کیا ہے جس میں الحمدللہ وہ کامیابی کی شاہراہ پر گامزن ہیں؟ ہم مدارس کے اس کام ومقصد کو یہاں چند نمبروں میں بیان کرتے ہیں:

(۱) طالبینِ علوم کو سرچشمۂ علوم وحکم یعنی کتاب اللہ وسنت رسول اللہ سے بہ راہِ راست واقف کرنا؛ تاکہ وہ علومِ الٰہیہ وحکمتِ شرعیہ سے پوری طرح باخبر ہوں اور پھر اپنی زندگیوں میں اس کو خود پر بھی اور اپنے سماج میں بھی نافذ کریں اور ان علوم میں علمِ تجوید وقرأت، تفسیرِ قرآن، اصولِ تفسیر، حدیث اور اصولِ حدیث، علمِ کلام وعقائد، فقہ واصولِ فقہ، تاریخِ اسلامی وسیرتِ نبوی داخل ہیں۔

(۲) علومِ نبوت سے ملحق ومنسلک دیگر علوم جیسے علومِ عربیہ: علمِ صرف، علمِ نحو، علمِ اشتقاق، علمِ بلاغت، علمِ بیان، علمِ بدیع وغیرہ کی تعلیم کے ذریعے علم میں مہارت واختصاص پیدا کیا جائے؛ تاکہ دینی علوم کو کماحقہ سمجھا وعمل کیا جائے۔

(۳) مذکورہ بالا علومِ اسلامیہ کی حفاظت کرتے ہوئے، ان میں تحقیق وترقی کی جائے اور ان کے مختلف شعبوں کو تقاضائے وقت اور ضرورتِ زمانہ کے لحاظ سے پیش کیا جائے؛ تاکہ ایک جانب یہ علوم جو انسانی ہدایت کے لیے نازل ہوئے ہیں، امت میں برابر محفوظ رہیں اور دوسری جانب مختلف زمانوں وظروف واحوال میں وہ قابلِ فہم ولائقِ استفادہ رہیں۔

(۴) قرآن وسنت کی معتبر تفسیر ومستند تشریح (جو حضراتِ صحابہ وتابعین وائمۂ اسلاف سے منقول چلی آرہی ہے اور اسی پر انسانی ہدایت کا مدار ہے) کا سلسلہ جاری وساری رہے اور قرآن وسنت کے علوم نااہلوں وناقصوں کی دست برد و من مانی وخود رائی تفسیر وتشریح سے محفوظ رہ سکیں اور کوئی نااہل وناقص، قرآن وسنت کی من مانی تفسیر وتشریح کی جرأت نہ کرے اور اگر کوئی کرے؛ تو ان مدارس کے فضلا وعلما، جو علومِ اسلامیہ کے چوکیدار و پہرے دار ہیں، وہ اپنا فرض انجام دیتے ہوئے ان

نااہلوں وناقصوں کی اس سلسلے میں نااہلی کا پردہ چاک کریں اور امت کو حقائق سے آگاہ کریں۔

(۵) سماج و معاشرے سے جہالت کو دور کرتے ہوئے جہالت کی مختلف پیداواروں جیسے لادینیت واباحیت، خدابیزاری و مادہ پرستی، الحادوزندقہ، کفروشرک، خدائی قانون سے بغاوت وسرکشی وغیرہ کا قلع قمع کیا جائے اور ان کے بہ جائے قانونِ خداوندی واحکامِ شرعیہ سے سماج و معاشرے کے لوگوں کو واقف کرایا جائے اور ان میں علم وعمل، خداپرستی وخداشناسی، توحید شعاری وجذبۂ اطاعت وفرماں برداری اور حقائق پر ایمان ویقین کی صفات پیدا کی جائیں۔

(۶) اصلاحی و دعوتی ذرائع میں سے حسب موقعہ ومحل حکمت وموعظت کے اصول پر امت کے افراد میں ایک جانب تعلق مع اللہ کو مضبوط کرنے کے لیے اخلاص وللّٰہیت، نیکی وخوبی، امانت ودیانت داری، عفت و پاک دامنی، صلاح وتقوی شعاری، انصاف وحق پرستی، خوف وخشیت، خشوع وانابت، اعمالِ صالحہ کی پابندی، حلال وحرام کی تمیز، اچھے وبرے کا فرق وغیرہ اوصاف پیدا کیے جائیں اور دوسری طرف مخلوقِ خدا کے ساتھ معاملے کو صحیح کرنے کے لیے بڑوں اور چھوٹوں کے حقوق کی معرفت، امن وامان کے قیام کی فکر، ظلم وجور کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت، حق داروں کو حق دلانے اور ظالموں کو ان کے کیفرکردار تک پہنچانے کے لیے جدوجہد وغیرہ کمالاتِ انسانی کا حامل بنائیں۔

(۷) مذکورہ اصلاحی ودعوتی کاموں اور خدمتوں کے لیے علما وفضلا کی ایک ایسی جماعت تیار کی جائے، جو ایک جانب خود کو داعیانہ اوصاف وخصوصیات سے آراستہ و پیراستہ کرے اور دوسری جانب وہ امت کی ذہن سازی واصلاح وتزکیہ کے لیے بھرپور کوشش کرے۔

(۸) اسلام دشمنوں اور حق ناشناس لوگوں اور اہلِ باطل کی جانب سے اسلام کے خلاف اٹھائے جانے والے شکوک وشبہات کا معقول و مدلل جواب دینے، گمراہ کن تحریکات کی کاٹ کرنے، علمی و عملی بساط پر لوگوں کو بہکانے کے لیے اٹھنے والی باطل آوازوں کا مقابلہ کرنے، بدعات و رسومات کو جاری کر کے کتاب و سنت کی پاکیزہ تعلیمات کا حلیہ بگاڑنے والوں کی ہمت شکنی و جواب دہی کے لیے اور حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کرنے کے لیے ایک ایسے فکرمند و ہمت بلند، علم و عمل کے ہتھیار سے لیس طبقے کو تیار کیا جائے، جو ان تمام فتنوں کا بروقت مقابلہ کر کے اسلام کے چہرے کو مسخ ہونے سے بچاتا رہے۔

(۹) ان سب امور میں اس بات کا لحاظ کہ یہاں سے نکلنے والی علما و فضلا کی جماعت دین کی بے لوث خادم بنے، اس کی نگاہ مال و دولت پر نہیں؛ بل کہ اللہ پر ہو، وہ دین کا کام محض اللہ کی رضا کے لیے کرے، اس کے پیشِ نظر آخرت کی فلاح مندیاں ہوں، نہ کہ دنیا کی کامیابیاں۔

ان سب کا خلاصہ اگر ان الفاظ میں بیان کروں تو صحیح ہے کہ مدارس دراصل ایسی فیکٹریاں ہیں، جہاں انسان کو انسان بنانے کی تحریکات و کوششیں ہوتی ہیں، جہاں شرافت کی قدروں اور انسانیت کے پیمانوں کو تیار کیا جاتا ہے اور انسانوں کو ان میں ڈھالا جاتا ہے، جس سے وہ ایک جانب اپنے مالکِ حقیقی کی معرفت سے معمور ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف اللہ کی مخلوق کے ساتھ ہمدردی و غمخواری، عدل و انصاف، پیار و محبت، اس کی خدمت و ادائے حقوق وغیرہ کی صفات سے ممتاز ہو جاتے ہیں۔

یہ چند اہم نکات ہیں، جن کے ضمن میں مدارس کے کام اور ان کے امت و معاشرے کے درمیان کلیدی رول کا ایک خاکہ اگر کوئی انصاف پسند چاہے، تو اخذ کر

سکتا ہے۔

مدارس نے کیا کیا اور کیا کرتے ہیں؟

اگر اب بھی کوئی پوچھتا ہے کہ مدارس نے کیا کیا اور کیا کرتے ہیں؟ تو ہمیں کہنے دیجیے کہ مدرسہ علما و فضلا کی ایک ایسی بے لوث جماعت تیار کرتا ہے، جو بے سروسامانی و کسمپرسی کے باوجود اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی کی خاطر تمام تر مشقتیں و پریشانیاں برداشت کرتے ہوئے دین و ملت کی خدمات میں ہمہ تن مصروف کار رہتی ہے۔ ان ہی بے لوث خدام کی ان تھک محنتوں و کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہزارہا مخالفتوں اور بے پناہ سازشی چالوں کے باوجود اسلام بھی زندہ ہے اور مسلمان بھی بہ حیثیتِ ملت زندہ ہیں، معاشرے میں دین کے احکامات، قرآن و سنت کی تعلیمات کا چرچا ہے، انصاف و حق کی آواز لگائی جا رہی ہے، عفت و عصمت کا درس ہو رہا ہے، حلال و حرام کی تمیز کی جا رہی ہے، باطل سے نبرد آزمائی ہو رہی ہے اور دینِ اسلام کو خون کی ضرورت پڑے ؛تو خون اور صلاحیتوں کی ضرورت پڑے؛ تو صلاحیتوں کی قربانی دی جا رہی ہے، ملتِ اسلامیہ پر جب جب بھی کوئی آزمائش و امتحان کا موقعہ آیا، سخت حالات سے وہ دوچار ہوئی ، اسلام مخالف تحریکات و عناصر کی معاندانہ سرگرمیوں کا اس کو ہدف بننا پڑا، تب یہی بوریہ نشین اور قدیم نظامِ تعلیم کے ساختہ پرداختہ علما و فضلا میدان میں نظر آئے اور صبر و استقامت ، ہمت و شجاعت ، پامردی و عزیمت کے جوہر دکھاتے ہوئے ملت کی رہبری و رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے اور یہ جماعت یہ سب کچھ انتہائی معمولی تنخواہوں پر انجام دیتی ہے کہ اگر امت ان سارے کاموں کی انجام دہی پر مال و دولت کے خرچ کرنے کی مکلّف قرار دی جائے ،تو شاید ہی وہ اس قدر خرچ کرتی اور وہ کام انجام پاتے۔

حضرت مولانا ابو الحسن علی میاں صاحب ندوی رحمہ اللہ کا ایک بیان نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، جو مدرسوں کی حقیقت واصلیت اور اسی کے ساتھ ان کے کام وطریق پر پوری طرح روشنی ڈالتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

''میں مدرسے کو پڑھنے پڑھانے اور پڑھا لکھا انسان بنانے کا کارخانہ نہیں سمجھتا، میں مدرسے کی اس حیثیت کو تسلیم کرنے تیار نہیں ہوں، میں اس سطح پر آنے کو تیار نہیں ہوں کہ مدرسہ اسی طریقے سے پڑھنا لکھنا سکھانے یا یوں کہنا چاہیے کہ پڑھنے لکھنے کا ہنر سکھانے کا ایک مرکز ہے، جیسے کہ دوسرے اسکول اور کالج ہیں، میں اس کو مدرسے کے لیے ازالۂ حیثیتِ عرفی کے مرادف سمجھتا ہوں یعنی اگر میں مدرسے کا وکیل ہوں یا میں خود مدرسہ بن جاؤں، تو میں اس پر ازالۂ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ قائم کر سکتا ہوں، اگر کوئی مدرسے کو صرف اتنا حق دینے اور مدرسے کو صرف اتنا ماننے کے لیے تیار ہے کہ ''صاحب! جیسے پڑھنے لکھنے کا ہنر سکھانے کے لیے بہت سے کارخانے ہیں، بہت سے مرکز ہیں، کوئی اسکول کہلاتے ہیں، کوئی کالج کہلاتے ہیں، ان کے مختلف معیار اور مختلف سطحیں ہیں، اسی طریقے سے مدرسے بھی عربی زبان یا عربی فنون، فقہ اور دینیات، تفسیر یا حدیث سکھانے کا ایک مرکز یا کارخانہ ہے۔

میں مدرسے کو نائبینِ رسول و خلافتِ الٰہی کا فرض انجام دینے والے اور انسانیت کو ہدایت کا پیغام دینے والے اور انسانیت کو اپنا تحفظ وبقا کا راستہ دکھانے والے افراد پیدا کرنے والوں کا ایک مرکز سمجھتا ہوں، میں مدرسے کو آدم گری اور مردم سازی کا ایک کارخانہ سمجھتا ہوں۔'' (۱)

---

(۱) بہ حوالۂ میر کارواں: ۱۷۲:۲

آپ نے اپنی ایک تقریر میں مدرسے کی ذمے داریوں کو بیان کرتے ہوئے بڑی صاف وواضح بات فرمائی ہے، کہتے ہیں:

”مدرسے سے بڑھ کر دنیا میں کونسا زندہ، متحرک اور مصروف ادارہ ہو سکتا ہے؟ زندگی کے مسائل بے شمار، زندگی کے تغیرات بے شمار، زندگی کی ضرورتیں بے شمار، زندگی کی غلطیاں بے شمار، زندگی کی لغزشیں بے شمار، زندگی کے فریب بے شمار، زندگی کے رہزن بے شمار، زندگی کی تمنائیں بے شمار، زندگی کے حوصلے بے شمار۔ مدرسے نے جب زندگی کی رہنمائی اور دستگیری کا ذمہ لیا، تو اسے اب فرصت کہاں؟ دنیا میں ہر ادارہ، ہر مرکز، ہر فرد کو راحت اور فراغت کا حق ہے، اس کو اپنے کام سے چھٹی مل سکتی ہے؛ مگر مدرسے کو چھٹی نہیں، دنیا میں ہر مسافر کے لیے آرام ہے؛ لیکن اس مسافر کے لیے راحت حرام ہے، اگر زندگی میں ٹھہراؤ ہو، سکون اور وقوف ہو تو حرج نہیں کہ مدرسہ بھی چلتے چلتے دم لے لے؛ لیکن جب زندگی رواں اور دواں ہے، تو مدرسے میں جمود اور تعطل کی گنجائش کہاں ہے؟ اس کو قدم قدم پر زندگی کا جائزہ لینا ہے، بدلتے ہوئے حالات میں احکام دینے ہیں، نئے نئے فتنوں کا مقابلہ کرنا ہے، بھٹکے ہوئے قدموں کو راستے پر لگانا ہے، ڈگمگاتے ہوئے پیروں کو جمانا ہے، وہ زندگی سے رہ جائے یا تھک کر بیٹھ جائے یا کسی منزل پر قیام کرے یا اس کو کوئی مقام خوش آجائے، تو زندگی کی رفاقت اور قیادت کون کرے، سرودِ ازلی اور پیغامِ محمدی اسے کون سنائے؟ مدرسہ کا تعطل، قیادت سے کنارہ کشی، کسی منزل پر قیام، خودکشی کا مترادف اور انسانیت کے ساتھ بے وفائی کا ہم معنی ہے اور کوئی خود

شناس اور فرض آشنا مدرسہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"(۱)

امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی رحمہ اللہ نے ہفت روزہ "الجمعیۃ" کے "دینی مدارس نمبر" میں اپنا ایک پیغام بھیجا، اس میں آپ فرماتے ہیں:

"دینی مدارس دین وشریعت اور انسانیت کی حفاظت کے لیے مضبوط قلعے کی حیثیت رکھتے ہیں، یہ مدارس جہاں غریب اور معاشی طور پر کمزور طبقات کے بچوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے میں اہم رول ادا کر رہے ہیں، وہیں ملک سے ناخواندگی دور کرنے میں بھی معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ ان میں جو نصابِ تعلیم رائج ہے، وہ انسان سازی، اچھے ذمے دار اور ایمان دار شہری بننے کی تحریک پیدا کرتا ہے۔ اس میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ ہمارے مدارس ایک مخصوص شناخت اور ایسے نظام کے تحت زندگی گزارنے پر زور دیتے ہیں، جس میں دنیا اور آخرت دونوں میں جواب دہی کا تصور پایا جاتا ہے۔ اسی سبب سے اسلام اور مسلمانوں کے دشمن اپنے حملے کا نشانہ سب سے پہلے مدارس اور ان کے فیض یافتگان کو بناتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسپین سے مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں ایک اہم ترین سبب یہ تھا کہ وہاں سے مدارس کا نظام ختم یا کمزور ہو گیا تھا، اس کے پیشِ نظر دینی شعائر اور دینی شناخت کے تحفظ کے واسطے ضروری ہے کہ مدارس کے نظام، ان کے آزادانہ کردار اور نصاب کو اپنی اصل ہیئت وشکل میں باقی رکھا جائے۔"(۲)

---

(۱) پاجا سراغ زندگی: ۹۱

(۲) الجمعیۃ کا دینی مدارس نمبر: ۴

مدارس کے بارے میں حقیقت پسند دانشوران کی رائے

مدارس کی حقیقت ونوعیت اوران کا کام اور پیغام، جن حقیقت پسند دانشورانِ قوم اور انصاف پسند اہلِ نظر کی نظر میں آیا، انھوں نے مدارس کی اہمیت وضرورت کو محسوس کیا ہے اور اس کا برملا اعلان کیا ہے۔

روشن خیال مفکر، شاعرِ مشرق علامہ اقبال رَحِمَہُ اللّٰہُ کی رائے ان مدارس کے بارے میں کیا تھی؟ یہ سن لیجیے! ان کے ایک متعلق حکیم شجاع نے اپنی کتاب ''خون بہا'' میں لکھا ہے کہ لاہور میں آکر پاک پٹن شریف کے مسلمانوں کی نفسیاتی روداد ڈاکٹر اقبال رَحِمَہُ اللّٰہُ کو سنائی، تو عادت کے مطابق سنتے رہے۔ جب میں اپنی کہانی سنا چکا، تو فرمایا:

> ''جب میں تمھاری طرح جوان تھا، تو میرے قلب کی کیفیت کچھ ایسی ہی تھی اور میں وہی کچھ چاہتا تھا، جو تم چاہتے ہو۔ انقلاب! ایک ایسا انقلاب، جو ہندوستان کے مسلمانوں کو مغرب کی مہذب قوم اور متمدن قوموں کے دوش بہ دوش کھڑا کردیں؛ مگر اب میرے سوچنے کا انداز بدل گیا ہے اور میں کہتا ہوں: ان مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انہیں مدارس میں پڑھنے دو، اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا میں انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، اگر ہندوستانی مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم ہوگئے، تو بالکل اسی طرح ہوگا جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج ''غرناطہ'' اور ''قرطبہ'' کے کھنڈرات اور الحمرا کے نشانات کے سوا، اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان

میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلی کے لال قلعے کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اوران کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔‘‘(۱)

کراچی سے شائع ہونے والے ہفت روزہ ’’وجود‘‘ کے اڈیٹر جناب محمد طاہر صاحب، مدارس پر ایک صاحب کی تنقید کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’دینی مدارس خواہ وہ کسی مکتبِ فکر کے ہوں، اپنے تمام انحطاط اور زوال کے باوجود اس امت کا قیمتی سرمایہ ہیں ، ان مدارس نے ہنگاموں، بحرانوں اور روشنی سے محروم دنوں میں بھی اپنے وجود کے ذریعے اس امت کی نمود کا فریضہ انجام دیا ہے، ان دینی مدارس کے معیار اور کارکردگی کا موازنہ اگر سرکاری سرپرستی میں چلنے والی پاکستانی جامعات کی شعبۂ عربی وشعبۂ اسلامیات سے کیا جائے، تو حقیقتِ حال خود روشن ہو جاتی ہے، جامعات میں تمام جدید سہولتیں، مراعات، تنخواہیں اور وظیفے حاصل کرنے والے اساتذہ کی تحقیقی مطبوعات کا موازنہ اگر ان غیر سرکاری دینی مدارس کے اساتذہ کی مطبوعات سے کیا جائے؛ تو صورت حال خود بہ خود روشن ہو جاتی ہے۔ گزشتہ پچاس سالوں میں پاکستان کی جامعات سے وابستہ عربی و اسلامیات کے پروفیسر صاحبان کی کل تصانیف کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہیں ہے، ان میں ستر فی صد سے زیادہ تصانیف اردو میں ہیں اور علمی طور پر ان کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ اس کے برعکس دینی مدارس جو بغیر کسی سرکاری سرپرستی و امداد کے چل رہے ہیں، ان سے وابستہ بوریا نشین علما نے پچاس سال کے عرصے میں پچاس ہزار سے زیادہ کتابیں عربی، فارسی،

(۱) بہ حوالہ الجمعیۃ کا دینی مدارس نمبر:۱۲

انگریزی اور اردو میں تحریر کی ہیں۔ یہ علما جو نہایت سادہ زندگی بسر کرتے رہے اور جن کی ضروریات زندگی بھی بہ مشکل پوری ہوتی تھی، ان کا علمی کام سرکاری جامعات میں دنیا کی تمام سہولتیں سمیٹ لینے والے اساتذہ سے ہزاروں گنا بہتر رہا۔"(۱)

ایک انگریز جاسوس "جان پامر" نے جو انگریزی دور میں صوبہ یوپی کے گورنر "سر جان اسٹریچی" کی طرف سے دارالعلوم میں خفیہ تحقیقات کے لیے بھیجا گیا تھا، اس نے اپنے ایک دوست کو پوری تفصیل کے ساتھ وہاں کی تعلیمی و تربیتی سرگرمیوں اور وہاں کے طرزِ معاشرت اور اخلاق و تہذیب کے احوال ایک خط میں لکھنے کے بعد اخیر میں لکھا:

"میری تحقیقات کے نتائج یہ ہیں کہ یہاں (دارالعلوم دیوبند) کے لوگ تعلیم یافتہ، نیک چلن اور نہایت سلیم الطبع ہیں، کوئی ضروری فن ایسا نہیں، جو یہاں نہ پڑھایا جاتا ہو، جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں کے صرفے سے ہوتا ہے، وہ یہاں ایک مولوی چالیس روپے میں کر رہا ہے، مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر کوئی تعلیم گاہ نہیں ہوسکتی اور میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی غیر مسلمان بھی یہاں تعلیم پائے، تو نفع سے خالی نہیں، انگلستان میں اندھوں کا اسکول سنا تھا؛ مگر یہاں آنکھوں سے دیکھا کہ دو اندھے تحریرِ اقلیدس کی شکلیں کفِ دست پر اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ شاید و باید، مجھے افسوس ہے کہ آج "سر ولیم میور" موجود نہیں ہیں؛ ورنہ بہ کمالِ ذوق و شوق اس مدرسے کو دیکھتے اور طلبہ کو انعام دیتے۔"(۲)

---

(۱) بہ حوالہ "دینی مدارس کی ضرورت و اہمیت" از ابن الحسن عباسی: ۵۱

(۲) تاریخِ دارالعلوم دیوبند: ۱/۱۸۰-۱۸۱

مدارس کے بارے میں چند شبہات کا جواب

اب آیئے! یہ بھی جائزہ لیتے چلیں کہ مدارس کو نشانۂ ملامت وہدفِ تنقید بنانے والے لوگ، جو اعتراضات کرتے ہیں، ان کی کیا حیثیت ہے؟ اگر چہ کہ اعتراضات وشبہات تو ان لوگوں کے بہت ہیں؛ مگر یہاں اہم وموٹے موٹے شبہات کا ذکر کر کے ان کے جوابات دیے جاتے ہیں:

ایک عام شبہ مدارس کی تعلیم پر یہ کیا جاتا ہے کہ اس تعلیم سے عالم وفاضل، حافظ و قاری ہی بنتے ہیں، یہاں سے کوئی ڈاکٹر، انجینئر، سائنس داں و سیاست داں پیدا نہیں ہوتا، پھر یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ یہاں کی تعلیم میں ایسے اسباق بھی شامل تدریس کرنا چاہیے کہ عالم و فاضل ہونے کے ساتھ دیگر علوم وفنون کے ماہر بھی پیدا ہوں۔

یہ اعتراض و شبہ فی الحقیقت دینی مدارس کے نظام و مقصد سے ناواقفیت و جہالت کے سبب پیدا ہوا ہے، اگر یہ حضرات یہ جانتے کہ مدارس کا وجود کس پس منظر میں اور کس مقصد کے تحت ہوا ہے؟ تو شاید یہ اعتراض انھیں نہ ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب ہندوستان میں انگریزی حکومت نے اپنے پنجے جما لیے اور نت نئے طریقوں سے مسلمانوں اور ان کے مذہب کے خلاف اسکیمیں بنائیں اور ان ہی اسکیموں میں سے ایک خطرناک اسکیم یہ بھی تھی کہ ''لارڈ میکالے'' کے نظریۂ تعلیم کے مطابق مغربی طرز تعلیم کو جبراً نافذ کیا جائے، جس کا مقصد ہی خود ''میکالے'' کے مطابق یہ ہے کہ ''ایک ایسا طبقہ پیدا کیا جائے، جو رنگ ونسل کے لحاظ سے تو ہندی نژاد ہو؛ مگر فکر وخیال کے لحاظ سے انگریز ہو'' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اہلِ اسلام کو اسلام سے دور کر دیا جائے، درحقیقت یہ ایک سازش تھی اسلام واہلِ اسلام

کے خلاف جس کو اہلِ عقل وارباب علم نے سمجھ لیا تھا۔ اقبال نے اسی کو کہا ہے :

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

دوسری جانب انگریزی حکومت نے مسلمانوں سے مراعات ختم کردیں، ان کے قاضیوں کو بے دخل کردیا، جس کے نتیجے میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بڑے خطرات پیدا ہو گئے اور عوام کا ایک طبقہ مراعات کے حصول کی خاطر مغربی نظامِ تعلیم کی جانب لپکنے لگا کہ اسی میں ان کو اپنی دنیوی فلاح مندیاں نظر آنے لگیں؛ مگر وہ یہ بھول گئے کہ اس سے وہ دنیوی فلاح مندیاں تو حاصل کرلیں گے؛ لیکن ان کا ایمان خطرے میں پڑ جائے گا؛ کیوں کہ خود "میکالے" نے واضح طور پر یہ راز کھول دیا ہے کہ مقصد انگریزی ذہن پیدا کردینا ہے۔

اقبال رحمہ اللہ جیسے صاحبِ نظر نے جو خود ان ہی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نرم وگرم چشیدہ تھے اور وہاں کے حالات کا بہ خوبی معائنہ کیا تھا، انھوں نے اس خطرے کو جب واقعہ بنتے دیکھا تو کہا:

ہم سمجھے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

الغرض جب دنیا داروں، مال داروں اور رئیسوں نے مغربی تعلیم کو ترجیح دی، تو حضراتِ علما نے اس دیس میں دینی تعلیم کو زندہ رکھنے کے واسطے مدارس قائم فرمائے؛ تاکہ یہاں بسنے والوں کا دینی مستقبل تاریک نہ ہو جائے اور دینی تعلیم بھی اور دین بھی زندہ رہے، جس پر انسان کی نجات کا مدار ہے، الغرض ان علما نے دنیا والوں کو دنیا حاصل کرنے کے لیے چھوڑ کر اسلامی علوم وفنون اور دین کے بقا وتحفظ کے لیے مدارس کا قیام فرمایا اور ان کا ایک جال بچھا دیا۔

اس پس منظر میں غور کیجیے کہ مدارس کو یہ مشورہ دینا کہ "وہ مدارس میں دنیوی تعلیم بھی جاری کریں اور یہاں سے بھی ڈاکٹر وانجینئر تیار کریں" اور یہ کہنا کہ "اگر ایسا نہ کیا گیا، تو یہ مدارس بے کار ہیں" کسی مجنون کی بڑ سے زیادہ کیا حیثیت رکھتا ہے؟

مدارس کا قیام مسلمانوں کے دین و شریعت کے بقا و تحفظ کے لیے ہوا ہے، اسلامی علوم وفنون کی خاطر ہوا ہے اور اس لیے کہ یہاں سے ایسے رجالِ کار تیار ہوں، جو اسلامی علوم وفنون میں ماہرانہ بصیرت کے حامل ہوں اور وہ معاشی فلاح مندیوں کے لیے نہیں، اخروی فلاح مندیوں کے لیے جئیں اور امت و سماج کی اصلاح و تربیت اور ان کو اسلامی علوم وفنون سے آراستہ کرتے رہیں۔ یہاں سے بھی اگر ڈاکٹر وانجینئر و دیگر دنیوی علوم کے ماہر ہی پیدا کرنا ہے، تو کیا اس کے لیے کالج وعصری دانش گاہیں موجود نہیں ہیں؟ جب ہیں تو علما بھی اسی کام کو کیوں کریں؟

اور رہا ان لوگوں کا یہ کہنا کہ "اگر یہ عصری علوم وفنون مدارس میں نہ پڑھائے جائیں تو یہ بے کار وفضول ہیں۔" یہ قول وخیال عقلاً وشرعاً دونوں طرح باطل و غلط ہے؛ شرعاً غلط ہونا تو اس قدر بدیہی ہے کہ کسی تبصرے کا محتاج نہیں۔ ہم ان لوگوں سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا امت کو صرف ڈاکٹر وانجینئر و دنیوی علوم وفنون کے ماہروں کی ضرورت ہے؟ اور حافظ وقاری، عالم و فاضل، فقیہ ومفتی، مفسر ومحدث، داعی و مبلغ کی ضرورت نہیں ہے؟ اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ ضرورت نہیں، تو پھر آپ کو سب سے پہلے اپنے ایمان کی خیر منانا چاہیے؛ کیوں کہ آپ کے نزدیک گویا دین وعلومِ دین کی ضرورت نہیں ہے اور جو یہ نظریہ رکھتا ہے، اس کا تو ایمان ہی مشکوک ہے۔

اگر مدارسِ اسلامیہ صرف علما وحفاظ وقرا اور علمِ تفسیر وحدیث اور علمِ فقہ وکلام کے ماہرین پیدا کریں، تو یہ امت کی وہ ضرورت ہے کہ جس کے بغیر چارہ نہیں؛ کیوں کہ امت کو ان سارے علوم وفنونِ اسلامیہ کے ماہرین کی ضرورت ہے؛ تاکہ ان کا دینی

ڈھانچہ اور دینی مزاج و رنگ باقی رہے اور ان کی دینی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ جو لوگ اس کو ضرورت ہی نہیں مانتے وہ دراصل دین ہی کو ضروری نہیں مانتے؛ لہٰذا ان سے تو کلام و گفتگو دین کی ضرورت پر ہونی چاہیے؛ تاکہ پہلے وہ اس کو تسلیم کرلیں، پھر مدارس کا مسئلہ طے ہو۔

اور عقلاً اس لیے غلط ہے کہ ایک ادارہ جس مقصد کے تحت قائم ہوا ہے، اس کو اس کے علاوہ دوسرے مقاصد کی جانب متوجہ کرنا اور دیگر مقاصد کو داخل کرنے کا مشورہ دینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی مڈیکل کالج والوں کو مشورہ دے کہ آپ اپنے کالج میں طلبہ کے لیے انجینئرنگ کا نظام بھی قائم کیجیے اور انجینئرنگ کالج کے ذمے داروں کو یہ مشورہ دیا جائے کہ آپ کے یہاں سے ڈاکٹر بھی بننا چاہیے، اگر ایسا نہیں، تو آپ کا کالج بے کار ہے۔ کیا کوئی عقل مند انسان اس مشورے کو عقل و دیانت کا تقاضا سمجھے گا یا بے عقلی و ناتجربے کاری کی پیداوار؟ اگر کوئی مڈیکل لائن کو اپنا موضوع خاص بنالے، تو کوئی اس پر نکیر نہیں کرتا کہ تم نے اور علوم کو کیوں نہیں اپنایا؟ اسی طرح کوئی انجینئرنگ کو اپنا موضوع قرار دے، تو کوئی اس کو نہیں ٹوکتا کہ تم نے کیوں میڈیکل سائنس کو نہیں لیا؟ مگر کوئی علمِ دین کو اپنا خصوصی موضوع بناتا ہے، تو اس پر یہ لوگ یہ طعنہ دیتے ہیں کہ تم نے فلاں و فلاں علوم کیوں نہیں حاصل کیے؛ تمھاری زندگی بے کار ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ یہ اعتراض انتہائی بے ایمانی کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی بے عقلی کا بھی ثبوت دیتا ہے۔

دوسرا شبہ و اعتراض مدارس پر یہ کیا جاتا ہے کہ یہاں سے پڑھنے کے بعد یہاں کے فارغین پھر وہی مدرسہ و مکتب، امامت و خطابت وغیرہ دینی شعبوں ہی میں لگ جاتے ہیں، یا وہ بھی کوئی مدرسہ ہی کھول لیتے ہیں اور وہ کسی دنیوی ادارے کے قابل نہیں ہوتے۔

یہ اعتراض تو پہلے سے بھی زیادہ لغو و بے حقیقت ہے، آخر غور تو کیجیے کہ ان علما کو جب مدارس نے اسی لیے تیار کیا ہے کہ وہ امت کی دینی ضرورتوں کو پورا کریں، امت میں دینی بیداری پیدا کریں، ان کو قرآن و سنت سے وابستہ کریں، آخرت کی فکر ان میں پیدا کریں، تو اس میں آخر اعتراض کی کیا بات ہے کہ وہ فارغ ہو کر ان ہی ضرورتوں کو پورا کرنے میں لگ گئے۔

اگر میڈیکل سائنس سے فراغت کے بعد ڈاکٹر لوگوں کے علاج و معالجے میں لگ گیا، یا کوئی کلینک کھول لیا، تو کیا کوئی قابلِ اعتراض بات ہے؟ اگر انجینئر نے اپنے ہی متعلقہ شعبے میں کام کرنا شروع کر دیا یا کوئی کنسٹرکشن کمپنی کھول لیا، تو کیا وہ قابلِ ملامت ہے؟ کیا ایک پروفیسر اگر اپنے کام میں لگ جائے، تو وہ معیوب کام ہے؟ اگر نہیں تو پھر علما و حفاظ و دینی مدارس کے فارغین کے بارے میں یہ طعنہ دینا کہ وہ پھر اسی دینی کام میں مکتب و مدرسے، امامت و خطابت میں لگ گئے، کیا کسی عقل مند و ہوش مند کا کام ہو سکتا ہے؟

ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ مدارسِ اسلامیہ کے فارغین دینی کاموں پر اجرت و تنخواہ لے کر امت پر ایک بوجھ بنے ہوئے ہیں؛ لہٰذا ان کو کم از کم مدرسوں میں دستکاری و ہنر سکھا دینا چاہیے؛ تاکہ وہ مدارس سے فارغ ہونے کے بعد اپنے معاش کا کوئی نظم کر لیں۔

اس اعتراض میں کئی پہلو قابلِ غور ہیں: ایک تو یہ کہ علما کے وجود کو بوجھ قرار دیا گیا ہے، دوسرے یہ کہ ان کو اپنا معاش خود حاصل کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے اور تیسرے اس تجویز کی ایک صورت بھی تجویز کر دی ہے کہ علما کو دستکاری و ہنر سکھا دئے جائیں۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے، اس کا جواب میں مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب

دامت برکاتہم کے الفاظ میں دیتا ہوں، وہ یہ ہے:

''یہ عجیب تصور ہے کہ اگر کوئی شخص معاشرے کی دینی ضروریات پوری کر کے کوئی اجرت یا تنخواہ وصول کر رہا ہے، تو وہ ''معاشرے پر بوجھ'' یا ''دوسروں کا دستِ نگر'' بن گیا ہے۔ علم وفن کے ہر شعبے کا قاعدہ یہ ہے، جو شخص علم وفن کی مہارت حاصل کر کے اس شعبے میں معاشرے کی خدمت انجام دیتا ہے، اس کا معاش بھی اسی شعبے سے وابستہ ہوتا ہے اور اگر وہ اس شعبے میں معاشرے کی خدمت انجام دینے کی بنا پر کوئی اجرت یا تنخواہ وصول کرتا ہے، تو اس میں معاشرے پر بوجھ بننے یا کسی کا دست نگر ہونے کا کوئی سوال نہیں، بل کہ یہ اس معاشرتی نظام کا ایک لازمی حصہ ہے، جس پر پوری انسانیت کی بنیاد قائم ہے۔ اگر کوئی طبیب، انجینئر، ماہر معاشیات یا سائنس داں اپنے شعبے میں معاشرے کی خدمت کرتا ہے اور اس کے صلے میں معاشرہ اسے معاشی فوائد بہم پہنچاتا ہے، تو نہ یہ اس پر کسی کا احسان ہے اور نہ اس کی بنا پر یہ سمجھنا درست ہے کہ وہ معاشرے پر بوجھ بن رہا ہے یا دوسروں کا دست نگر ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا علومِ دین کی خدمت معاشرے کی کوئی ضرورت نہیں؟ کیا ایک مسلمان معاشرے کو ایسے اہلِ علم کی حاجت نہیں، جو ان کی دینی ضروریات پوری کر سکیں؟ ان کے نت نئے مسائل میں دین کی رہنمائی فراہم کر سکیں؟ ان کے بچوں کو دینی تعلیم دے سکیں؟ ان کے دینی مستقبل کے تحفظ کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر سکیں؟ دین پر حملہ آور فتنوں کا مؤثر تعاقب کر سکیں؟ اور دین سے متعلق وہ تمام امور انجام دے سکیں۔'' (۱)

---

(۱) ہمارا تعلیمی نظام: ۸۹

رہا اس شبے کا دوسرا پہلو کہ علما خود اپنا معاش پیدا کریں، تو اس سے متعلق عرض ہے کہ اگر علما اپنے معاش کے لیے نکل جائیں، تو کیا یہ ممکن ہے کہ مدارس و مکاتب، امامت و خطابت و دیگر دینی و دعوتی خدمات انجام پاتے رہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ بات ناممکن ہے کہ علما خود اپنی روٹی روزی کے لیے مختلف دنیوی کاموں میں نکل جائیں اور دینی خدمات کا یہ نظام بھی اسی طرح جاری و باقی رہے۔ اگر ڈاکٹر و انجینئر اپنے سے متعلق کاموں کو چھوڑ کر اپنا معاش پیدا کرنے کے لیے کسی دوسری لائن کو اختیار کر لے، مثلاً وہ چائے کی ہوٹل یا ٹیلرنگ کی دکان، یا کپڑوں کی دکان کھول کر بیٹھ جائے تو کیا تب بھی وہ اپنی مڈیکل و انجینئر نگ کی خدمات کو پورا کر سکے گا؟ اگر نہیں تو پھر علما سے یہ مطالبہ کہ وہ خود اپنا معاش پیدا کرنے کے لیے باہر نکلیں، کیا اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ لوگ دینی علوم و دینی شعبوں کو لغو و فضول سمجھتے ہیں؟ ان کے بقا کو غیر ضروری خیال کرتے ہیں؟ اسی لیے اس قسم کا مشورہ دیتے ہیں۔

رہا اس کا تیسرا پہلو: تو عرض ہے کہ علما کو دستکاری و ہنر سکھانے سے مقصود وہی معاش کی فکر میں ان کو لگانا ہے، جب کہ مدارس کا اولین پیغام علما و طلبا کو یہ ہوتا ہے کہ وہ دین ہی کے لیے خود کو وقف کر دیں؛ کیوں کہ دنیا کمانا و جمع کرنا اور عیش و راحت کے سامان مہیا کرنا، ان کی زندگی کا مقصد نہیں؛ بل کہ امت کی دینی ضرورتوں کے لیے خود کو معاشی و دنیوی اغراض سے بلند کر لینا ہی ان کی زندگی کا نصب العین ہے؛ لہٰذا یہ مشورہ بنیادی طور پر علما کے مقصدِ حیات کے خلاف ہونے کی وجہ سے نا قابلِ قبول ہے۔ نیز یہ بھی غور کیا جائے کہ علما کو دستکاری سکھا کر اس میں ان کو لگ جانے کا مشورہ کیا ان کے شایانِ شان ہے؟ کیا علما کی یہی قدر ہونی چاہیے کہ یہ مشورہ دیا جائے؟ کیا کسی وزیر کو یہ مشورہ دینا مناسب ہے کہ وہ شاہی خزانے سے تنخواہ لینے کے بہ جائے گزارے کے لیے کوئی دستکاری سیکھ لے؟

تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ علما، مدارس سے فارغ ہونے کے بعد اپنے معاش کے سلسلے میں پریشان رہتے ہیں، ان کی تنخواہیں بہت ہی چھوٹی ہوتی ہیں، جس کی وجہ سے وہ اپنی ضروریات زندگی کو بھی اس سے پورا نہیں کر سکتے، چہ جائے کہ کوئی سہولت و آسائش کی زندگی گزاریں؛ لہٰذا مدارس کی تعلیم سے وہ فارغ البال زندگی نہیں گزار سکتے؟

اس اعتراض پر غور وفکر کے دو زاویے ہیں: ایک یہ کہ ہم اس کو ایک دردمندانہ اعتراض قرار دیں، اس صورت میں سوال یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کو یہ احساس ہے کہ علما کی تنخواہیں بہت مختصر و محدود ہیں اور وہ زیادہ ہونا چاہیے، تو سوال یہ ہے کہ یہ قصور مدارس کا ہے یا امت کا کہ وہ علما و ائمہ کی تنخواہ کا معیار اس قدر گھٹیا رکھی ہوئی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ تو امت کا قصور ہے کہ اس کے یہاں علما کی اور ان کے کاموں و خدمات کی کوئی حیثیت نہ ہونے کی وجہ سے ان کی تنخواہ کا معیار انتہائی گھٹیا رکھا ہوا ہے؛ لہٰذا ان لوگوں کو اپنے اعتراض کا رخ مدارس کے بہ جائے امت کے ذمے دار لوگوں، مساجد، و مکاتب و مدارس چلانے والے لوگوں کی جانب کرنا چاہیے؛ مگر عجیب بات ہے کہ قصور کوئی کرے اور الزام کسی اور کو دیا جائے؛ لہٰذا اگر ہمدردانہ و غمخوارانہ طور پر ان لوگوں نے یہ کہا ہے، تو وہ مدارس کے خلاف آوازیں کسنے کے بہ جائے مختلف ذرائعِ ابلاغ سے یہ آواز اٹھائیں اور وہ خود کسی مسجد یا مکتب وغیرہ کے ذمے دار ہیں؛ تو فوری طور پر اپنے حدود اختیار میں تنخواہ کے اضافے کا آغاز کر دیں۔

دوسرا زاویہ یہ ہے کہ اگر اس اعتراض سے مقصود علما کی ہمدردی نہیں؛ بل کہ ان کی تحقیر ہے اور یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مدارس سے فارغ ہونے والے یہ علما کوئی اچھی تنخواہ کے مستحق نہیں ہو سکتے؛ لہٰذا ایسی تعلیم سے کیا نفع؟ تو یہ لوگ کان کھول کر سن لیں کہ علما - اگر واقعی علما ہوں - تو وہ تنخواہ کی کمی کو اپنے حق میں کوئی عیب و حقارت کی

بات ہی نہیں سمجھتے؛ بل کہ وہ تو دنیا اور دنیا کے مال و دولت اور یہاں کے ساز و سامان کو حقیر سمجھتے ہیں اور یہ وہ حضرات ہیں، جو مال و دولت کو ٹھوکر مار دیتے ہیں اگر اس سے ان کا دین ضائع ہوتا ہو اور ان کا مسلک وہ ہے، جس کی ترجمانی شاعر مشرق علامہ اقبال رحمہ اللہ نے اپنے اس شعر میں کی ہے:

اے طائر لاہوتی ! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

الحمد للہ ! یہ طبقہ وہ ہے، جس کے اسلاف میں حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ گزرے ہیں، جن کے پاس شاہِ سنجر نے ایک خط میں یہ مژدہ سنایا کہ میں آپ کی خانقاہ و مدرسے کے لئے "نیمروز" کا علاقہ وقف کرنا چاہتا ہوں، حضرت رحمہ اللہ نے اس کے جواب میں یہ قطعہ لکھ کر بھیج دیا:

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد
اگر در دل بود ہوس ملک سنجرم
آنگہ کہ خبر یافتم از ملک نیم شب
من ملک نیمروز را بیک جو نمی خرم

(اگر میرے دل میں "ملکِ سنجر" کی ہوس ہو تو میرے نصیبے کا رخ اس شاہی خط کی طرح سیاہ ہو جائے، جب سے کہ میں نے "ملکِ نیم شب" (آدھی رات کی عبادت کی لذت) کی خبر پائی ہے، میں "ملک نیمروز" کو ایک جو کے عوض بھی خریدنا نہیں چاہتا۔)

نیز اس طبقے کے اکابر میں حضرت غلام علی شاہ مجددی رحمہ اللہ کا نام نامی و اسم گرامی بھی ہے، جن کے دستر خوان پر ہزاروں آدمی کھانا کھاتے تھے، آپ کی خدمت میں اس زمانے کے بادشاہ نے ایک خط میں لکھا کہ آپ کی خانقاہ میں چلنے

والے لنگر کے بارے میں معلوم ہوا کہ ہزاروں لوگ کھانا کھاتے ہیں، اس کی وجہ سے لنگر کا خرچہ بہت بڑھ گیا ہے؛ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ اس کے لیے اپنی جانب سے ایک قطعۂ زمین وقف کردوں، آپ اس کو قبول فرمالیں۔ حضرت غلام علی شاہ رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اس کے جواب میں اسی خط کی پشت پر ایک شعر لکھ کر بھیج دیا اور وہ یہ تھا:

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم
با بادشاہ بگو کہ روزی مقرر است

(ہم فقر و قناعت کی عزت و آبرو کو بٹا نہیں لگانا چاہتے، بادشاہ سے یہ کہہ دینا کہ روزی مقرر و مقدر ہے۔)

مولانا محمد قاسم نانوتوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے دس روپے تنخواہ میں سے، دو روپے یہ کہہ کر کم کرادئے تھے کہ یہ خرچ سے زائد ہیں، ان کو لوں گا تو اللہ کے یہاں ان کا جواب بھی دینا ہوگا۔

الغرض علما کے لیے تنخواہ و مال و دولت کی کمی کوئی عیب نہیں؛ بل کہ ان کے لیے ایک زینت کی چیز ہے؛ لہٰذا جو لوگ اس کو ان کے حق میں عیب سمجھ کر ان کی تحقیر کرتے ہیں، وہ یہ سوچ رکھیں کہ حضراتِ انبیا و اولیا کے بارے میں وہ کیا سمجھتے ہیں، جن کے یہاں مال و دولت کی کمی تھی اور وہ فقر و فاقے کی زندگی کرتے رہے۔

دین و شریعت میں نئی بات پیدا کرنا

غلو فی الدین کی ایک بدترین صورت یہ ہے کہ دین میں نئی نئی باتیں پیدا کی جائیں، اسی کو شریعت کی زبان میں ''إحداث في الدین'' یا ''بدعة'' کہا جاتا ہے؛ لہٰذا پہلے بدعت کی تعریف اور اس کی قسمیں سنتے چلیں۔

بدعت کی تعریف

علمائے کرام نے بدعت کی تعریف یہ کی ہے :

”بدعت نام ہے اس من گھڑت طریقے کا جو دین میں جاری کیا گیا ہو اور وہ شریعت کے بالمقابل ہو اور اس سے اللہ کی عبادت میں مبالغہ مقصود ہو۔“(۱)

علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا:

”بدعت اصل میں اس چیز کو کہا جاتا ہے، جو بغیر کسی سابق مثال و نمونے کے ایجاد کی گئی ہو اور شریعت میں اس کا اطلاق سنت کے مقابلے میں ہوتا ہے؛ لہٰذا وہ قابل مذمت ہوگی۔“(۲)

حافظ ابن رجب رحمہ اللہ نے فرمایا:

”بدعت ہر وہ نئی بات ہے، جس پر شریعت میں کوئی دلیل نہ ہو اور جس پر کوئی دلیل ہو وہ شرعی بدعت نہ ہوگی۔“(۳)

اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر وہ من گھڑت اور نیا طریقہ، جو دین کے نام پر جاری کیا گیا ہو اور اس پر کوئی شرعی دلیل دلالت نہ کرے، وہ بدعت اور قابلِ مذمت ہے۔

بدعت کی حقیقت سمجھنے کے لیے دو اہم نکات

یہاں دو باتیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے؛ ورنہ بڑی غلط فہمی میں ابتلا پیش آئے گا اور اسی کی بنیاد پر اہلِ بدعت عوام الناس کو دھوکہ دیتے ہیں۔

---

(۱) الاعتصام: ۱/۳۷

(۲) فتح الباري: ۴/۲۱۹

(۳) جامع العلوم: ۱۹۳

پہلی بات یہ ہے کہ بدعت اس نئی بات کو کہتے ہیں، جو دین میں بلا دلیلِ شرعی جاری کی گئی ہو؛ لہٰذا اگر کوئی نئی بات جو رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے زمانے میں اور صحابہ و تابعین کے دور میں نہ تھی، دین سمجھ کر نہیں ؛ بل کہ دنیا کی ضرورت یا مصلحت سے جاری کی جائے یا اختیار کی جائے، تو اس کو بدعت شرعی نہیں کہا جائے گا۔

مثلاً آں حضرت صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اور صحابہ و تابعین کے زمانے میں گھڑی نہیں تھی، بعد میں یہ نئی ایجاد سامنے آئی، اس کو اپنی ضرورت و مصلحت سے پہنا جاتا ہے، اس کو بدعت نہیں کہا جائے گا۔ ہاں! اگر کوئی شخص گھڑی پہننے کو دین کا کام سمجھے اور نہ پہننے والوں کو گنہ گار قرار دے یا ان پر نکیر کرے، تو بے شک اس پر بھی بدعت ہونے کا حکم کہا جائے گا؛ مگر ظاہر ہے کہ کوئی شخص گھڑی کو دین نہیں سمجھتا۔

اسی سے دیگر نئی نئی چیزوں اور طریقوں کا حکم معلوم ہو جاتا ہے، جو دنیا والوں نے دنیا ہی سمجھ کر انسانی ضروریات اور مصالح کے پیشِ نظر جاری کی ہوئی ہیں، جیسے فون، فریج، صوفہ، پلنگ، کرسی، پنکھا، نئے طرز کی سواریاں، نئے طرز کے کپڑے، عجیب عجیب انداز کی عمارتیں وغیرہ، یہ سب چیزیں اگر چہ خیر القرون میں نہ تھیں اور بعد میں ایجاد ہوئیں؛ مگر یہ ساری چیزیں دین کی حیثیت سے اختیار نہیں کی جاتیں؛ بل کہ اپنی دنیا کی ضرورت سمجھ کر اختیار کی جاتی ہیں؛ لہٰذا یہ چیزیں شرعی بدعت کی زد میں نہ آئیں گی۔

بعض بدعت کے دل دادہ لوگ اپنی جہالت پر پردہ ڈالنے کے لیے کہہ دیا کرتے ہیں کہ بدعت ناجائز ہے، تو پھر یہ ساری نئی ایجادیں اور نئے طریقے بھی بدعت ہیں، ان سے کیوں منع نہیں کیا جاتا ؟ یہ اعتراض دراصل ناواقفیت کی دلیل ہے، اگر ان بے چاروں کو علم ہوتا کہ بدعت کی تعریف کیا ہے؟ تو یہ اعتراض کر کے اپنی ناواقفیت کا ثبوت نہ دیتے۔ چناں چہ تمام علما نے بدعت کی تعریف میں یہی لکھا

ہے کہ بدعت ''دین میں نئی بات'' کو کہتے ہیں، اگر دین میں نہیں ہے، تو اس کو شرعاً بدعت نہیں کہتے، اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

دوسری بات یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو امر حضرت رسول اللہ ﷺ اور خیر القرون میں نہیں تھا؛ مگر کوئی دلیل شرعی اس کے جواز یا استحباب یا وجوب کی دلائلِ شرعیہ میں موجود ہو اور اس کو دین سمجھ کر اختیار کیا جائے، تو اس کو بھی بدعت نہیں کہا جائے گا۔ جیسے مدارسِ اسلامیہ کا موجودہ نظام، دینی کتب کی تصنیف و تالیف کا موجودہ طرز، تعلیمِ دین و دعوت و تبلیغِ دین کی مختلف صورتیں و شکلیں وغیرہ۔ یہ سب امور بھی اگر چہ خیر القرون میں ان شکلوں وصورتوں کے ساتھ موجود نہیں تھیں؛ مگر ان کے دین ہونے کی دلیل دلائلِ شرعیہ میں موجود ہے، لہٰذا ان کو بھی بدعت نہیں کہا جاتا۔ بعض حضرات اس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مدارس وغیرہ پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ بھی تو خیر القرون میں نہیں تھے، تو یہ کیسے جائز ہو گئے؟ یہ اعتراض بھی دراصل بدعت کی تعریف کو کما حقہ نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

الغرض جو کام خیر القرون میں نہ ہو اور اس پر کوئی دلیلِ شرعی دلالت بھی نہ کرے اور اس کو دین سمجھ کر اختیار کیا جائے، تو وہ بدعت ہے۔

بدعت کی قسمیں

پھر یہ جان لیں کہ بدعت کی ایک قسم تو یہ ہے کہ دین میں کوئی نئی چیز ایسی ایجاد کی جائے، جس کی اصل یا نظیر دین میں ثابت نہ ہو، اس کو ''بدعتِ اصلیہ'' کہا جاتا ہے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ ایک چیز دین وشریعت میں پہلے سے ثابت ہو؛ لیکن کوئی اس میں کمی، بیشی یا اس کی کوئی نئی شکل وصورت پیدا کر لے، تو یہ ''بدعتِ وصفی'' کہلاتی ہے۔

چناں چہ حضرت علامہ اسماعیل شہید دہلوی رَحِمَہُ اللہُ اپنی کتاب " ایضاح الحق الصریح"، میں اس سلسلے کی احادیث ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"جاننا چاہیے کہ ان مذکورہ بالا تینوں احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بدعت دو قسم کی ہوتی ہے: پہلی قسم یہ ہے کہ وہ چیز اپنی ذات سے محدَث ہو یعنی نئی نکالی گئی ہو۔ دوسری قسم یہ ہے کہ شریعت کے کسی کام میں کوئی کمی یا زیادتی کی گئی ہو یا اس میں کوئی نئی صورت نکالی گئی ہو، حاصلِ کلام یہ کہ کسی شرعی امر کو اس طرح ادا کریں کہ شریعت میں اس طرح منقول نہ ہو۔ پس پہلی قسم کو بدعتِ اصلی کہتے ہیں اور دوسری قسم کو بدعتِ وصفی کہتے ہیں۔"(۱)

بدعت کی مختلف صورتیں

جب بدعت کی تعریف اور اس کی قسمیں معلوم ہو گئیں، تو اب لیجیے غلو کی یہ شکل مختلف طریقوں وصورتوں سے ظاہر ہوتی ہے:

(۱) ایک یہ کہ کوئی نئی عبادت پیدا کر لی جائے، جیسے بعض لوگوں نے رجب یا شعبان کی ایک نماز ایجاد کر رکھی ہے یا ربیع الاول میں میلا د و ربیع الثانی میں گیارھویں اور رجب میں کونڈے کی رسم وغیرہ کو مقرر کر رکھا ہے۔

(۲) دوسری یہ کہ کسی دینی وشرعی کام میں اپنی جانب سے کوئی چیز کم یا زیادہ کردی جائے، جیسے بعض لوگ اذان کے شروع میں درود کا اضافہ کر دیتے ہیں اور بعض نے نمازوں کے بعد اجتماعی دعا کو لازم کر رکھا ہے۔ یہاں اذان و نماز تو شرعی کام ہیں؛ مگر ان میں جو اضافہ کیا گیا ہے، وہ دین میں نئی چیز ہے۔

(۱) ایضاح الحق الصریح مترجم:۳۲

(۳) تیسری یہ کہ دین وشریعت کی باتوں میں اپنی جانب سے حدود و قیود بڑھادئے جائیں۔ جیسے ایصالِ ثواب تو دین میں ثابت ہے؛ مگر اس کے لیے بعض لوگوں نے وقت کی قید و تخصیص کی ہے۔ جیسے سوم، دسواں، بیسواں، چہلم، برسی وغیرہ کی رسمیں دراصل اپنی جانب سے وقت کی تخصیص ہے۔

یا خاص طریقے کی قید و تخصیص۔ جیسے ایصالِ ثواب میں ''الفاتحہ'' اور اس کے ساتھ سامنے مٹھائی رکھنے اور اس کو لوگوں میں تقسیم کرنے کی قیدیں لگائی گئی ہیں یا خاص قسم کی چیزوں کی قید لگاتے ہیں۔ جیسے صدقے کے لیے کالا بکرا یا کالی مرغی وغیرہ اور یہ سمجھتے ہیں کہ ایصالِ ثواب اسی صورت وشکل سے ہوگا، حال آں کہ شریعت نے یہ قیدیں نہیں بیان کی ہیں؛ لہٰذا یہ بھی غلو فی الدین ہے۔

اور جیسے بعض لوگوں نے بعض بعض مہینوں میں بعض کاموں کو خاص کر رکھا ہے، جیسے جلسہ سیرت النبی کو ربیع الاول میں، مظاہرۂ قرأت کی مجالس و دعا کی مجالس کو رمضان مبارک کی طاق راتوں میں یا خاص قسم کے بیانات کا سلسلے مخصوص راتوں میں وغیرہ، امور بھی اسی لیے قابلِ نکیر ہیں کہ ان میں اپنی جانب سے تخصیصات وقید بندیاں کی گئی ہیں، جو کہ غلو کی ایک صورت ہے۔

الغرض کسی بھی دینی کام میں اپنی جانب سے قیدیں لگانا اور تخصیصات کرنا اور ان کو دین سمجھ لینا جائز نہیں ہے؛ بل کہ غلو فی الدین کی ممنوع صورت ہے۔

(۴) چوتھی یہ کہ دین میں جو چیز جس کیفیت کے ساتھ ہے، اس کو اس سے ہٹادیا جائے۔ جیسے کوئی بات فرض ہے، کوئی سنت، کوئی مستحب و جائز ہے، اسی طرح بعض امور اجتماعی کیے جاتے ہیں اور بعض انفرادی کیے جاتے ہیں۔ اگر ان امور کو ان کی اس کیفیت سے ہٹا کر فرض کو واجب یا واجب کو فرض، یا سنت کو واجب یا واجب کو سنت سمجھا جائے یا انفرادی طور پر کیے جانے والے کام کو اجتماعی طریقے سے

کیا جائے یا اجتماعی کام کو انفرادی طور پر کیا جائے، تو یہ بھی غلو فی الدین کی ایک صورت ہے۔

جیسے بعض لوگ اجتماعی طریقے پر مساجد میں سلام پڑھنے اور اس کے لیے کھڑے ہونے اور خاص قسم کے اشعار پڑھنے کو لازم سمجھتے اور قرار دیتے ہیں اور غیر لازم کو لازم سمجھتے ہیں اور دوسروں پر اس کا اصرار کرتے ہیں۔

اسی طرح بعض مستحب کاموں پر اس قدر اصرار کرتے ہیں۔ جیسے کوئی واجب و لازمی چیز ہو، جیسے ''دعا بعد الصلاۃ'' پر امام پر اصرار کیا جاتا ہے اور اگر امام دعا زور سے نہ کرے یا اپنی دعا انفرادی طور پر کرلے، تو جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے ایک مستحب یا جائز کام کو فرض و واجب کے درجے میں سمجھ لیا ہے یا یہ کہ انفرادی کام کو اجتماعی طور پر کرنے کو لازم قرار دیتے ہیں، یہ وہی غلو فی الدین ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسی وجہ سے یہ فرمایا تھا:

''لا يجعل أحدكم للشيطان شيئاً من صلاته، يرى أن حقا عليه أن لا ينصرف إلا عن يمينه.''(۱)

(تم میں سے کوئی اپنی نماز میں شیطان کا حصہ مقرر نہ کردے کہ اپنے اوپر دائیں جانب سے مڑنے کو ضروری خیال کر بیٹھے۔)

حضراتِ علما نے آپ کے اس قول کی وضاحت وتشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نماز کے بعد داہنی یا بائیں جانب سے مڑنا دونوں جائز کام ہیں اور یہ دونوں صورتیں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہونے کی وجہ سے کوئی بھی مکروہ

---

(۱) الصحيح للبخاري:۸۵۲، مسند أحمد:۴۰۸۴، صحيح ابن حبان:۱۹۹۷، سنن البيهقي:۳۷۵۳، المعجم الكبير للطبراني:۱۰۰۱۱

نہیں؛ لیکن حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے دائیں جانب ہی سے مڑنے پر التزام و پابندی سے منع کیا، اس بات کے اندیشہ سے کہ کہیں اس کو لازم وضروری نہ سمجھ لیا جائے۔(۱)

شارحِ بخاری علامہ ابن المنیر رحمہ اللہ نے فرمایا:

” فيه أن المندوبات قد تقلب مكروهات إذا رفعت عن رتبتها لأن التيامن مستحب في كل شيء لكن لما خشي ابن مسعود- رضی اللہ عنہ - أن يعتقدوا وجوبه أشار إلى كراهته.“

(مستحب امور کبھی مکروہ قرار پاتے ہیں، جب کہ ان کو ان کے درجے سے بڑھا دیا جائے؛ کیوں کہ تیامن ہر چیز میں مستحب ہے؛ لیکن جب حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو اس بات کا اندیشہ ہوا کہ کہیں لوگ اس کو واجب نہ مان بیٹھیں، تو آپ نے بتا دیا کہ یہ مکروہ ہے۔)(۲)

صاحبِ ”مشکوۃ“ رحمہ اللہ کے استاذ اور شارحِ مشکوۃ علامہ طیبی رحمہ اللہ اسی حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

”و فيه أن من أصر على أمر مندوب ، و جعله عزما ، و لم يعمل بالرخصة فقد أصاب منه الشيطان من الإضلال فكيف بمن أصر على بدعة ، أو منكر؟“(۳)

(اس میں اشارہ ہے کہ جو کسی مباح کام پر اصرار کرے، اس کو ضروری قرار دے اور رخصت پر عمل نہ کرے، تو یقیناً ایسے شخص کو گمراہ کرنے

---

(۱) شرح ابن بطال:۲/۴۶۴

(۲) فتح الباري:۲/۳۳۸

(۳) شرح الطيبي:۳/۱۰۵۱

کا شیطان کو موقع ملتا ہے، پھر بھلا اس شخص کا کیا پوچھنا؟ جو کسی بدعت یا معصیت پر جما بیٹھا ہے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ ایک مستحب کام پر بھی اس طرح اصرار کرنا کہ واجب سمجھا جائے یہ بھی غلو ہے اور اسی غلو سے لوگوں کو بچانے کے لیے حضراتِ فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ جو سورتیں بعض خاص خاص نمازوں میں مسنون ہیں، ان کو بھی کبھی کبھی ترک کر دینا چاہیے؛ تاکہ لوگ ان کو واجب ولازم نہ سمجھ لیں۔ (۱)

مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا چشم کشا بیان

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے کیا خوب بات فرمائی ہے، جس سے اس مسئلے کی اچھی طرح توضیح ہو جاتی ہے اور حقیقت بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

> ''شریعتِ اسلام نے چوں کہ ہر فتنے کے دروازے کو بند اور فساد دین کے راستے کو روکا ہے؛ اسی لیے اس کا بھی خاص اہتمام فرمایا کہ فرائض ونوافل میں پورا امتیاز رہے، حقیقت کے اعتبار سے بھی اور صورت کے اعتبار سے بھی۔ نمازوں میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کا تو یہ معمول رہا کہ مسجد میں صرف فرض نماز جماعت سے ادا فرماتے، باقی نوافل وسنتیں بھی گھر جا کر پڑھتے تھے اور جن نمازوں کے بعد سنت یا نفل نہیں ہے، ان میں اگر نماز کے بعد مسجد میں بیٹھنا یا اور کوئی وظیفہ پڑھنا ہے، تو بہ صورتِ نماز قبلہ رخ نہیں بیٹھتے؛ بل کہ داہنی یا بائیں جانب پھر کر بیٹھتے؛ تاکہ دور ہی سے ہر شخص یہ سمجھ لے کہ فرض

(۱) دیکھو: الجوهرة النيرة: ۱/۲۲۹، اللباب في شرح الكتاب: ۱/۳۹

نماز ختم ہوچکی ہے، اب امام جو کچھ پڑھ رہا ہے، وہ اختیاری چیز ہے۔ اصل سنت تو یہی ہے کہ نوافل ونفلی عبادات سب تنہائی میں اپنے گھروں میں ادا کی جائیں اور اگر مسجد ہی میں سنتیں پڑھنا ہو؛ تو بھی مسنون طریقہ یہ ہے کہ جماعتِ فرض کی ہیئت کو ختم کردیا جائے، صفیں توڑ دی جائیں، لوگ آگے پیچھے ہوکر سنتیں پڑھیں۔ اسی طرح روزہ شرعاً صبحِ صادق سے غروبِ آفتاب تک ہے؛ لیکن چوں کہ رات کو سب لوگ عادۃً سوتے ہیں اور سونے کی حالت میں بھی کھانے پینے سے آدمی اسی طرح رکا رہتا ہے جیسے روزہ میں؛ اس لیے سحری کھانا مسنون قرار دیا گیا؛ تاکہ سونے کے وقت جو صورت روزہ کی ہوگئی تھی، اس سے امتیاز ہوجائے اور روزہ ٹھیک صبحِ صادق کے بعد سے شروع ہو۔ اسی لیے سحری بالکل آخر وقت میں کھانا مستحب ہے، اسی طرح غروبِ آفتاب کا یقین ہوجاتے ہی روزہ فوراً افطار کرنا چاہیے، دیر کرنا مکروہ ہے؛ تاکہ روزہ کی عبادت کے ساتھ زائد وقت کا روزہ میں اضافہ نہ ہوجائے۔

آج بھی یہ سب چیزیں بحمد اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں جاری ہیں؛ مگر جہالت وناواقفیت سے ان چیزوں کی حقیقت سے بے خبری ہے۔ صبح اور عصر کی نماز کے بعد عام طور پر ائمہ مساجد قبلے کی جانب سے مڑ کر تو بیٹھ جاتے ہیں؛ مگر اس پر نظر نہیں کہ یہ مڑنا اس غرض سے تھا کہ عملاً اس کا اعلان کردیں کہ اب فرض ختم ہوچکے، ہر شخص کو اختیار ہے، جو چاہے کرے، جہاں چاہے جائے؛ مگر یہاں پوری جماعت کو اس کا پابند بنایا جاتا ہے کہ جب تک تین مرتبہ دعا جماعت کے ساتھ نہ کرلیں، اس وقت تک سب منتظر رہیں، پھر ان دعاؤں میں بھی خاص خاص دعاؤں

کی ایسی پابندی ہے، جیسے کوئی فرض ہو، جب تک وہ خاص دعائیں نہ پڑھی جائیں، عوام یہ سمجھتے ہیں کہ نماز کا کوئی جز رہ گیا۔"(۱)

یہ طویل اقتباس ہم نے اس لیے نقل کیا ہے کہ اس سے ایک عامی شخص بھی اسلامی نقطۂ نظر سے بدعت کی حقیقت کو بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔

لہٰذا دونوں قسم کی یہ بدعتیں قابلِ انکار ورد ہوں گی اور ان سے احتراز کرنا لازم و ضروری ہوگا۔

دینی احکام میں ترجیحات وترتیبات سے غفلت واعراض

احکاماتِ شریعت وامور دینی میں ترجیحات وترتیبات سے غفلت واعراض بھی غلو فی الدین کا ایک بڑا سبب ہے، جو مسلم معاشرے میں آج ایک وبائی مرض کی طرح پھیلتا جارہا ہے۔

ترجیحات وترتیبات سے کیا مراد ہے؟

ہماری مراد ترجیحات وترتیبات سے یہ ہے کہ دینی احکام وشرعی امور میں کسی کو اولیت وفوقیت کا درجہ حاصل ہے، تو کسی کو ثانویت کا، کوئی اصل ہے تو کوئی فرع، کوئی مقدم ہے تو کوئی مؤخر، کوئی رکن ہے تو کوئی اس کا تتمہ وتکملہ، کوئی فرض ہے تو کوئی واجب اور کوئی سنت ہے تو کوئی نفل، پھر ان میں اسی کے لحاظ سے ترجیح وترتیب بھی لازمی سی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ نفل فرض پر مقدم واولیٰ نہیں اور ارکان کا درجہ مکملات سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا، مستحبات کو واجبات سے آگے نہیں کیا جاسکتا۔ ہماری مراد ترجیح وترتیب سے یہی ہے کہ شرعی احکامات میں دلائلِ شرعیہ کی روشنی میں قائم ترجیحات وترتیبات سے اگر

---

(۱) جواہر الفقہ: ۱/۴۶۳-۴۶۴

صرف نظر کیا جائے گا۔ تو اس کے نتیجے میں بھی غلو فی الدین پیش ہوگا۔

اور دینی امور و احکام میں مدارج و مراتب کا یہ تفاوت نہایت واضح ہے اور خود نصوصِ قرآنیہ وحدیثیہ اس پر دلالت کرتے ہیں، یہاں ہم قرآن وسنت میں سے ایک دو دلیلوں پر اکتفا کرتے ہیں:

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَلٰكِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰٓئِكَةِ وَالۡكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ، وَاٰتَى الۡمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنَ وَابۡنَ السَّبِيۡلِ وَالسَّآئِلِيۡنَ وَ فِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ، وَالۡمُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِهِمۡ اِذَا عٰهَدُوۡا وَالصّٰبِرِيۡنَ فِي الۡبَاۡسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَحِيۡنَ الۡبَاۡسِ، اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ ﴾ (البقرۃ: ۱۷۷)

(نیکی صرف یہی نہیں ہے کہ تم اپنا چہرہ مشرق یا مغرب کی طرف کرلو؛ بل کہ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور نبیوں پر ایمان لائے اور اس کی محبت میں قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور راہ گیروں اور سائلوں اور غلاموں کو آزاد کرانے میں مال صرف کرے اور نماز قائم کرے، زکوۃ ادا کرے اور وہ جو وعدہ کرکے اپنے وعدوں کو پورا کرنے والے اور تنگی و بیماری اور لڑائی کے وقت صبر سے کام لینے والے ہیں، یہی لوگ ہیں جو سچے اترے اور یہی لوگ دراصل متقی ہیں۔)

اس آیت میں قبلے کے مسئلے کو لے کر جھگڑنے والوں کا رد کیا گیا ہے، جو تبدیلیٔ

قبلے کے وقت مسلمانوں پر اعتراض کرر ہے تھے کہ کبھی اس رخ پر اور اس رخ پر کیوں نماز پڑھتے ہو؟ اس آیت میں ان کا جواب دیا کہ منہ کا اس طرف یا اس طرف کرنا کوئی اہم بات نہیں ؛ بل کہ جدھر اللہ کا حکم ہو جائے کرلیا جائے گا، اصل نیکی تو یہ ہے کہ اللہ و رسول اور یوم آخرت وغیرہ پر ایمان لایا جائے اور نیکی کے کام نماز، زکاۃ، صبر وغیرہ پر قائم ہو جائے، اس کو چھوڑ کر اس بحث میں لگ جانا کہ منہ ادھر کریں یا اس جانب کو، یہ کوئی اہم و قابلِ ترجیح مسئلہ نہیں ہے۔

ایک دوسری آیت میں فرمانِ خداوندی ہے:

﴿أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (التوبۃ:۱۹)

(کیا تم نے حاجیوں کے پانی پلانے اور مسجد حرام کے آباد رکھنے کو اس شخص کے عمل کے برابر قرار دے لیا ہے، جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور اس نے اللہ کے راستے میں جہاد کیا ہے، یہ لوگ اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہو سکتے اور اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔)

اس آیت میں دو عبادات میں تفاوت بیان کیا گیا ہے: ایک حاجیوں کو پانی پلانے اور کعبے کی خدمت، دوسرے ایمان و جہاد فی سبیل اللہ اور یہ بتایا ہے کہ یہ دونوں ایک درجے کے نہیں ہو سکتے۔

اسی طرح حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں وارد ہوا ہے:

" الإيمان بضع ، و ستون ، أو بضع ، و سبعون شعبةً ، فأفضلها قول لا إله إلا اللّٰه ، و أدناها إماطة الأذى عن

الطريق ، و الحياء شعبة من الإيمان."

(ایمان کی ساٹھ یا ستر سے اوپر کچھ شاخیں ہیں: پس ان میں سے افضل و اعلیٰ "لا الٰہ الا اللہ" کا اقرار ہے اور ادنیٰ وگھٹیا راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا ہے اور حیا بھی ایمان کا ایک بڑا شعبہ ہے۔)(۱)

اس میں بھی اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اعمال کے اندر تفاوت کا ذکر فرمایا ہے، اس کے علاوہ بھی متعدد احادیث میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

الغرض احکام دینیہ میں جب فرق مراتب رکھا گیا ہے، تو اس کا لحاظ بھی ضروری ہے؛ مگر افسوس کہ آج امت کا ایک بڑا طبقہ اس کو فراموش کیا ہوا ہے اور اس کی وجہ سے دین کے غلو کا مرتکب ہوتا رہتا ہے، ہم یہاں اس سلسلے میں چند بنیادی امور کی نشاندہی کر دینا مناسب سمجھتے ہیں؛ تاکہ اسی کی روشنی میں دیگر امور کو قیاس کرنا اور سمجھنا آسان ہو جائے۔

اصولی وفروعی احکام میں ترجیح

اسلامی احکام دو قسم کے ہیں: ایک اصولی و اعتقادی اور دوسرے فروعی و جزئی، جہاں تک اصولی احکام کا تعلق ہے، یہ ہر عقل کے سامنے واضح ہے کہ ان کا درجہ و مقام بڑھا ہوا ہے اور جزئی احکام کے مقابلے میں وہ قابل ترجیح ہوتے ہیں اور فروعی و جزئی احکامات اگرچہ اپنی جگہ بہت اہم ہیں؛ مگر بہ مقابلہ اصولی احکام کے ان کا درجہ فروتر ہے۔ اسی طرح یہ بھی مسلم ہے کہ فروعی احکامات بھی سب ایک درجے کے نہیں ہیں؛ بل کہ ان میں فرق ہے، ان میں سے بھی بعض بہت اہم ہیں اور بعض ان کے

---

(۱) الصحيح للمسلم:۱۶۲،سنن أبي داود:۴۶۷۸،سنن النسائي:۵۰۰۵،سنن ابن ماجة:۵۷،مسند أحمد:۹۳۵۰

مقابلے میں کم درجے کے ہیں؛ لہٰذا سب کو ایک درجے میں نہیں رکھا جا سکتا اور نہ سب کے ساتھ یکسانیت کا معاملہ ہو سکتا ہے۔

مگر بعض لوگ یہاں ایک غلطی تو یہ کرتے ہیں کہ دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کرتے ہیں؛ اس لیے جس طرح عقائد کے مسائل میں دو رائے اور اختلاف کو مذموم سمجھتے ہیں، اسی طرح جزئی و فروعی احکام میں اختلاف کو بھی مذموم سمجھتے اور اس اختلاف کرنے والوں کے ساتھ وہی معاملہ کرتے ہیں جو اصولی و اعتقادی مسائل میں اختلاف کا ہونا چاہیے۔ یہ ان لوگوں کی شدید و فاش غلطی ہے۔

ہم نے اس سلسلے میں فصل سادس کے اندر، ''اختلافات کی صورت میں حدود سے تجاوز'' کے عنوان سے نہایت مفصل کلام کیا ہے، وہاں اس کو ملاحظہ فرمالیں۔

دوسری غلطی یہ کی جاتی ہے کہ عقائد و اصول پر زیادہ توجہ کے بہ جائے فروعی احکام و جزئی مسائل میں ساری توانائی خرچ کر جاتے ہیں اور بالخصوص ان مسائل میں جن میں ائمۂ کرام ہی سے نہیں؛ بل کہ حضراتِ صحابہ و تابعین سے بھی اختلافات چلے آ رہے ہیں اور ان مسائل کو معیارِ حق و باطل بنا کر ائمۂ کرام پر بھی کیچڑ اچھالا جاتا ہے۔

''رفعِ یدین''، ''فاتحہ خلف الامام''، ''آمین بالجہر والسر''، ''مصافحہ ایک ہاتھ سے یا دو ہاتھ سے'' وغیرہ مسائل کے سلسلے میں کسی کو جنتی کسی کو دوزخی بنایا جاتا ہے، نمازوں کو کالعدم قرار دیا جاتا ہے، جب کہ بہت سے لوگ ایمان و عقیدے میں فتور لیے زندگی کر رہے ہیں اور ان حضرات کو اس کی جانب کوئی توجہ نہیں۔ کیا یہ غلو فی الدین نہیں کہ شرع نے ایک چیز کا جو مقام مقرر کیا تھا، اس سے اس کو ہٹا دیا جائے اور دوسری چیز کو جو اس درجے کی نہیں، اس کی جگہ رکھا جائے؟

ہم نے ایک واقعہ اس نوع کا دیکھا کہ ایک ہندو خاندان کے کچھ لوگوں نے اللہ

کی توفیق سے اسلام قبول کیا، پہلے تو ان میں سے ایک شخص کو توفیق ہوئی، پھر اس کی محنت و دعوت سے اللہ نے خاندان کے دوسرے افراد کو بھی توفیق دی اور یہ سب اسلام لائے تھے ایک حنفی مسلک کے عالم کے ہاتھ اور اسی کی تعلیم کے مطابق وہ لوگ حنفی طریقے کے مطابق نماز پڑھنے لگے؛ مگر حیرت بھی ہے اور افسوس بھی کہ کچھ حضرات نے ان کو اس بحث میں مبتلا کر دیا کہ حنفی طریقہ نماز صحیح نہیں ؛ بل کہ نماز میں "رفع یدین" کرنا چاہیے اور آمین زور سے کہنا چاہیے وغیرہ اور ان کے ہاتھ میں ایک کتاب بھی پکڑوا دی، جس میں ان فروعی مسائل پر بحث و مباحثہ ہے۔

یہاں ہر عقل و دانش کا حامل سوچے اور غور کرے کہ کیا ان نومسلموں کی تعلیم میں یہی چیز سب سے اہم و مقدم تھی کہ ان کو نماز کے اختلافی مسائل میں الجھایا جائے ؟ کیا ان لوگوں کو اس وقت ایمان و عقیدے کی تعلیم، توحید و شرک کا فرق، نبوت و ختم نبوت کی توضیح، آخرت و جنت و دوزخ، تقدیر وغیرہ کے احکامات کی تبلیغ ضروری نہیں تھی؟ کیا اس وقت ان امور کی اہمیت کو کسی موٹی سے موٹی عقل والا بھی فراموش کر سکتا ہے؟

اسی طرح بعض لوگوں میں یہ طریقہ چل پڑا ہے کہ دین کی جانب لانے و مائل کرنے میں صرف اعمال ہی کی دعوت کو کافی سمجھتے اور لوگوں کے عقائد کی اصلاح کو کوئی قابلِ توجہ بات نہیں سمجھتے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بسا اوقات نیکی و طاعت پر جم جانے والے لوگ عقائد کی صرف کمزوری کا نہیں ؛ بل کہ بد عقیدگی تک کا شکار رہتے ہیں اور توحید و شرک کا فرق، ختم نبوت کی حقیقت، اولیاء اللہ کے سلسلے میں اسلام کا نقطۂ نظر وغیرہ امور میں مسلکِ اہلِ سنت کے خلاف عقائد کے قائل رہتے ہیں ؛ مگر چوں کہ وہ نماز و روزہ اور نیکی و طاعت کے بہت سے کاموں میں شریک رہتے ہیں ؛ اس لیے ان کو یوں ہی چھوڑ دیا جاتا ہے، حتی کہ بہت سے لوگ اسی غلط عقیدے پر مر جاتے ہیں۔

لہٰذا یہ سمجھ لینا چاہیے کہ عقیدے کی اصلاح، اعمال کی اصلاح پر اور اصول میں مضبوطی، فروعی اعمال میں مضبوطی پر مقدم و راجح ہے؛ مگر ہائے افسوس! بعض لوگ ان سارے امورِ مہمہ سے اور حقائق سے آنکھیں بند کر کے غیر فطری طرز کو اختیار کرتے ہیں اور امت کو نقصانِ عظیم سے دوچار کر دیتے ہیں۔

الغرض یہ بھی بہت ضروری ہے کہ اصولی و فروعی احکام کے فرق کو ملحوظ رکھا جائے اور ہر ایک کو اس کے درجے و مقام پر رکھنے کی کوشش کی جائے۔

فرضِ عین و فرضِ کفایہ میں ترجیح

ان امور میں سے ایک یہ ہے کہ فرضِ عین و فرضِ کفایہ میں ترجیح فرضِ عین کو ہے؛ کیوں کہ فرضِ عین ہر مکلّف پر لازم ہے اور اس سے روگردانی و غفلت اس کے لیے جائز نہیں، اس کے برعکس فرضِ کفایہ ہر مکلّف پر لازم نہیں ؛ بل کہ اگر چند لوگ اس کو ادا کر دیں؛ تو دوسروں سے ساقط ہو جاتا ہے۔

مگر بعض لوگ اس سلسلے میں عجیب قسم کا تغافل اختیار کرتے ہیں اور اپنے ذمے فرضِ عین کو چھوڑ کر اس کام کی جانب اپنی عنانِ توجہ پھیر دیتے ہیں، جس کو ادا کرنے والے بہت سے لوگ موجود ہیں؛ حال آں کہ حدیث میں اس سلسلے میں واضح ہدایت موجود ہے۔

چناں چہ حدیث میں ہے کہ ایک صحابی رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے پاس آئے اور آپ سے جہاد میں جانے کی اجازت مانگی، آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے پوچھا کہ کیا تمھارے والدین باحیات ہیں؟ عرض کیا کہ ہاں! آپ نے فرمایا کہ پھر تو ان ہی کی خدمت کے ذریعے جہاد کرو۔(۱)

---

(۱) الصحيح للبخاري:٣٠٠٤،الصحيح للمسلم:٦٦٦٨،سنن أبي داود:٢٥٢١،سنن الترمذي:١٦٧١، سنن النسائي:٣١٠٣، مسند أحمد:٦٥۴۴،صحيح ابن حبان:۴٢٠

امام ابن حبان رَحِمَهُ اللهُ نے اس حدیث پر جو باب باندھا ہے، وہ یہ ہے:
''ذكر الاستحباب للمرء أن يؤثر بر الوالدين على الجهاد النفل في سبيل الله'' (آدمی کے لیے اس بات کے مستحب ہونے کا ذکر کہ وہ نفلی جہاد فی سبیل اللہ پر والدین کی خدمت کو ترجیح دے)

شارحینِ حدیث نے صراحت فرمائی ہے کہ اللہ کے رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے اس شخص کو جہاد کی اجازت کے بہ جائے والدین کی خدمت کا حکم اس لیے دیا کہ جہاد، فرضِ کفایہ تھا، اس کے مقابلے میں والدین کی خدمت اس کے لیے اس سے اہم تھی؛ لہٰذا ان کی خدمت کے ذریعے جہاد کا ثواب حاصل کرنے کی ترغیب دی، ہاں! کسی وقت جہاد فرضِ عین ہو جائے؛ جیسے اہلِ اسلام پر کفار غالب آ جائیں اور امیر المسلمین نے حکمِ عام جہاد میں نکلنے کا دے دیا ہو، تو جہاد فرضِ عین ہو جائے گا اور اس وقت والدین کی خدمت کے بہ جائے جہاد میں جانا لازم ہوگا؛ حتیٰ کہ والدین اگر منع بھی کریں، تب بھی ان کی بات مانی نہیں جائے گی، کیوں کہ اس وقت یہی لازم و ضروری ہے۔(۱)

فرضِ عین پر فرضِ کفایہ کو ترجیح دینے والے لوگ مختلف قسم کے ہیں:

بعض اہلِ علم سے اس سلسلے میں یہ کوتاہی ہوتی ہے کہ وہ علوم کی تحصیل میں فرضِ عین و فرضِ کفایہ کے اس فرق کو نظر انداز کر جاتے ہیں اور ان علوم میں اپنی ساری ہمت صرف کر دیتے ہیں، جو محض فرضِ کفایہ ہیں اور اس علم سے غافل رہتے ہیں، جو فرضِ عین ہے۔ مثلاً علمِ نحو و صرف و بلاغت و بیان کی تحصیل میں لگ جاتے ہیں اور اسی طرح تفسیر کے ذخائر اور اصولِ تفسیر کی تحقیقات، حدیث کے ذخائر اور اصولِ حدیث و علومِ حدیث وغیرہ کی مکمل تحقیقات میں اپنا پورا وقت لگا دیتے ہیں؛ مگر اپنے

(۱) دیکھو: شرح البخاري لابن بطال: ۹/۱۹۱

نفس کی اصلاح وتزکیے کے سلسلے میں کوئی خاص توجہ نہیں دیتے؛ حال آں کہ یہ فرضِ عین ہے کہ آدمی یہ جانے کہ نفس وشیطان کے مکر کیا ہیں اور کس طرح ہوتے ہیں؟ اور اپنے ظاہر وباطن کی کیا کیا بیماریاں ہیں اور ان کی اصلاح کے طرق کیا ہیں؟ تاکہ خود کو ان ساری ظاہری وباطنی بیماریوں وگمراہیوں سے صاف وپاک کر سکے؛ مگر اس کی جانب دیگر علوم کے مقابلے میں عشرِ عشیر بھی توجہ نہیں دی جاتی۔

امام غزالی رحمہ اللہ نے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"تمھیں چاہیے کہ دو میں سے ایک شخص بنو یا تو خود کی اصلاح میں مشغول ہو یا اپنی اصلاح کے بعد دوسروں کی اصلاح کا شغل رکھو اور اس بات سے بچو کہ خود کی اصلاح سے پہلے دوسروں کی اصلاح کی فکر میں مشغول ہو جاؤ، پھر خود کی اصلاح میں مشغول ہونا ہے، تو کسی اور کے بہ جائے اس علم میں مشغول ہو، جو تم پر اپنے حال کے تقاضے کے مطابق فرضِ عین ہوتا جاتا ہے اور وہ علم جو اعمالِ ظاہرہ سے متعلق ہے، جیسے نماز وطہارت، روزہ کا سیکھنا۔ اور ایک بڑا اہم علم، جس کو سب نے چھوڑ رکھا ہے، وہ صفاتِ قلب اور ان میں سے جو اچھی یا مذموم صفات ہیں ان کا علم ہے؛ کیوں کہ کوئی بشر بھی صفاتِ مذمومہ جیسے حرص، حسد، ریا، تکبر، عجب وغیرہ سے خالی نہیں ہے اور یہ سب کے سب ہلاک کرنے والی صفات ہیں اور ان کو ختم کرنا واجبات میں سے ہے۔" (۱)

الغرض فرضِ عین وفرضِ کفایہ کے فرق کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے؛ بل کہ اس میں شرع کی قائم کردہ حدود کے مطابق ترجیح کا اصول اپنانا چاہیے۔

ایک کوتاہی اس سلسلے کی جس سے غلو جنم لیتا ہے، یہ ہے کہ لوگ شعبۂ تحفیظ

---

(۱) إحیاء العلوم :۱/۳۹

القرآن یا عالمیت کے مدارس کے قیام کی جانب خوب توجہ دیتے ہیں اور بعض بعض علاقوں میں متعدد ایسے مدارس موجود ہوتے ہوئے بھی وہاں پھر ایسے ہی مدارس کھولتے چلے جاتے ہیں؛ حال آں کہ وہاں عوام الناس کے لیے ''مکتب'' کا کوئی صحیح نظام نہیں ہوتا، جس میں وہاں کے بچے و بچیاں اور نوجوان مرد و عورتیں قرآنِ کریم اور دین کی بنیادی و اساسی تعلیم حاصل کر سکیں۔ یہ بات معلوم و مسلم ہے کہ حفظ و عالمیت کے مدرسے کا درجہ موجودہ حالات میں صرف فرضِ کفایہ کا ہے، جب کہ مکتبی تعلیم کا درجہ فرضِ عین کا ہے؛ کیوں کہ حافظِ قرآن یا عالمِ دین یا مفتی و مفسر وغیرہ علومِ شرعیہ کے ماہرین کا پیدا کرنا فرضِ کفایہ ہے، ایک علاقے میں ایسے ایک یا چند لوگ ہوں جو دین کے ان شعبوں میں کام کرتے ہوئے امت کی ان ضرورتوں کو پورا کریں، تو یہ فرض دوسروں سے ساقط ہو جاتا ہے، اس کے برعکس تلاوتِ قرآن کے لیے تجوید سیکھنا اور قرآن کا ایک حصہ یاد کرنا، جس کی نمازوں کے لیے ہر مسلمان کو ضرورت ہے،؛ نیز دین کے بنیادی عقائد، عبادات و اعمال کے ضروری مسائل، حلال وحرام سے متعلق احکامات کی تحصیل ہر مسلمان پر فرض ہے۔

مگر اکثر لوگ اس فرض کی تکمیل کے بہ جائے مدرسہ قائم کر کے چند بچوں کو حافظ یا عالم بنانے کی کوشش میں اس طرح لگ جاتے ہیں کہ فرضِ عین کی جانب کوئی توجہ ہی نہیں ہوتی۔ احقر کے پاس مختلف علاقوں کے اور شہر کے مختلف محلوں سے لوگ آتے ہیں اور اپنے عزائم کا اظہار کرتے ہوئے مشورہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنے علاقے میں ایک حفظِ قرآن کا مدرسہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ایسے حضرات کو بار بار اس جانب متوجہ کیا ہے کہ الحمدللہ! بڑے بڑے علماء نے حفظ و عالمیت اور افتا وغیرہ کے بڑے بڑے مدارس قائم کر کے اس فرضِ کفایہ کی انجام دہی سے آپ کو سبکدوش کر دیا ہے؛ لہٰذا آپ اپنے علاقے کے لیے اس کے بہ جائے ایک جامع و مستند مکتب

قائم کریں؛ تا کہ وہاں کے لوگوں کو اپنے اوپر عائد ایک اہم فرض کو ادا کرنے کا موقعہ و سہولت ملے اور وہ اس فریضے سے سبکدوش ہو سکیں۔ جامع سے مراد ایسا مکتب، جس میں ایک جانب لڑکوں کی تعلیم کا نظم ہو، تو ایک جانب لڑکیوں کی تعلیم کا نظام ہو، اسی طرح اگر وہاں بچوں کی تعلیم کا نظم ہو، تو اسی کے ساتھ ساتھ کسی وقت بالغ مردوں اور عورتوں کی تعلیم کا بھی الگ الگ معقول نظام ہو اور مستند سے مراد یہ ہے کہ وہاں کی تعلیم کسی عالمِ دین کے مشورے سے ایک ایسے نصاب کے تحت جاری کی جائے، جس میں قرآن وسنت اور علمائے سلف کے اقوال سے ہی استناد کیا گیا ہو اور نظام بھی اسی کے موافق قائم کیا گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ مدارس کا چلانا نہ ہر ایک کے بس کی بات ہے اور نہ ہر جگہ اس کی ضرورت؛ مگر لوگ عموماً اس مشورے کو دفع الوقتی خیال کر کے چلے جاتے ہیں اور حفظ یا عالمیت کا مدرسہ قائم کر کے فرض کو چھوڑ کر اور پورے محلے کی ذمے داری سے انحراف کرتے ہوئے ادھر ادھر سے چند ایک طلبہ کو لا کر مدرسہ چلاتے ہیں۔ یہ بھی وہی ترجیحات وترتیبات سے انحراف کا نتیجہ ہے۔

بعض لوگ خود کی اصلاح اور اپنے ان متعلقین کی اصلاح جو اپنے ماتحت ہیں، اس سے صرفِ نظر کر کے دوسروں کی اصلاح کی فکر میں لگ جاتے ہیں، ان کو ہر وقت دین کی نسبت یہی کام اہم وضروری معلوم ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی اسی کی جانب متوجہ کرنے کو بڑا کام سمجھتے ہیں اور یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم بہت ہی اہم کام میں لگے ہوئے ہیں، حال آں کہ خود کی اصلاح فرضِ عین ہے، اسی طرح اپنے ماتحتوں کی اصلاح فرضِ عین ہے، حتی کہ قرآن شریف پڑھنے اور اس کی تجوید کے ساتھ تلاوت کرنے اور اپنی نمازیں و دیگر عبادات کو درست کرنے اور اپنے اخلاق کو سدھارنے، حسد و کینہ، تکبر و عجب کی نحوستوں سے خود کو پاک کرنے کی جانب ان کو کوئی دھیان نہیں ہوتا؛ حال آں کہ یہ ان پر دوسروں کی اصلاح سے زیادہ

ضروری تھا اور اس کے مقابلے میں دوسروں کی اصلاح زیادہ سے زیادہ فرضِ کفایہ ہے؛ مگر یہ لوگ اس کو فرضِ عین سے زیادہ اہم وضروری سمجھتے اور سمجھاتے ہیں اور خود فرضِ عین کے تارک بنے رہتے ہیں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اولاً خود کو درست کرنے کی جانب توجہ دی جائے؛ نیز اپنے ماتحتوں جیسے اولاد، بیوی، بھائی و بہن وغیرہ کی اصلاح کی جانب توجہ کی جائے اور اسی کے ساتھ دوسروں کی اصلاح کے لیے کام کیا جائے؛ مگر یہ کہ ساری فکر دوسروں کے لیے ہو اور خود کو اور اپنے ماتحتوں کو چھوڑ دیا جائے، یہ عقلاً وشرعاً دونوں طرح غلط ہے۔

اسی سلسلے میں ایک کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ فرضِ کفایہ میں بھی بعض وقت لوگ سب کے سب کسی ایک جانب متوجہ ہو جاتے ہیں، حتی کہ دوسرے فرضِ کفایہ امور، تعطل کا یا کم از کم بے توجہی کا شکار ہو جاتے ہیں؛ مگر یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ قرآن نے اس غلطی پر تنبیہ کی ہے۔

چناں چہ ایک جگہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ﴾ (التوبۃ:۱۲۲)

(اور مسلمانوں کو یہ نہیں چاہیے کہ سب کے سب جہاد میں نکل جائیں؛ لہٰذا ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جہاد میں جائے؛ تا کہ باقی لوگ دین میں تفقہ حاصل کریں اور جب وہ جہاد میں گئے ہوئے لوگ واپس ہوں، تو ان کو ڈرائیں؛ تا کہ وہ بچیں۔)

اس میں جہاد جیسے عظیم کام میں بھی سب کو لگ جانے کی ممانعت کی گئی ہے اور

ہدایت دی گئی ہے کہ اگر کچھ لوگ جہاد میں جائیں، تو دوسرے لوگ تعلیم وتعلم میں لگیں اور دینی بصیرت حاصل کریں۔

حقیقت ورسمیت میں ترجیح

ترجیح کے سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ اسلام میں رسمیت کے مقابلے میں حقیقت کو ترجیح حاصل ہے اور یہ ایک بدیہی و واضح امر ہے؛ لہٰذا اہلِ اسلام کو اس جانب بہت توجہ دینا چاہیے کہ جو کام بھی کریں، اس میں حقیقت پائی جائے، نہ یہ کہ صرف رسمیت پر اکتفا کیا جائے۔

غالبًا بعض حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو مروی ہے کہ ہم پہلے ایمان سیکھتے تھے، پھر قرآن سیکھتے تھے، اس سے یہی مراد ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم قرآنِ کریم کو رسم کے طور پر از اول تا آخر پڑھ کر ختم نہیں کر دیتے تھے، اسی طرح صرف الفاظِ قرآن کے یاد کر لینے پر کفایت نہیں کرتے تھے؛ بل کہ وہ حضرات حفظِ قرآن اور قرآن کے احکام ومسائل کو صرف رسمی طریقے سے سیکھنے کے بہ جائے ایمان وعقائد اور حلال وحرام سے متعلق احکام کو بڑی گیرائی وگہرائی کے ساتھ سیکھتے اور ان میں رسوخ حاصل کرتے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے تھے۔

چناں چہ جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

”تعلمنا الإيمان قبل أن نتعلم القرآن، ثم تعلمنا القرآن، فازددنا به إيمانا.“

(ہم نے قرآن سیکھنے سے پہلے ایمان سیکھا پھر ہم نے قرآن سیکھا، پس اس سے ہمارے ایمان میں اضافہ ہوگیا۔)(۱)

---

(۱) سنن ابن ماجة: ۶۱، السنن للبيهقي: ۵۴۹۸، المعجم الكبير للطبراني: ۱۶۵۶، الإيمان لابن مندة: ۲۰۸، شعب الإيمان: ۵۰

بیہقی وطبرانی رحمہما اللہ کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ آپ نے فرمایا:

" فإنكم اليوم تعلمون القرآن قبل الإيمان."

(تم لوگ آج ایمان سے پہلے قرآن سیکھتے ہو۔)

اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

" ولقد عشنا برهة من دهرنا ، و أحدنا يؤتي الإيمان قبل القرآن."

(ہم نے ایک زمانہ ایسا گزارا ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کو قرآن سے پہلے ایمان دیا جاتا تھا۔)(۱)

اور حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا:

"إنا قوم أوتينا الإيمان قبل أن نؤتي القرآن، و أنكم قوم أوتيتم القرآن قبل أن تؤتوا الإيمان."

(ہم وہ لوگ ہیں کہ ہمیں قرآن سے پہلے ایمان دیا گیا اور تم وہ لوگ ہو کہ تمھیں ایمان سے پہلے قرآن دیا جاتا ہے۔)(۲)

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ان اقوال سے صحابہ رضی اللہ عنہم پر ہونے والی ایمانی محنت میں ترجیح و ترتیب کا اصول معلوم ہو رہا ہے کہ وہ حضرات پہلے ایمان و عقیدے و ضروری احکام سیکھتے تھے اور ایمان بناتے تھے۔

اور اس قرآن سے پہلے ایمان بنانے سے مراد یہی ہے کہ قرآن کو مکمل حفظ کر لینے یا پورا قرآن از اول تا آخر رسمی طریقے سے پڑھ لینے کے بہ جائے قرآن کو اس طرح پڑھتے تھے کہ دو چار آیات یا پانچ دس آیات پر یا کسی ایک سورت پر غور و خوض

---

(۱) السنن للبيهقي:۵۴۹۶، المستدرک للحاکم:۱۰۱

(۲) السنن الكبرى للبيهقي:۵۴۹۷، سنن سعيد بن منصور:۴۸، القضاء و القدر للبيهقي:۳۲۷

کرتے، ان آیات اور سورتوں کے مقصد و منشا کو پانے کی جد و جہد کرتے تھے اور اس میں سے عقائد اور حلال و حرام اور فرائض و واجبات یعنی اہم امور کو جاننے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے تھے۔

لہٰذا ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ سب سے پہلے قرآن سے ایمان و عقیدے کا علم حاصل کرے اور اپنے ایمان کو اس کی روشنی میں صحیح کرے، اسی طرح دوسرے اہلِ اسلام کو بھی پہلے ایمان و عقیدے کی تعلیم دی جائے اور اس کا بھرپور اہتمام کیا جائے۔

ابن ماجہ کے محشی علامہ عبد الغنی رحمۃ اللہ، حضرت جندب بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے حاشیے میں لکھتے ہیں:

" و استفيد منه أن تعلم علم العقائد قبل تعلم الفقه والقرآن."(۱)

(اس سے یہ بات مستفاد ہوئی کہ عقائد کا علم حاصل کرنا، فقہ و قرآن کے علم سے پہلے ہونا چاہیے۔)

یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ان اقوال کا یہ مطلب نہیں کہ ایمان کامل ہونے تک قرآن ہی نہ پڑھا جائے اور دوسرے احکامِ شرعیہ اس وقت تک نہ سیکھے جائیں، جب تک کہ ایمان میں رسوخ و مضبوطی نہ آ جائے۔ یہ اس کا مطلب لینا صحیح نہیں؛ بل کہ مطلب وہ ہے جو ابھی بیان کیا گیا، ایک تو اس لیے کہ ایمان کا کامل ہونا، ایک طولِ طویل کام ہے اور یہ زندگی بھر چلتا رہتا ہے، دوسرے اس لیے کہ ایمان کو مضبوط و کامل کرنے کا طریقہ تو خود قرآن پڑھنا اور اس کے احکام سیکھنا اور ان پر عمل کرنا ہے۔

چناں چہ اس کی وضاحت خود حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے ارشاد سے ہوتی

---

(۱) إنجاح الحاجة:۷

ہے، چناں چہ آپ نے اوپر نقل کردہ جملے کے بعد یہ فرمایا:

" و تنزل السورة علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم فیتعلم حلالها ، و حرامها ، و ما ینبغي أن یوقف عنده فیها کما تعلمون أنتم القرآن."

(حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی سورت نازل ہوتی، تو ہم میں سے ہر ایک اس کے اندر کے حلال وحرام کا علم حاصل کرتا اور یہ کہ کہاں اس میں سے غور وفکر کے لیے ٹھہرے، جیسا کہ تم لوگ قرآن سیکھتے ہو۔)

پھر فرمایا:

"لقد رأیت رجالا یؤتی أحدهم القرآن فیقرأ ما بین فاتحته إلی خاتمته ، ما یدري ما آمره ، و لا زاجره ، ولا ما ینبغي أن یوقف عنده منه ، ینثر نثر الدقل."

(میں لوگوں کو دیکھ رہا ہوں کہ ان میں سے ایک کے پاس قرآن لایا جاتا ہے، وہ اس کو از اول تا آخر پڑھ لیتا ہے، لیکن یہ نہیں جانتا کہ کون آیت حکم دینے والی اور کون آیت زجر وتنبیہ کرنے والی ہے اور نہ یہ جانتا ہے کہ کہاں وقف کرے، بس سوکھی خراب کھجوروں کے طرح سب کو پھیلا دیتا ہے۔)(۱)

اور علما نے بھی یہی مطلب ان ارشادات کا سمجھا ہے، علامہ ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کے الفاظ: " قد أوتي القرآن من قبل أن یؤتی الإیمان " کا مطلب ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

---

(۱) السنن للبیهقي:۵۴۹۶، المستدرک للحاکم:۱۰۱

"يريد : أنه قد حفظ القرآن . و أحكم حروفه ، و ضيع حدوده."(۱)

(آپ کی مراد اس سے یہ ہے کہ قرآن حفظ کر لیا اور حروف کی ادائیگی میں مضبوطی پیدا کر لی؛ مگر قرآن کے اندر بیان کردہ حدود واحکام کو ضائع کر دیا۔)

معلوم ہوا کہ ان صحابہ رضی اللہ عنہم کا مطلب "قرآن دیے جانے سے پہلے ایمان دیے جانے کا" یہ ہے کہ قرآن حفظ کرنے یا پورا پڑھ لینے سے پہلے قرآن کے حدود واحکام کو سمجھنے اور ان پر عمل کی مشق کیا کرتے تھے۔

علامہ ابن عبدالبر مالکی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"صحابۂ کرام جو اس قرآن کے پہلے مخاطب ہیں، ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں سوائے چند کے مکمل قرآن حفظ کرنے والے نہیں تھے اور سب حضرات قرآن کے معانی میں غور وفکر کرتے، اس کی تفسیر معلوم کرتے، اس کے احکام یاد کرتے اور ان میں سے بعض قرآن کے عالم ایسے تھے، جو قرآن کے بہت سے احکام کو جانتے تھے، حال آں کہ وہ قرآن کی سب سورتوں کے حافظ نہ ہوتے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم قرآن سے پہلے ایمان سیکھتے تھے اور ایک قوم آخر زمانے میں ایسی آئے گی، جو ایمان سے پہلے قرآن پڑھے گی۔"(۲)

الغرض صحابہ رضی اللہ عنہم کا طرزِ تعلیم یہ تھا کہ وہ قرآن کے ایک ایک حصے کو اور اس کی

---

(۱) غريب الحديث:۲/۲۵۳

(۲) التمهيد لابن عبد البر:۱۴/۱۳۳

ایک ایک سورت کو یا اس کی چند آیات کو پڑھتے، ان پر غور وخوض کرتے، ان کے معانی وحقائق کو سمجھتے اوران پر عمل کی کوشش کرتے تھے۔

ان کا طریقہ صرف ظاہر داری ورسم پرستی کے طور پر از اول تا آخر قرآن پڑھ کر ختم کردینے کا نہیں تھا، جیسا کہ بعد کے دوروں میں یہ صورت حال پیدا ہوگئی اور آج اس میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

اسی طرح نماز وروزہ، حج وزکوۃ ودیگر عبادات میں بھی ہمارے اندر آج رسمیت وظاہرداری پیدا ہوگئی ہے؛ اس لیے یہ ساری عبادات روح وحقیقت سے خالی ہوتی جارہی ہیں؛ لہٰذا اس کی کوشش وفکر ہونا چاہیے کہ ہم صرف رسمیت کے بہ جائے حقیقت کی جانب رجوع کریں۔

فرائض وسنن ومستحبات میں ترجیح

یہ بات طے شدہ ہے کہ فرائض کا درجہ اسلام میں غیرِ فرض پر بڑھا ہوا ہے اور اس لیے اس کو تمام اور چیزوں پر ترجیح ہے؛ مگر اس میں بہت سے لوگ غفلت برتتے ہیں اور غیرِ فرض کے مقابلے میں سنن ومستحبات ونوافل کا زیادہ اہتمام والتزام کرتے ہیں، جس کی مثالیں وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہتی ہیں۔

ہم نے دیکھا ہے کہ بعض سالکین اپنے شیخ کے بتائے ہوئے اوراد ووظائف کا اس قدر اہتمام والتزام کرتے ہیں کہ کیا مجال ہے کہ ذرا سا کوئی اس میں فرق آجائے؟ مگر وہی لوگ نماز وتلاوت ومتعلقین ورشتہ داروں کے حقوق وغیرہ فرض امور میں برابر کوتاہی کرتے رہتے ہیں، حتی کہ اس طرف توجہ دلانے کے باوجود ان کے نزدیک ان امور کی کوئی اہمیت پیدا نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے فرض وواجب کا وہ درجہ نہیں سمجھا، جو ایک نفلی کام کا ان کے نزدیک ہے۔

اسی طرح بعض لوگ نفلی حج کا تو بڑا اہتمام کرتے اور بعض لوگ تو سال بہ سال حج کرتے ہیں، مگر نمازِ فرض سے برابر غفلت برتتے ہیں؛ حتی کہ جب حج کے لیے جاتے ہیں، تو خود مکۃ المکرّمہ میں بھی نمازوں سے غفلت کرتے ہیں؛ حال آں کہ ایک بدیہی بات ہے کہ نماز روزانہ پانچ وقت فرض ہے اور حج زندگی میں ایک بار وہ بھی صاحبِ حیثیت پر فرض ہے اور اس سے زائد حج محض نفل ہے۔

اسی کی ایک فرع یہ ہے کہ بعض لوگ حج پر حج اور عمرے پر عمرہ کرتے رہتے ہیں؛ مگر ان کے اپنے قریبی متعلقین و رشتہ داروں میں ضرورت مند و حاجت مند لوگ انتہائی کسمپرسی کی حالت سے گزارا کرتے رہتے ہیں اور ان لوگوں پر کسی نہ کسی درجے میں ان کی خبر گیری و امداد و تعاون ضروری ہوتا ہے؛ لیکن یہ لوگ اس کو نظر انداز کرتے اور ایک نفل کو اس پر ترجیح دیتے ہیں۔

امام غزالی رحمہ اللہ نے "إحياء العلوم" میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ذکر کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

"اخیر زمانے میں بلا وجہ حاجیوں کی بہتات ہو جائے گی، ان کے لیے سفر آسان ہو جائے گا، ان کے رزق میں کشادگی ہو جائے گی، مگر وہ حج سے محروم و خالی ہاتھ لوٹیں گے، ان میں سے ایک ایک کی سواری اسے صحراؤں اور ویرانوں میں لیے پھرے گی؛ حال آں کہ اس کا پڑوسی اسی کے پہلو میں تنگ دستی کا شکار پڑا ہوا ہے، یہ اس سے ہمدردی نہیں کرتا۔" (۱)

امام غزالی رحمہ اللہ نے اسی جگہ حضرت بشر حافی رحمہ اللہ کا ایک عبرت خیز واقعہ بھی نقل کیا ہے، وہ کہ ان کے شاگرد حضرت ابونصر التمار رحمہ اللہ کہتے ہیں:

---

(۱) إحياء العلوم: ۳/۴۰۹

''ایک شخص حضرت بشر حافی رَحِمَہُ اللّٰہُ کے پاس نفلی حج کو جاتے ہوئے ان کو الوداع کہنے آیا اور نصیحت کا خواہش مند ہوا، آپ نے اس سے پوچھا کہ حج کے لیے کتنا خرچ جمع کیا ہے؟ اس نے کہا کہ دو ہزار درہم، آپ نے فرمایا کہ تم اس حج سے کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہو: دنیا سے بے نیازی یا بیت اللہ کی زیارت کا شوق پورا کرنا یا اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی؟ اس نے عرض کیا کہ اللہ کی رضا جوئی مقصد ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تمھیں یہ مقصد گھر بیٹھے حاصل ہو جائے اس طرح کہ تم اس رقم کو خرچ کر دو اور یہ یقین رکھو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو جائے گی، تو کیا ایسا کرنے تیار ہو؟ اس نے کہا کہ ہاں! بشر حافی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے کہا کہ پھر جاؤ! یہ رقم دس قسم کے لوگوں پر خرچ کر دو، قرض دار کو کہ وہ اپنا قرضہ ادا کر دے، فقیر کو؛ تاکہ وہ اپنا بکھرا ہوا شیرازہ سمیٹ سکے، عیال دار کو کہ وہ اپنی اولاد کو کھلائے، کسی یتیم کے مربی کو؛ تاکہ وہ اس کو خوش کر سکے اور اگر تیرا دل قوی ہے؛ تو ان میں سے کسی ایک ہی کو سب دے دے؛ کیوں کہ کسی مسلمان کا دل خوش کرنا، مظلوم کی دادرسی کرنا، کسی کی تکلیف کو دور کرنا اور کسی کمزور کی مدد کرنا فرض حج کے بعد کیے جانے والے سو حجوں سے افضل ہے؛ لہٰذا اٹھو اور جیسے میں نے کہا اس طرح کرو، ورنہ مجھے بتاؤ کہ تمھارے دل میں کیا ہے؟ حضرت ابو نصر رَحِمَہُ اللّٰہُ کہتے ہیں کہ اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا کہ اے ابو نصر! میرے دل میں سفر کا عزم پختہ ہو چکا ہے۔ حضرت بشر حافی رَحِمَہُ اللّٰہُ ہنسنے لگے اور اس سے کہا کہ جب مال، تجارت کے میل کچیل وشبہات سے جمع کیا جاتا ہے، تو نفس کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس سے

کوئی حاجت پوری کرو اور وہ مختلف نیکی ظاہر کرتا ہے، مگر اللہ نے قسم کھائی ہے کہ وہ اس شخص کے علاوہ کسی کا عمل قبول نہیں کرے گا، جو پورے عزم ویقین کے ساتھ ادا کرے۔‘‘(۱)

اسی طرح دیکھا گیا ہے کہ بعض عورتیں محرم ساتھ نہ ہونے کے باوجود حج پر جاتی ہیں اور اس کے لیے ایڑی چوٹی کا زور بھی لگاتی ہیں، حال آں کہ جن عورتوں کے ساتھ محرم نہیں ہے، ان کو حج پر جانا منع ہے؛ مگر وہ اس ممنوع کی کوئی پرواہ نہیں کرتیں اور جوان پر واجب وضروری نہیں اس کا اہتمام کرتی ہیں۔ مسئلۂ شرعیہ یہ ہے کہ عورت پر حج فرض ہونے کے لیے ساتھ میں جانے والا کوئی محرم یا شوہر کا ہونا ضروری ہے اور یہ بھی کہ محرم کا خرچہ بھی عورت کے پاس ہو؛ لہٰذا جس عورت کے ساتھ شوہر یا کوئی محرم ہو اور اس کے پاس اپنے حج کے خرچ کے علاوہ اپنے محرم کا خرچ بھی ہو، اس پر حج فرض ہوگا؛ ورنہ بعض فقہا کے نزدیک اس پر حج ہی سرے سے فرض نہیں اور بعض کے نزدیک ادائیگی فوری لازم نہیں؛ بل کہ محرم ساتھ ہونے تک موقوف ہے، اگر کوئی محرم مل جائے، تو اس کو لے کر جائے اور اگر کوئی نہ ملا، تو وصیت کر دے کہ میرے روپئے سے میرا حج بدل کر دیا جائے۔

نوٹ: اس مسئلے کی مفصل تحقیق کے لیے ہمارا رسالہ ’’کیا عورت بغیر محرم سفر حج کر سکتی ہے؟‘‘ دیکھو!

اسی طرح بعض لوگ حج فرض نہ ہونے کے باوجود لوگوں سے مانگ کر حج کے لیے جاتے ہیں؛ حال آں کہ مانگنا اسلام میں کس قدر بری بات ہے؟ مگر لوگ ایک نفل کام کے لیے ایک ناجائز کام کا ارتکاب کرنے تیار ہو جاتے ہیں۔

بعض لوگ سیرت النبی کے جلسے کرتے ہیں اور اس کا اہتمام فرض سے زیادہ

---

(۱) إحياء العلوم: ۴۰۹/۳

اہمیت سے کرتے ہیں؛ مگر نماز سے غافل رہتے ہیں، اسی طرح دیگر فرض وواجب کاموں سے روگردانی کرتے رہتے ہیں۔

یہ سب غلو دراصل اسلام میں مقررہ درجات احکام میں ترجیح وترتیب کے اصول سے لاپرواہی وغفلت کا نتیجہ ہے اور یہ بات شرعاً قابل نکیر ہے۔

ترکِ ممنوع وعمل مستحب میں ترجیح

شرع میں امرِ ممنوع وفعلِ حرام سے بچنا اس سے زیادہ ضروری ہے کہ مستحب کام کی پابندی کی جائے؛ مگر لوگ اس میں بھی بڑی غفلت کرتے ہیں اور مستحبات ونوافل کا تو بڑا اہتمام کرتے ہیں، حتی کہ تہجد واذکارِ مسنونہ ووظائفِ مستحبہ کا التزام بڑی شدت کے ساتھ کرتے ہیں؛ لیکن صریح حرام وناجائز امور سے بچنے کا کوئی اہتمام نہیں کرتے، حال آں کہ محرمات وممنوعات سے بچنا فرض ہے اور یہ اذکار ووظائف یا تہجد ونوافل لازم وضروری نہیں۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے ایک صاحب کا قصہ لکھا ہے کہ وہ نمازِ فجر کے بعد اپنے مصلے پر بیٹھ کر اذکار ووظائف بڑے اہتمام سے پڑھتے تھے اور اس کے درمیان کوئی بات چیت بالکل نہیں کرتے تھے؛ مگر اسی کے ساتھ ساتھ اسی دوران اپنے گاہکوں سے سودی معاملہ انگلیوں کے اشارے سے طے کیا کرتے تھے۔ ان صاحب کے نزدیک وظیفہ وذکر تو اتنا اہم تھا کہ اس کو کبھی ناغہ نہیں کرتے تھے اور اس میں بات چیت سے بھی احتراز و پرہیز کرتے تھے، جو کہ ایک حلال ومباح کام ہے؛ مگر سودی لین دین جو قطعی حرام ہے اور جس پر بڑی سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں، اس سے کوئی پرہیز نہیں۔

اسی طرح عموماً دیکھا جاتا ہے کہ لوگ نفل روزوں، نفل حج کا، عمروں پر عمرے کا خوب اہتمام کرتے ہیں؛ مگر اسی کے ساتھ حرام کاروبار بھی کرتے ہیں، غیبت،

جھوٹ، دھوکہ بازی وغیرہ حرام کاموں میں بھی ملوث رہتے ہیں، حال آں کہ یہ نفل روزہ نہ رکھتے، نفل حج نہ کرتے یا عمرہ نہ کرتے اور حرام کاموں سے بچتے؛ تو یہ بات ان کے حق میں بہتر ہوتی۔

اسی لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے پوچھا کہ ایک آدمی وہ ہے، جو گناہ بھی کم کرتا ہے اور نیکی بھی کم اور دوسرا وہ ہے جو گناہ بھی زیادہ کرتا ہے اور نیکی بھی زیادہ، ان میں سے آپ کے نزدیک کون پسندیدہ ہے؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”لا أعْدِلُ بِالسَّلامَةِ شَيْئًا.“

(میں سلامتی کے برابر کسی چیز کو نہیں سمجھتا)(۱)

یعنی گناہ سے بچ کر سلامتی پالینا وہ عمل ہے، جس کے برابر کوئی اور عمل نہیں ہوسکتا؛ لہٰذا گناہ سے بچنے کو ترجیح دینا چاہیے، خواہ نوافل واذکار کی پابندی نہ ہو۔

یہی وہ بات ہے جس کو بعض زاہدین نے فرمایا تھا، جب ان سے پوچھا گیا تھا کہ آپ رات کی نماز یعنی تہجد کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ تو انھوں نے فرمایا :

”خَفِ اللّٰهَ بِالنَّهَارِ ، وَ نَمْ بِاللَّيْلِ.“

(دن میں اللہ سے ڈرتے رہو اور رات بھر سو جاؤ!)(۲)

یعنی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر دن میں خوفِ خداوندی وخشیت الٰہی کا لحاظ کرتے ہوئے زندگی کی، تو پھر اس میں کوئی ملامت نہیں کہ رات بھر سو جاؤ اور ظاہر ہے کہ خوف وخشیت کی زندگی گناہ سے باز رکھتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس طرح خوف وخشیت سے دن گزارے گا؛ تو اس کو نوافل کے نہ پڑھنے پر کوئی ملامت نہیں۔

---

(۱) الزهد لابن المبارک:۱۲،أدب الدنيا و الدين للماوردي:۹۸

(۲) أدب الدنيا و الدين:۱/۱۱۷

اسی طرح منقول ہے کہ ایک بزرگ نے کسی کو سنا کہ اپنی قوم سے یہ کہہ رہا ہے :

”لوگو! تم کو نیند نے ہلاک کر دیا، تو وہ بزرگ فرمانے لگے : نہیں ! بل کہ ان کو بیداری نے ہلاک کیا ہے۔“(۱)

یعنی رات کو اٹھ کر نوافل نہ پڑھنے سے یہ ہلاک نہیں ہوئے ؛ بل کہ دن میں بیدار ہوتے ہوئے خدا کی معصیت کرنے سے ہلاک ہوئے ؛ لہٰذا راتوں کی عبادت سے اور نوافل ووظائف سے ضروری یہ ہے کہ گناہ سے باز آ جائیں۔

حضرت حسن بصری رَحِمَہُ اللّٰہُ نے فرمایا:

”مَا عَبَدَ العَابِدُوْنَ بِشَيْءٍ أَفْضَلَ مِنْ تَرْكِ مَا نَهَاهُمُ اللّٰهُ عَنْهُ“

(عبادت کرنے والوں نے کوئی عبادت اللہ کی منع کردہ چیزوں سے بچنے و چھوڑنے سے زیادہ بہتر نہیں کی)(۲)

اور حضرت ابن المبارک رَحِمَہُ اللّٰہُ نے کہا:

”میں ایک مشتبہ درہم لینے کو چھوڑ دوں، یہ مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں ایک لاکھ درہم کا صدقہ دوں۔“(۳)

اس طرح کہتے کہتے انھوں نے چھے لاکھ تک گن لیا۔

اور حضرت عمر بن عبد العزیز رَحِمَہُ اللّٰہُ کہتے ہیں:

”میں چاہتا ہوں کہ فرض و وتر نماز کے علاوہ کوئی نفل نہ پڑھوں، زکاۃ کے سوا کوئی صدقہ نہ دوں، رمضان کے روزوں کے سوا کوئی روزے نہ رکھوں اور حج فرض کے سوا کوئی نفل حج نہ کروں، پھر میری پوری قوت و

---

(۱) أدب الدنیا و الدین:۱/۱۱۷

(۲) جامع العلوم و الحکم:۹۶

(۳) جامع العلوم و الحکم:۹۶

طاقت کو اللہ کے حرام کردہ چیزوں سے بچنے میں لگا دوں۔‘‘(۱)

ان سارے اقوال سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو گناہ سے بچنے کا بڑا اہتمام کرنا چاہیے، اگر فرائض پر آدمی اکتفا کر لے اور ساری قوت و طاقت گناہوں سے بچنے میں لگا دے، تو یہ اس کے حق میں نوافل و اذکار و وظائف سے افضل ہے۔

حقوق اللہ و حقوق العباد میں ترجیح

حقوق اللہ و حقوق العباد میں سے اسلام میں ترجیح، حقوق العباد کو حاصل ہے، اگر ایک شخص حقوق اللہ میں کوتاہی کرنے کے باوجود حقوق العباد کا پاس و لحاظ رکھتا ہو، تو توبہ و استغفار کی وجہ سے امید مغفرت ہو سکتی ہے؛ مگر ایک شخص حقوق اللہ کی پوری پاس داری و اہتمام کے باوجود حقوق العباد میں کوتاہی کرے، تو محض توبہ و استغفار یہاں کافی نہیں، جب تک کہ عباد اللہ کی جانب سے بھی معافی نہ ہو جائے اور وہ اپنے اپنے حقوق کو معاف نہ کر ڈالیں۔

معلوم ہوا کہ اسلام میں حقوق اللہ پر حقوق العباد کو ترجیح دی گئی ہے؛ لہٰذا ایک مطیع و فرماں بردار انسان کو حقوق اللہ کی ادائیگی کے ساتھ اس کا بھی خوب خوب اہتمام کرنا چاہیے کہ حقوق العباد میں کوئی کوتاہی نہ ہو، تمام کے حقوق درجہ بہ درجہ ادا کیے جائیں۔

مگر اس معاملے میں بھی لوگوں کا رویہ غلو آمیز ہے کہ وہ یا تو اللہ کے حقوق بھی ضائع کرتے ہیں اور بندوں کے بھی اور اگر کچھ دین داری کی جانب رجوع کرتے ہیں تو عموماً یہ ہوتا ہے کہ نماز، روزہ، زکوۃ و حج؛ نیز نوافل و سنن اور اذکار و وظائف کی پابندی ہی میں دین کو منحصر سمجھ کر ان کا خوب خوب اہتمام کرتے ہیں؛ لیکن ماں باپ

---

(۱) جامع العلوم والحکم:۹۶

کے حقوق، رشتہ داروں کے حقوق، بھائی بہنوں کے حقوق، پڑوسیوں و احباب کے حقوق، سب کو ضائع کرتے رہتے ہیں، حتی کہ یہ بھی دیکھنے و سننے میں آیا کہ بعض لوگ دین داری کے نام پر خود اپنے بیوی بچوں کے نان ونفقہ میں بھی کوتاہی کر جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ وہ لوگ بھی ہیں جو دین داری کا لبادہ اوڑھنے کے باوجود کسی کا حق دبا لینے، قرض لے کر واپس نہ کرنے، قرض خواہوں کو ٹالتے رہنے کے عادی بنے ہوئے ہوتے ہیں۔

یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام میں کسی کے بھی حق کو ضائع کرنے کی اجازت نہیں ہے؛ یہاں تک کہ بعض اہم و اعلیٰ درجے کی طاعات، جو بہت سارے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہیں، حقوق العباد کی کوتاہی ان سے بھی معاف نہیں ہوتی۔

مثلاً جہاد میں جا کر اللہ کے راستے میں شہادت پانا ایک اعلیٰ درجے کی عبادت و طاعت ہے اور اس پر گناہوں کا کفارہ ہونے کی بشارت بھی وارد ہے؛ مگر قرض کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"يُغْفَرُ لِلشَّهِيدِ كُلُّ ذَنْبٍ إِلَّا الدَّيْنَ."

(شہید کے تمام گناہ سوائے قرض کے بخش دیے جاتے ہیں۔)(۱)

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور سوال کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کیا فرماتے ہیں کہ اگر میں "جہاد فی سبیل اللہ" میں مارا جاؤں، تو کیا میرے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا؟

---

(۱) الصحیح للمسلم:۴۹۹۱، مسند أحمد:۷۰۵۱، المستدرک للحاکم:۲۵۵۴، مستخرج أبي عوانة:۵۹۳۵

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں !اگر تو اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہوئے مارا جائے، جب کہ تم صبر کرتے ہوئے، ثواب کی نیت کے ساتھ، بغیر اس سے منہ موڑے جہاد کرے، تو گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ جب وہ شخص واپس ہونے لگا، تو آپ نے اس کو پکارا اور پوچھا کہ تو نے کیا سوال کیا تھا؟ اس نے سوال لوٹایا، آپ نے جواب میں فرمایا: ہاں ! سب گناہ بخش دیے جائیں گے؛ مگر قرض معاف نہ ہوگا؛ کیوں کہ مجھے جبریل نے یہی بتایا ہے۔(۱)

امام نووی رحمہ اللہ اور ان ہی کے حوالے سے علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ان احادیث کے پیشِ نظر لکھا ہے:

"ففيه تنبيه على جميع حقوق الآدميين ، وأن الجهاد و الشهادة ، و غيرهما من أعمال البر لا يكفر حقوق الآدميين ، و إنما يكفر حقوق الله تعالى".

(پس اس حدیث میں تمام انسانوں کے حقوق پر توجہ دلائی گئی ہے اور یہ کہ جہاد اور شہادت وغیرہ نیک اعمال انسانوں کے حقوق کا کفارہ نہیں بنتے؛ بل کہ وہ صرف حقوق اللہ کا کفارہ بنتے ہیں۔)(۲)

اور علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ نے "كشف المشكل" میں لکھا ہے:

"وهذا الحديث يتضمن التحذير من الدين لأن حقوق المخلوقين صعبة شديدة الأمرتمنع دخول الجنة حتى تؤدى و قد كان عليه الصلاة والسلام يمتنع في أول

---

(۱) الصحيح للمسلم:۴۹۸۸،سنن الترمذي:۱۲/۱۷،مسند أحمد:۲۲۶۳۸،السنن الكبرى للنسائي:۴۳۵۰،مستخرج أبي عوانة:۵۹۳۰

(۲) شرح المسلم للنووي:۱۳۵/۲،الديباج:۴۷۶/۴

الإسلام من الصلاة على ذي الدين ، كل ذلك للتحذير من حقوق المخلوقين ، فكيف بالظلم ؟"

(یہ حدیث قرض سے ڈرانے پر مشتمل ہے؛ کیوں کہ مخلوق کے حقوق کا مسئلہ بڑا مشکل اور سخت ہے، جو ان کی ادائیگی تک جنت میں داخلے سے روکتا ہے اور شروع اسلام میں اللہ کے نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اس شخص کی نماز جنازہ نہیں پڑھتے تھے، جس پر قرض ہوتا ، یہ سب قرض سے لوگوں کو ڈرانے کے لیے ہے،تو کیا خیال ہے کسی پر ظلم کرنے کے بارے میں؟)(۱)

الغرض غلو کی ایک شکل وصورت یہ ہے کہ حقوق العباد میں کوتاہی کی جائے اور حقوق اللہ کے اہتمام پر اطمینان کرلیا جائے۔

کتاب اللہ ورجال اللہ میں تفریق

غلو فی الدین کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی پایا جاتا ہے کہ کتاب اللہ ورجال اللہ میں تفریق کی جائے۔

ہدایت کے دو سلسلے

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے دنیا میں دو عظیم الشان سلسلے جاری فرمائے ہیں: ایک کتاب اللہ کا کہ آسمانی کتابوں کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا پیغام اور اس کے ذریعے سے نجات کا سامان اور اپنے احکام وفرامین ہر ہر باب کے بارے میں نازل فرمائے۔ اور دوسرا: رجال اللہ کا سلسلہ کہ اپنی کتاب کی نظریاتی وعملی تعلیم وتفہیم اور اس کی توضیح وتشریح کے لیے اپنے

(۱) کشف المشکل:۱/۴۰۸

پیغمبروں اور رسولوں کا سلسلہ جاری کیا۔

اور پھر یہ سلسلہ ہر دور میں اس طرح جاری کیا کہ ان رسولوں و پیغمبروں کے وارثین و جانشین پیدا ہوئے، جو ان سے اللہ کی کتاب و اس کے احکام و فرامین کو علماً و عملاً حاصل کیا کرتے تھے اور پھر ان کے بھی اسی طرح جانشین و وارثین ہوئے، یہاں تک کہ یہ سلسلہ آج تک برابر جاری ہے؛ تاکہ کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ یہ رجال اللہ بھی قائم رہیں اور کتاب اللہ و قانونِ خداوندی کے حقائق و معارف، احکام وفرامین کی تشریح و تفہیم مستند و معتبر طریقے پر باقی و جاری رہے اور لوگ ان حضرات سے ان پر عمل کا طریقہ و سلیقہ بھی سیکھتے رہیں۔

کتاب اللہ کے ساتھ رجال اللہ کی ضرورت

اور یہ دونوں کے دونوں سلسلے انسانوں کی ہدایت کے لیے انتہائی ضروری ہیں، اگر ایک سے بھی صرفِ نظر کیا جائے گا؛ تو وہیں سے گمراہی کی جانب ایک سوراخ پیدا ہو جائے گا؛ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نہ صرف کتاب پر اکتفا فرمایا اور نہ محض رسولوں کو بھیجنے پر کفایت کیا؛ بل کہ دونوں کو جاری کیا۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ جس طرح انسان کے سامنے ہدایت نامہ چاہیے، اسی طرح اس ہدایت نامے پر چلنے و چلانے کے لیے ایسی شخصیات بھی درکار ہیں، جو ہدایت نامے کی ساری حقیقتوں و تفصیلات سے بہ خوبی واقف ہوں، ان کو فہم و بصیرت کا خاص حصہ عطا ہوا ہو اور ان کو یہ باتیں خود ہدایت نامہ دینے والے کی جانب سے حاصل ہوئی ہوں؛ تاکہ کتاب کو کما حقہ سمجھا بھی جا سکے اور اس پر عمل کی صورت بھی معلوم ہو جائے۔ اگر کتاب اللہ تو سامنے ہو؛ مگر کوئی واقفِ کتاب (رسول یا اس کا نائب) سامنے نہ ہو، اس کی تعلیم و تشریح سامنے نہ ہو اور اس کا اسوہ و طریقہ پیشِ نظر نہ ہو، تو

ہوسکتا ہے کہ مقصودِ خداوندی ومنشائے الٰہی تک عام انسان کی رسائی نہ ہو اور وہ اپنی عقل وسمجھ کو حاکم وفیصل بنا کر راہ ہدایت سے بھٹک جائے، اسی طرح اگر کتاب و قانون خداوندی سامنے نہ ہو اور صرف رسول و نبی کی تعلیم واسوہ پیشِ نظر ہو تو ہوسکتا ہے کہ انسان کی نظر صرف نبی ورسول پر رک جائے اور وہ خدائی قانون و کتاب سے خود کو بے نیاز سمجھ بیٹھے اور اس طرح خدا کے بہ جائے نبیوں ورسولوں ہی کو سب کچھ سمجھ جائے؛ لہٰذا ایک جانب کتاب اللہ کو ضروری ٹھیرایا گیا، تو دوسری طرف رجال اللہ (رسول اور ان کے تربیت یافتہ اور جانشین حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور پھر ان کے بعد ان کے نقش قدم پر چلنے والے اور ان کے فیض یافتہ حضرات اور اسی طرح طبقاً بعد طبقٍ، آج تک کے وارثین انبیا) کو بھی لازم گردانا گیا۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر ''معارف القرآن'' میں اس پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اسی سلسلے میں فرماتے ہیں:

> ''بعض لوگ کتاب اللہ کو نظر انداز کر کے صرف علما ومشائخ ہی کو قبلۂ مقصود بنا لیتے ہیں اور ان کے متبعِ شریعت ہونے کی تحقیق نہیں کرتے اور یہ اصلی مرض یہود و نصاریٰ کا ہے کہ ﴿اتَّخَذُوْا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَاباً مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (ان لوگوں نے اپنے علما ومشائخ کو اللہ کے سوا اپنا معبود اور قبلۂ مقصود بنا لیا) ظاہر ہے کہ یہ راستہ شرک و کفر کا ہے اور لاکھوں انسان اس راستے میں برباد ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں بعض لوگ وہ بھی ہیں، جو علوم قرآن وحدیث کے حاصل کرنے میں کسی معلم ومربی کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف اللہ کی کتاب کافی ہے، نہ ماہر علما کی ضرورت، نہ تربیت یافتہ مشائخ کی حاجت، یہ دوسری گمراہی ہے، جس کا نتیجہ دین و

ملت سے نکل کر نفسانی اغراض کا شکار ہونا ہے؛ کیوں کہ ماہرین کی امداد واعانت کے بغیر کسی فن کا صحیح حاصل ہو جانا انسانی فطرت کے خلاف ہے، ایسا کرنے والا یقیناً غلط فہمیوں کا شکار ہوتا ہے اور یہ غلط فہمی بعض اوقات اس کو دین وملت سے بالکل نکال دیتی ہے۔"(۱)

جب یہ واضح ہو گیا کہ کتاب اللہ ورجال اللہ دونوں کی انسانوں کو ضرورت ہے، تو یہیں سے سمجھ میں آ گیا کہ ان دونوں میں تفریق کرنا بھی غلو فی الدین کا ایک بڑا دروازہ ہے۔ چناں چہ یہود ونصاریٰ نے یہی کیا اور گمراہ ہوئے، کبھی کتاب اللہ کو ہٹا کر شخصیت پرستی میں مبتلا ہوئے، تو کبھی شخصیت کا انکار کر کے غلو کے مرتکب ہوئے۔

اہلِ عقیدت کا کتاب اللہ سے انحراف

اسی طرح اس امتِ محمدیہ میں بھی بعض لوگ شخصیات پر اعتماد ویقین اور عقیدت ومحبت میں غلو کرتے کرتے یہاں تک پہنچ گئے کہ کتاب اللہ کو نظر انداز کر گئے۔ اب ان کو کتاب اللہ واحادیثِ نبویہ کے احکام دکھایئے اور دلائل پر دلائل دیتے جایئے، وہ کہیں گے کہ ہم کو فلاں بزرگ کی بات یا عمل کافی ہے، کسی اور چیز کو ہم نہیں جانتے۔

بعض طبقات میں کتاب وسنت کو چھوڑ کر صرف اولیاء اللہ کے نام وعقیدت کی بنا پر، یا ان کے کچھ مجمل جملوں وملفوظات کی بنیاد پر، یا غلبۂ حال میں صادر ہوئے چند اقوال وشطحیات کی وجہ سے دین وشریعت کے احکام سے روگردانی کی جاتی ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ یہ حضرات اس اونچے مقام پر فائز ہیں کہ ان کو اب کتاب وسنت کی ضرورت نہیں رہی؛ بل کہ وہ بلاواسطہ اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کرتے ہیں؛ لہٰذا کتاب اللہ کے بہ جائے وہ خود قابلِ اتباع ہیں۔

---

(۱) معارف القرآن: ۱/۳۳۸

امام قرطبی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اپنی تفسیر میں حضرت موسی اور حضرت خضر علیہما السلام کے واقعے کی تفسیر میں اپنے استاذ حضرت امام ابو العباس رَحِمَہُ اللّٰہُ کے حوالے سے لکھا ہے:

''فرقۂ باطنیہ کے زندیقوں کی ایک جماعت ایک ایسے راستے کی طرف گئی ہے، جس سے احکامِ شریعت کو منہدم کرنا لازم آتا ہے، پس وہ کہتے ہیں: یہ احکامِ شرعیہ عامۃً غبی و جاہل و عام لوگوں پر لاگو کیے جاتے ہیں، رہے اولیاء اللہ اور خواص لوگ، تو وہ ان نصوص کے محتاج نہیں ہیں؛ بل کہ ان حضرات کے دل میں جو بات آتی ہے، وہی مراد ہوتی ہے اور ان کو ان باتوں کا مکلّف کیا جاتا ہے، جو ان کے قلب پر غالب ہوتی ہیں۔ نیز یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان اولیاء اللہ کے لیے یہ بات کدورتوں سے ان کے دلوں کی صفائی اور غیر اللہ سے خالی ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے، پس ان کے لیے علومِ الٰہیہ اور حقائقِ ربانیہ کی تجلی ہوتی ہے، پس وہ اسرارِ کائنات سے واقف کار اور جزئی احکام کے جان کار ہوتے ہیں؛ لہٰذا وہ حضرات احکامِ شرعیہ سے مستغنی ہیں، جیسے حضرت خضر عَلَیْہِ السَّلَامُ مستغنی تھے --امام قرطبی رَحِمَہُ اللّٰہُ کہتے ہیں-- ہمارے شیخ ابو العباس رَحِمَہُ اللّٰہُ نے کہا: یہ قول زندقہ و کفر ہے، اس کا قائل توبہ کے مطالبے کے بغیر قتل کیا جائے گا؛ کیوں کہ یہ شرعی امور میں سے جو معلوم ہیں، ان کا انکار ہے۔ پھر آگے چل کر فرماتے ہیں: خلاصہ یہ کہ علمِ قطعی و یقینِ ضروری اور اجماعِ سلف و خلف سے یہ بات حاصل ہو چکی ہے کہ احکامِ الٰہیہ جن کا مرجع امر و نہی ہے، ان کے جاننے کی کوئی سبیل سوائے اس کے نہیں ہے کہ رسول کی جانب سے

حاصل کیا جائے؛ لہٰذا جو شخص یہ کہتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی کوئی طریقہ ہے، جس سے امر و نہی معلوم ہو سکتے ہیں جس سے رسول سے استغنا ہو جاتا ہے، تو وہ کافر ہے، اسے توبہ کے مطالبے کے بغیر قتل کیا جائے گا؛ نیز اس میں ہمارے نبی ﷺ جن کو اللہ تعالیٰ نے خاتم الانبیا بنایا ہے، ان کے بعد انبیا کے ہونے کو ثابت کرنا ہے۔"(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ حضراتِ اولیاء اللہ بھی کتاب و سنت سے مستغنی نہیں ہیں، لہٰذا ان کے بارے میں یہ عقیدہ غلو و حرام؛ بل کہ جیسا کہ امام قرطبی رحمہ اللہ کی عبارت میں گزرا کہ یہ کفر ہے۔

اور یہ غلو کی وہی صورت ہے، جو یہود و نصاری میں پائی جاتی تھی کہ اپنے بڑوں کی بات کو خدائی کلام و حکم کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ جس کا ذکر قرآن نے ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے:

﴿ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ أَرْبَاباً مِنْ دُونِ اللّٰهِ ﴾

(ان لوگوں نے اپنے علما و مشائخ کو اللہ کو چھوڑ کر اپنا خدا بنا لیا) (التوبۃ :۳۱)

اس آیت کی تفسیر یہود و نصاری کے غلو کی تفصیل میں ہم درج کر آئے ہیں، وہاں دیکھی جائے۔

رجال اللہ سے اعراض کرنے والے

اور دوسرے بعض طبقات میں اس کے برعکس صورت حال یہ ہے کہ وہ کتاب کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں؛ مگر رجال سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہمیں کسی کی کوئی ضرورت نہیں اور ان میں بھی کئی قسم کے لوگ ہیں:

(۱) تفسیر القرطبي:۱۳/۳۵۸-۳۵۹

منکرینِ حدیث کی شخصیتِ رسول سے بے نیازی

(۱) ایک منکرینِ حدیث جو خود کو اہلِ قرآن کہتے ہیں، یہ لوگ قرآن کو مانتے ہیں؛ لیکن یہ کہتے ہیں کہ رسول کی تشریح و تفہیم کی ہمیں کوئی حاجت نہیں، ہم خود قرآن کو سمجھ سکتے ہیں۔

اس فتنے کا علمبر دار عبداللہ چکڑالوی ''کتابِ مناظرہ'' میں کہتا ہے:

''قرآن مجید میں دینِ اسلام کی ہر ایک چیز من کل الوجوہ مفصل و مشرح بیان ہوگئی ہے، تو اب وحیٔ خفی یا حدیث کی کیا حاجت رہی؟ بل کہ اس کا ماننا اور دینِ اسلام میں اس پر عمل درآمد کرنا سراسر کفر، شرک، ظلم، فسق ہے۔'' (۱)

اور جب قرآن کے لیے سنت وحدیث کی عدم ضرورت کا دعویٰ کیا، تو حدیث کو مشکوک قرار دینے کی ان لوگوں نے ان تھک کوشش شروع کردی اور کہا:

''حدیث کا پورا سلسلہ ایک عجمی سازش تھی اور جس کو شریعت کہا جاتا ہے، وہ بادشاہوں کی پیدا کردہ ہے۔'' (۲)

اور عبداللہ چکڑالوی کہتا ہے:

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے سیکڑوں برس پیچھے بعض خودغرض لوگوں نے از خود یہ ہزلیات گھڑ لیں اور کمالِ سیاہ دلی سے ان کو ناحق محمد رسول اللہ سلام علیہ کے ذمے لگا دیا ہے۔'' (۳)

الغرض ان لوگوں نے جب قرآن پر کفایت کا دعویٰ کیا، تو حدیثِ رسول کی عدم

---

(۱) کتابِ مناظرہ: ۱۹- از مقامِ حدیث

(۲) طلوعِ اسلام: اکتوبر ۱۹۵۲ء

(۳) الزکاۃ والصدقات: از مقامِ حدیث: ۱۱۰

ضرورت ثابت کرنا بھی ان کے لیے ضروری ہو گیا اور اس کے لیے حدیث کو مشکوک بنانے کی فکر شروع کر دی اور دعویٰ کرنے لگے کہ حدیثیں حضور ﷺ کے زمانے میں مدون نہیں ہوئیں اور تیسری صدی تک سماع و روایت کے ذریعے نقل کی جاتی رہی اور جب لوگ ایک جمعہ پہلے کی بات یاد نہیں رکھتے، تو سو سوا حادیث کو یاد رکھنا کیسے ممکن ہے؟(۱)

نیز ان منکرینِ حدیث کے نزدیک رسول اللہ ﷺ صرف پیغامِ قرآنی پہنچانے کے لیے آئے تھے، اس کے سوا آپ کا کوئی اور کام بھی نہیں، مقام بھی نہیں۔ ان کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی حیثیت محض ایک ایلچی و پیغام رساں کی ہے، اس سے زائد آپ کو کوئی حیثیت حاصل نہیں؛ حتی کہ تشریح و بیانِ قرآن بھی ان کے نزدیک آپ کے مناصب میں سے نہیں ہے۔

چناں چہ محمد اسلم جیراجپوری نے لکھا ہے کہ:

”رسول کی اطاعت بہ حکمِ الٰہی اور بہ حیثیتِ منصبِ رسالت فرض ہے............اور بہ حیثیتِ منصبِ رسالت رسول کا فریضہ صرف پیغامِ الٰہی کی تبلیغ ہے اور بس۔...............اس لیے رسول کی اطاعت کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ کا پیغام جو وہ لایا ہے، اس پر عمل کیا جائے؛ لہٰذا رسول کی اطاعت بعینہٖ اللہ کی اطاعت ہوئی..................
..............ہمارے رسول صرف اللہ کی کتاب یعنی قرآن کے مبلغ تھے۔“(۲)

اور اس کی وجہ ان لوگوں کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ کو

---

(۱) دیکھو: اشاعۃ السنۃ: ۱۹/۱۵۲، ۱۹۰۲ء

(۲) تعلیماتِ قرآن: ۱۵۵

لوگوں سے الگ کوئی خاص بات حاصل نہیں تھی، جس کی وجہ سے آپ کی بات مانی جائے اور آپ کے بیان وتفسیر کو کوئی مقام دیا جائے اور آپ کے ارشادات کی کوئی حیثیت قرار دی جائے۔

چناں چہ منکرِ حدیث مولوی احمد الدین امرتسری لکھتا ہے:

''اگر رسولِ خدا میں فطرت الناس سے کوئی جدا فطرت تھی یا حضور میں کوئی خاص قوت یا سمجھ یا باریک بینی ایسی تھی، جو قیامت تک دوسرے بشروں کو نہیں مل سکتی، تو حضور کا یہ فرمانا کہ میں تمہارے جیسا بشر ہوں، اگر میں نے قرآن مجید کو خود بنالیا ہے، تو تم بھی اس کی مثل بنا سکتے ہو، بالکل غلط ہو جاتا ہے۔''(۱)

نیز کہتا ہے:

''پس سورج کی طرح روشن ہے کہ رسولِ خدا کی وہی فطرت تھی، جس پر خدا تعالیٰ نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا ہے اور آپ کی وہی عقل تھی، جو دوسرے بشروں کو مل سکتی تھی۔''(۲)

لیکن یہ نظریہ حقیقت سے اس قدر دور ہے کہ کوئی عقل کا دشمن ہی اس کو قبول کرے گا؛ کیوں کہ اگر رسول میں کوئی خوبی وکمال عام لوگوں کی فطرت سے زائد نہیں ہوتا اور وہ محض ایک عام آدمی کی طرح ہوتا ہے، تو قرآنِ کریم و پیغامِ الٰہی کے اس پر اتارنے کی کیا وجہ ہے؟ پھر خود قرآنِ کریم نے آپ کے لیے جن مناصب ومقامات کا ذکر کیا ہے اس کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟

یہاں میں علامہ سید سلیمان ندوی رَحِمَہُ اللّٰہُ کا ایک اقتباس نقل کر دینا مناسب

---

(۱) برہان القرآن:۱۴۵

(۲) برہان القرآن:۱۴۶

سمجھتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں:

''اس سلسلے میں ہمیں ایک اور غلط فہمی کو دور کرنا ہے، جو بعضوں کو حضور کی صفتِ تبلیغ کے سمجھنے میں پیش آئی ہے، قرآنِ مجید میں متعدد آیتیں اس معنی کی آئی ہیں کہ رسول کا فرض صرف پیغام پہنچا دینا (ابلاغ) ہے، اس سے آج کل کے بعض کوتاہ بینوں کو یہ دھوکا ہوا کہ رسول کا فرض صرف وحیٔ الٰہی کی تبلیغ ہے یعنی قرآنِ پاک کے الفاظ کو بعینہٖ انسانوں تک پہنچا دینا اس کا کام ہے.... اس کے معانی کی تشریح اور مطالب کی توضیح نہ اس کا منصب ہے، نہ اس کا اس کو حق ہے، ان کے نزدیک مبلغ رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد اور نامہ بر کی ہے، جو ایک جگہ سے دوسری جگہ خط تو پہنچا دیتا ہے؛ مگر اس خط کے مفہوم و معنی کی تشریح کا اس کو حق نہیں ہوتا؛ بل کہ اس کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس بند لفافے میں کیا ہے۔ شاید ان کو یہ دھوکا اس آیت کے علاوہ لفظِ ''رسول'' سے بھی ہوا ہے، جس کے لفظی معنی ''پیغام بر اور قاصد'' کے ہیں؛ لیکن وہ لوگ یہ خیال نہیں کرتے کہ جہاں اس کو رسول کہا گیا ہے، نبی (خبر دینے والا) بھی کہا گیا ہے، مبشر (خوش خبری سنانے والا) نذیر (ڈرانے والا) سراجِ منیر (روشن کرنے والا چراغ) صاحبِ حکمت، صاحبِ خلقِ عظیم، صاحبِ مقامِ محمود، مجتبیٰ (مقبول) مصطفیٰ (برگزیدہ) مبین (شرح کرنے والا) معلم (سکھانے والا) مزکی (پاک و صاف کرنے والا) داعی الی اللہ (اللہ کی طرف بلانے والا) حاکم (فیصلہ کرنے والا) مطاع (واجب الاطاعت) آمر (حکم دینے والا) اور ناہی (روکنے والا) بھی تو کہا گیا ہے۔ کیا یہ اوصاف و

القاب اس کی اسی حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ صرف ایک پیغام پہنچانے والا قاصد ہے؟ جس کو اصل پیغام کے مفہوم و معنی سے ایک معمولی قاصد اور نامہ بر کی طرح کوئی سروکار نہیں۔"(۱)

الغرض منکرین حدیث نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو تسلیم کرنے کے باوجود آپ کی رسالت کو محض ایک ایلچی کی حیثیت دی اور آپ کی حدیث و سنت کو غیر ضروری ٹھہرایا اور جب یہ کیا، تو نتیجہ کیا ہوا کہ قرآن کی من مانی تشریح و توضیح کی گئی؛ حتی کہ مضحکہ خیز تفسیریں کی گئیں، جس کی ایک دو نمونے یہاں پیش کر دینا مناسب ہے۔

شخصیتِ رسول سے بے نیازی کے مضحکہ خیز نتائج

قرآن پاک میں حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ﴾ (البقرۃ:۶۰)

(اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا، تو ہم نے کہا کہ اپنی لاٹھی پتھر پر مارو، پس اس سے بارہ چشمے جاری ہو گئے، ہر ایک نے اپنا مشرب پہچان لیا، اللہ کے رزق میں سے کھاؤ اور پیو اور زمین میں فساد مچاتے نہ پھرو۔)

اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک معجزے کا ذکر ہے کہ جب اللہ کے

---

(۱) سیرت النبی:۴/۱۰۸

حکم سے انھوں نے پتھر پر لاٹھی ماری، تو اس سے بارہ چشمے جاری ہو گئے، اب سنیے! اس کی وہ تفسیر جس میں محض اپنی عقل و سمجھ کا من مانی طور پر استعمال کیا گیا ہے؛ سرسید نے لکھا ہے:

''اس مقام (مرہ) کے پاس پہاڑیاں ہیں، جن کی نسبت خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا:'' فاضرب بعصاک الحجر'' یعنی اپنی لاٹھی کے سہارے چڑھ چل، اس پہاڑی کا ایک مقام ہے، جس کو توریت میں ''ایلم'' لکھا ہے، وہاں بارہ چشمے پانی کے جاری تھے، جس طرح پہاڑی ملک میں پہاڑیوں کی جڑ یا چٹانوں کی دراروں میں سے جاری ہوتے ہیں، جن کی نسبت خدا نے فرمایا:''فانفجرت منه اثنتا عشرة عينا ''یعنی اس سے پھوٹ نکلے ہیں بارہ چشمے۔''(۱)

یعنی یہ معجزہ نہیں تھا اور نہ پتھر پر مارنے کا حکم تھا، نہ مارا گیا تھا، نہ اس مارنے سے چشمے نکلے تھے، بل کہ ﴿اضرب﴾ کے معنے چڑھنے و چلنے کے ہیں اور پہاڑوں پر چڑھنے کا حکم تھا، جہاں پہاڑوں پر پہلے سے چشمے موجود تھے۔ یہ سب دراصل معجزات کے انکار کا راستہ ہے۔

قرآن کریم میں آیت آئی ہے:

﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ أَبْصَارَكُمْ وَ خَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ ، مَنْ إِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَأْتِيْكُمْ بِهٖ ، اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ﴾

(اے نبی! کہہ دیجیے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمھاری سماعت اور بصارت کو سلب کر لے اور تمھارے دلوں پر مہر لگا دے؛ تو اللہ کے سوا کون معبود

---

(۱) تفسیر القرآن سرسید: سورۃ البقرۃ: آیت ۶۰

ہے، جو تمھیں یہ قوتیں لا دے گا ؟ دیکھیے ! ہم کس طرح بار بار نشانیاں بیان کرتے ہیں، پھر بھی یہ لوگ ان سے آنکھیں چراتے ہیں۔)

اس آیت کا مضمون و مفہوم بالکل واضح ہے؛ مگر جب ان لوگوں نے ایک خاص ذہنیت سے احادیث کے انکار پر اپنے مسائل و افکار کی بنیاد رکھی اور خود ساختہ مطالب قرآن سے اخذ کرنا چاہا، تو انتہائی مضحکہ خیز باتیں ان کے قلم و زبان سے صادر ہونے لگیں۔

لیجیے! ایک نمونہ اور ملاحظہ کیجیے! عبد اللہ چکڑالوی نے ''برہان الفرقان'' میں اسی آیتِ قرآنی سے خود ساختہ نماز میں تکبیرِ تحریمہ کے وقت کان پکڑنے کا حکم اسی آیت سے اخذ کیا اور آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے:

''اے پیغمبر! (جو لوگ کانوں، آنکھوں اور دلوں کو نماز میں حقیر و ذلیل نہیں کرتے یعنی کانوں کو نہیں پکڑتے، آنکھوں کو ادھر ادھر دیکھنے سے نہیں روکتے اور دل میں خوفِ رب نہیں رکھتے ان سے) کہہ دو کہ سوچ سمجھ کر بتاؤ کہ اگر اللہ تمھارے کان پکڑے (بڑے کردے) اور تمھاری آنکھیں (مٹادے) اور تمھارے دلوں پر بندش کردے؛ تو سوائے خدا کے تمھارا کوئی بزرگ ہے؟ جو تم کو یہ چیزیں لا دے (پس جب کوئی ایسا نہیں؛ تو بہتر ہے کہ تم خود ہی نماز میں اپنے کان پکڑا کرو، آنکھوں کو ادھر ادھر دیکھنے سے روکا کرو، دل میں خدا کا خوف رکھو؛ تاکہ خدا تمھارے کان نہ پکڑے، آنکھیں نہ مٹادے، دلوں پر بندش نہ کردے)۔''(۱)

اس سلسلے کا ایک اور نمونہ دیکھتے چلیے! آیتِ قرآنی ہے :

(۱) برہان الفرقان:۲۹۲

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰئِكَةِ رُسُلًا أُولِيْٓ أَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ﴾ (فَاطِر:١)

(تمام تعریفیں اللہ کے لیے سزاوار ہیں، جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے اور جو دو دو، تین تین چار چار پروں والے فرشتوں کو اپنا پیغام بر بنانے والا ہے، وہ مخلوق میں جو چاہتا ہے زیادہ کرتا ہے۔)

اس کی تفسیر عبداللہ چکڑالوی کی زبانی سنیے:

"(پڑھا کرے ہر ایک اہلِ زمین و آسمان) الحمد (یعنی پانچوں نمازوں میں) واسطے راضی کرنے اللہ کے، کیوں کہ وہ فطرت پاک پیدا کرنے والا ہے، تم تمام آسمان والوں (فرشتوں) کی اور تم تمام روئے زمین والوں (جن و انس) کی (چوں کہ تم فطرت اللہ میں تغیر و تبدل کرتے رہتے ہو؛ اس لیے نمازیں پڑھتے رہا کرو؛ تا کہ جبر نقصان ہوتا رہے اور اللہ وہ ہے) جو کرنے والا ہے اپنے فرشتوں کو رسول تمھاری طرف، جو لانے والے تمھاری صلوٰتوں یعنی رکعتوں کے ہیں، جن کا حق یہ ہے کہ وہ دو دو بار ادا کی جائیں اور تین تین بار اور چار چار بار مطابق تعلیم کتاب اللہ (جس وقت کی اللہ نے دو رکعتیں مقرر کر دی ہیں، اس کی دو پڑھو، جس کی تین فرمائی ہیں اس کی تین ادا کرو، جس کی چار معین کی ہیں، اس کی چار پڑھو) اس سے اللہ جبر و نقصان کرنا چاہتا ہے، تمھاری تبدیل شدہ فطرت کا جس قدر انسان چاہتا ہے (یعنی جس قدر نماز میں توجہ و خشوع کرتا ہے)۔"(١)

(١) برہان الفرقان:٣٤١

ظاہر ہے کہ یہ سب من مانی تفاسیر اس وقت متصور نہ ہوتیں، جب بیانِ رسول و سنتِ رسول سامنے ہوتے اور قرآن کے معانی و مفاہیم کی تشریح کو اس کے تابع کیا جاتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے ساتھ اگر رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی تعلیم و اسوہ پیشِ نظر نہ ہو، تو قرآن سے بہ جائے ہدایت کے خریدنے والے گمراہی خریدیں گے۔

صحابہ و ائمہ سے بے نیازی کا فتنہ

(۲) رجال اللہ کو نہ ماننے والوں کی دوسری قسم وہ ہے: جو رسول کو تو مانتی ہے؛ مگر صحابہ و تابعین کے لیے اور بالخصوص ائمہٗ دین و علمائے اسلام کے لیے تشریحِ دین و شریعت کا حق ماننے تیار نہیں ہے اور یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن اور دین و شریعت کو جب سب کے لیے نازل کیا گیا ہے اور آسان بنایا گیا ہے، تو ہمیں کسی کی کیا حاجت و ضرورت ہے کہ ہم اس سے قرآن و حدیث سمجھیں، جیسے وہ سمجھتے ہیں، ہم بھی سمجھا کریں گے۔ ان لوگوں کی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان میں عموماً وہ لوگ ہیں، جن کو نہ علومِ عربیہ سے کوئی تعلق و لگاؤ ہوتا ہے، نہ علومِ دینیہ سے کوئی خاص واقفیت ہوتی ہے اور اقلِ قلیل ان میں وہ ہیں، جو باقاعدہ عالم نہیں؛ مگر صرف عربی زبان سے شغف رکھتے ہیں۔ یہ دین کے سلسلے میں ایک نامعقول قسم کا غلو ہے، جس سے دین میں تحریفات کا دروازہ کھلتا ہے، بدعات جنم لیتی ہیں اور جدت پسندوں کی آزاد طبیعتوں کو دین و قرآن سے کھلواڑ کرنے کا موقع ملے گا۔

جدت پسند اور قرآنِ کریم کی ''تفسیر بالرائے''

جو لوگ علم سے کورے ہیں، نہ علومِ عربیہ سے واقف ہیں، نہ علومِ شرعیہ سے، وہ اگر دین میں دخل دیں گے اور قرآن کی تفسیر و احادیث کی تشریح کریں گے؛ تو اس کا جو بھی نتیجہ ہو سکتا ہے، وہ اظہر من الشّمس ہے۔ کیا ایک اناڑی و جاہل شخص کے از خود

ڈاکٹری سے متعلق کتابوں کے مطالعے سے وہ ڈاکٹر بن جائے گا؟ اور انجینئرنگ کی کتاب دیکھ کر کوئی انجینئر بن جائے گا؟ اسی طرح دیگر علوم وفنون کو سوچتے جائیں کہ کیا بلا علم کسی فن کے کتب کا از خود مطالعہ کافی ہے؟ اور کیا اس کو دنیا کا قانون اور عام لوگ ڈاکٹر یا انجینئر مان لیں گے؟ تو پھر قرآن وحدیث کے علوم کے ساتھ یہ کھلواڑ کیوں؟! کیا کوئی بھی جاہل وانا ڑی اس کے علم کا مدعی بن جاتا ہے؟! اسی طرح جو لوگ محض عربی دانی کی بنیاد پر علوم شرعیہ کا دعوی کرتے اور علوم تفسیر وحدیث میں دخل اندازی کرتے ہیں، وہ بھی نہایت تعجب خیز لوگ ہیں، ذرا ان سے پوچھیے کہ کیا محض انگریزی زبان سے واقفیت اس بات کے لیے کافی ہے کہ ڈاکٹر یا انجینئر ہو جائے؟ یا لائر و وکیل یا بیرسٹر قرار دیا جا سکے؟

نہیں اور ہرگز نہیں! تو پھر محض انگریزی جاننے والا جو کہ قرآن کی اور رسول کی زبان بھی نہیں، اگر یہ دعویٰ کرے کہ میں قرآن کو خود سمجھ سکتا ہوں، مجھے ان علما کی کوئی ضرورت نہیں، جو مدارس میں آٹھ آٹھ سال پڑھ کر آتے ہیں، یا کوئی محض عربی دانی کی بنیاد پر علما سے مستغنی ہونے کا دعویٰ کرے، تو کیا یہ بات عقل و دانش کے خلاف نہیں؟

محض کتاب اللہ کو سامنے رکھ کر جو شخص یا جماعت صحابہ وتابعین وائمہ سے بے نیازی کے ساتھ تفسیر کرے، وہ یقیناً تفسیر بالرائے کی مرتکب ہے، جس کی مذمت و ممانعت احادیث میں موجود ہے۔

''تفسیر بالرائے'' کا معنے اور اس کی حرمت

''تفسیر بالرائے'' کی حرمت کے سلسلے میں یہاں مختصر لکھ دینا مناسب ہوگا کہ آج کل اس کی وبائے عام چل رہی ہے اور جدت پسندوں اور نو تعلیم یافتوں میں یہ ایک فیشن کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث میں مروی ہے کہ رسول اللہ

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

"من قال في القرآن بغير علم فليتبوأ مقعده من النار."

(جو قرآن کے بارے میں بغیر علم کے کوئی بات کہے اس کو چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔)(۱)

حضرت جندب بن عبد اللہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

"من قال في القرآن برأيه فأصاب فقد أخطأ."(۲)

(جس نے قرآن کے بارے میں بغیر علم کے کوئی صحیح بات بھی کہی، تو بھی اس نے غلطی ہی کی۔)

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں بغیر علم کے اپنی رائے زنی کرنا یا محض اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر بیان کرنا، حرام و ناجائز ہے اور یہی "تفسیر بالرائے" ہے۔

"تفسیر بالرائے" کی حقیقت سمجھنے کے لیے اولاً یہ جاننا ضروری ہے کہ تفسیرِ قرآن کے لیے اہلِ سنت کے تمام مکاتبِ فکر کے علمائے کرام نے چند علوم کی مہارت کو لازم قرار دیا ہے، ان میں سے بعض علومِ عربیت سے متعلق ہیں اور بعض کا تعلق شریعت کی جان کاری سے ہے۔

علومِ عربیہ جن کا جاننا تفسیر کے لیے ضروری ہے، وہ یہ ہیں: علمِ لغتِ عربی، علمِ صرف، علمِ نحو، علمِ اشتقاق، علمِ بلاغت، علمِ بیان، علمِ بدیع۔

---

(۱) سنن الترمذي:۲۰۵۰، مسند أحمد: ۲۰۶۹، مسند بزار:۴۷۵۷، السنن الكبرى للنسائي:۸۰۳۰، و قال الترمذي :هذا حديث صحيح

(۲) سنن الترمذي:۲۰۵۲، السنن الكبرى للنسائي:۸۰۳۲، مسند أبي يعلى:۱۵۲۰، المعجم الكبير للطبراني:۱۶۵۰

اور علومِ شرعیہ کا جاننا لازم ہے۔ وہ یہ ہیں: علمِ قراءت، علمِ عقائد، علمِ اصولِ فقہ، علمِ فقہ، علمِ اسباب النزول، علمِ ناسخ ومنسوخ، علمِ احادیثِ متعلقہ بالتفسیر۔

نوٹ: ان علوم کی ضرورت پر ائمۂ تفسیر وعلمائے شریعت کے اقوال و دلائل، اصولِ تفسیر پر میری عربی کتاب "**نفحات العبير في مهمات التفسير**" میں دیکھی جاسکتی ہے۔

الغرض یہ کل چودہ علوم ہیں، جن کے بغیر تفسیرِ قرآن کی جرأت کرنا حماقت بھی ہےاور حرام بھی ہے۔

پس جو شخص ان علوم کی مہارت رکھتا ہو، وہ ان علوم کی روشنی میں کوئی رائے، قرآن کی کسی آیت کی تفسیر میں قائم کرتا ہے، تو وہ جائز ہے اور اگر ان علوم کی مہارت کے بغیر خود قرآن کی تفسیر کرتا ہے، تو وہ "تفسیر بالرائے" ہےاور حرام ہے۔

اسی لیے حدیث میں فرمایا: "جو بغیر علم کے قرآن میں کوئی بات کہتا ہے، تو اگر چہ اس نے صحیح کہا ہو؛ مگر غلط ہے" یعنی اسے اپنی نادانی کے باوجود حق نہ تھا کہ وہ قرآن کی تفسیر کرتا؛ لہٰذا صحیح بات کہنے کے باوجود اس کو غلط کہا جائے گا، جیسے کوئی ڈاکٹر نہ ہواور علاج معالجہ کرے، تو اگر کسی کو اس کی دوا سے فائدہ بھی ہو جائے، تب بھی کوئی اس کو علاج کرنے کی اجازت نہیں دے گا؛ بل کہ اس کی اس جرأتِ بے جا کو غلط ہی کہا جائے گا؛ کیوں کہ اتفاق سے کسی کو اس کی دوا سے فائدہ ہو جانے کے باوجود علم و جانکاری کے بغیر علاج و معالجہ سخت خطرے کی بات ہےاور جیسے یہاں جان کا خطرہ ہے، "تفسیر بالرائے" میں لوگوں کے لیے ایمان کا خطرہ ہے۔

کیا قرآن آسان ہے؟

یہ نو تعلیم یافتہ لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ قرآن کو اللہ نے آسان بنایا ہےاور اس کا

اعلان بھی خود قرآن میں کیا گیا ہے۔ چناں چہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾ (القمر: ١٧)

(اور ہم نے قرآن کو یاد کرنے یا نصیحت پکڑنے کے لیے آسان کر دیا ہے، تو کیا کوئی سمجھنے والا ہے؟)

مگر یہاں اولاً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ کسی چیز کے آسان ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس کے لیے کسی کو استاد و رہبر بنانے کی حاجت نہیں؟ مثلاً ایک استاد اپنے طلبہ سے کہتا ہے کہ علم سے گھبرانے کی ضرورت نہیں، علم کا حصول آسان ہے، دنیا میں کتنے لوگوں نے اس کو حاصل کیا اور دنیا میں معزز ہوئے، تو کیا اس بات سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہے کہ علم حاصل کرنے کے لیے کسی استاد کی ضرورت نہیں؟ اگر کوئی اس سے یہ سمجھتا ہو یا نتیجہ نکالتا ہو، تو اس کو اپنی عقل کا ماتم کرنا چاہیے؛ کیوں کہ اس کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ جب علم کو علم حاصل کرنے کے اصول و طریقے سے حاصل کیا جائے گا، تو وہ آسان ہے؛ لہٰذا یہ کہنے سے کہ ''قرآنِ کریم آسان ہے'' یہ سمجھنے کی غلطی نہیں کرنا چاہیے کہ اس کے لیے علما سے سیکھنے کی ضرورت نہیں۔

دوسرے یہ کہ ایک چیز ایک لحاظ سے آسان اور ایک دوسرے لحاظ سے مشکل ہو سکتی ہے؛ لہٰذا قرآن کا آسان ہونا اس لحاظ سے ہے کہ اس میں عبرت و نصیحت کی آیات ہیں، جنت و جہنم کے احوال ہیں، اخلاقِ حمیدہ و نیکی و طاعت کی ترغیب ہے اور اخلاقِ رذیلہ و معصیت سے زجر و توبیخ ہے، مختلف قوموں و ملتوں اور افراد و اشخاص کے گزرے ہوئے سبق آموز حالات و عبرت انگیز واقعات ہیں؛ یہ امور آسان ہیں۔ ان میں کسی معتبر ترجمے کے مدد سے بہ آسانی عبرت حاصل کی جا سکتی ہے؛ لیکن ایک اور لحاظ سے دیکھا جائے؛ تو قرآن مشکل بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں احکام و قوانین سے متعلقہ آیات، عقائدِ اسلام و مختلف انسانی احوال کے متعلق جلی و خفی

معاملات سے متعلقہ آیات بھی ہیں اور یہ حصہ ہر ایک کے بس کا نہیں؛ بل کہ یہاں علمی تبحر اور دینی مہارت کے بغیر کام نہیں چلتا۔

الغرض یہ بات کہ قرآن آسان ہے، اپنی جگہ صحیح ہے؛ مگر اس سے وہ نتیجہ جو ان لوگوں نے اخذ کیا ہے اور اس کے ذریعے وہ لوگوں میں غلط فہمی پیدا کرتے ہیں، یہ محض ناواقفیت و سطحیت اور وہی قرآن فہمی سے محرومی کا نتیجہ ہے۔

اس شبے کا جواب کہ کیا علما قرآن کے ٹھیکے دار ہیں؟

اب رہا ان لوگوں کا یہ کہنا کہ قرآن فہمی سب کا حق ہے؛ لہٰذا علما قرآن و تفسیر کے ٹھیکے دار نہیں ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص میڈیکل سائنس سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو اور کبھی کسی میڈیکل کالج میں داخلہ نہ لیا ہو، وہ کہنے لگے کہ علاج معالجہ کرنا سب کا حق ہے؛ لہٰذا ڈاکٹروں نے اس پر کیوں اجارہ داری کر لی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ اعتراض کسی بھی عقل مند کے نزدیک معقول نہیں سمجھا جائے گا؛ بل کہ انتہائی احمقانہ سمجھا جائے گا، اسی طرح جس نے قرآن و حدیث کے علوم سے واقفیت معتبر طریقوں سے نہ پائی ہو اور کسی سند یافتہ استاذ سے تفسیر کے اصول نہ سیکھا ہو، وہ اگر یہ کہتا ہے کہ تفسیرِ قرآن کا حق مجھے بھی ہونا چاہیے، صرف علما ہی کو کیوں یہ حق ہے، تو وہ انتہائی درجے کی احمقانہ بات کرتا ہے۔

پھر ایک بات یہ بھی سمجھ لیں کہ علما قرآن کے ٹھیکے دار تو نہیں ہیں؛ لیکن قرآن و حدیث کے علوم کے پہرے دار ضرور ہیں؛ تا کہ ان میں کوئی جاہل و اناڑی اور ناقص قرآن و حدیث کی غلط تشریح و تفسیر کر کے دین کو بگاڑ نہ دے اور دین کے حقائق کو مسخ نہ کر دے۔ جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے کہ نہ عربی سے صحیح واقفیت، نہ علوم شرعی سے کوئی تعلق، حتی کہ اسلامی عقائد تک کا صحیح پتہ نہیں؛ مگر قرآن کی تفسیر کرنے یا اس کو پڑھانے کا شوق ہو گیا اور دین کا بیڑا غرق کیا جانے لگا۔ اگر ایسی صورت حال پیدا ہو

تو علما کبھی خاموش نہیں رہ سکتے ؛ کیوں کہ وہ اسلام کے پہرے دار ہیں، وہ اگر یہاں خاموش رہیں، تو اللہ کی پکڑ میں آجائیں۔

معلوم ہوا کہ دین وشریعت آسان ہیں ؛ مگر ان کو سمجھنے میں استاذ ورہبر سے ہم مستغنی نہیں ؛ بل کہ یہ ایک لازمی بات ہے، جس کو ترک کردینے سے بے شمار فتنوں کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔

کتاب وشخصیت کی تفریق تمام فتنوں کی اساس ہے

خلاصہ یہ کہ بعض نے کتاب کو لیا اور رجال وشخصیات سے اعراض کیا اور بعض نے رجال وشخصیات کو اپنایا اور کتاب اللہ سے روگردانی کی ، یہ دونوں صورتیں در حقیقت راہِ مستقیم سے بعد و دوری اور گمراہی کی ہیں ؛ بل کہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے مولانا مناظر احسن گیلانی رَحِمَہُ اللّٰہُ کی کتاب ''تدوینِ حدیث'' کے مقدمے میں تو یہ دعوی کیا ہے:

> ''جن لوگوں کی نظر ملل ونحل اور علم کلام وعقائد اور تاریخ فرق پر ہے، وہ آسانی سے اس بات کو مان لیں گے کہ اسلام میں جتنے بدعتی فرقے پیدا ہوئے وہ وہی ہیں، جنھوں نے کتاب کو سنت سے یا سنت کو کتاب سے الگ کرنا چاہا، خوارج نے کتاب کو مانا اور سنت سے انحراف کیا اور ان کے مقابلے کے فرقے نے کتاب کو محرف بنا کر چھوڑا اور صرف اپنے ائمہ کی سنت کی پیروی کا دعوی کیا، اسی طرح معتزلہ نے قرآن کو بہ تاویل تسلیم کیا اور احادیث سے اعراض کیا اور راہ راست سے دور ہوئے۔'' (۱)

الحاصل ''غلو فی الدین'' کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ کتاب اللہ و رجال اللہ کو الگ الگ کردیا جائے ، کسی کو مانے اور کسی کو نہ مانے ، اس سے اگر ایک

---

(۱) مقدمۂ تدوین حدیث

جانب شخصیت پرستی و پیر پرستی اور بدعات وشرکیات کا بازار گرم ہوتا ہے، تو دوسری طرف قرآن وسنت کی من مانی تشریح و آزادانہ تفسیر اور من گھڑت باتوں کو دین و قرآن کی جانب منسوب کرنے کی بیماری پیدا ہوتی ہے۔

شریعت کے ظاہری و باطنی احکام میں تفریق

دین میں غلو کا ایک مظاہرہ اس صورت سے ہوتا ہے کہ بعض لوگ شریعت کے احکام میں سے ظاہری و باطنی احکام میں تفریق پیدا کرتے اور کسی کو قبول کرتے اور کسی کو رد کرتے ہیں اور اس میں بھی دو قسم کے لوگ غلو میں مبتلا ہوئے: ایک تو مدعیانِ تصوف اور دوسرے مدعیانِ فقہ۔

احکامِ ظاہرہ سے اعراض-متصوفین کی گمراہی

متصوفین و بطال صوفیا نے یہ قرار دے رکھا ہے کہ ''شریعت'' ظاہری احکام کا نام ہے اور ''طریقت وحقیقت'' باطنی احکام کا نام ہے اور پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ ظاہر شریعت تو چھلکا ہے اور اصل مغز اس کا باطن ہے اور یہ کہ باطن ہی اصل ہے؛ لہٰذا شریعت کے ظاہری احکام پر چلنا کوئی ضروری نہیں؛ اس لیے نماز وروزہ، زکوۃ وحج وغیرہ اسلامی عبادات و دیگر شرعی احکامات کا وہ مذاق بھی اڑاتے ہیں اور لوگوں کو یہ کہہ کر گمراہ بھی کرتے ہیں کہ یہ سب چھلکا ہے اور ہم حقیقت وطریقت والے ہیں، جو اصلِ شریعت وحقیقتِ شریعت کو جانتے اور اس پر چلتے ہیں؛ اس لیے ان کے مرید عام طور پر نماز و دیگر اسلامی عبادات واحکامات سے دور ونفور ہوتے ہیں اور ان کو غلط بھی سمجھتے ہیں۔

حال آں کہ خود اکابر صوفیا نے اس قسم کے لوگوں کا ہر دور میں رد کیا ہے اور بتایا ہے کہ شریعت دونوں قسم کے احکام کا مجموعہ ہے: ظاہری بھی اور باطنی بھی؛ لہٰذا باطنی

احکام کو لینے کا دعویٰ کرنا اور ظاہری احکام سے دوری و نفرت وہ بدترین غلو ہے، جس سے کبھی کفر جنم لیتا ہے اور کبھی فسق و فجور اور یہ دراصل گمراہی کا راستہ ہے۔

اتباعِ شریعت کے بغیر کوئی ولی نہیں ہو سکتا

شریعت کی ضرورت و اہمیت اور اس کے بغیر وصول الی اللہ کی نفی پر مندرجہ ذیل اولیاء اللہ و مشائخ کا کلام ملاحظہ کیجیے:

(۱) سید العارفین شیخ المشائخ حضرت عبد القادر جیلانی رَحِمَہُ اللّٰہُ اپنے مواعظ میں فرماتے ہیں:

"جس نے قرآن و حدیث کو چھوڑا وہ مرتد اور حدِ اسلام سے خارج ہوا کہ اس کا انجام آخرت میں دوزخ اور عذاب ہوگا اور دنیا میں غضبِ الٰہی۔ شریعت کی پابندی اور دروازۂ خداوندی پر جماؤ متحقق ہو جانے کے بعد عارف کے قلب کے لیے اس کے اور حق تعالیٰ کے درمیان (تعلق کا) ایک خاص مضمون ہوتا ہے کہ اسی کی وجہ سے وہ اس کا مستحق ہوتا ہے کہ لوگ اس کی اتباع کریں اور اس کی باتیں سنیں اور اسی لیے ان لوگوں کے اتباع کی ممانعت ہے، جو شریعت کے پابند نہ ہوں؛ کیوں کہ پابندیٔ شریعت ایسی چیز ہے کہ اس کے بغیر چارہ ہی نہیں اور وہی بنیاد ہے اس طریقت اور سلوک کی کہ جس نے عمل اور اخلاص سے اس کو مضبوط کیا اور مخلوق کو اس کی تعلیم دی، وہی حق تعالیٰ کے نزدیک باعظمت ہوا -- آگے فرماتے ہیں -- میں اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے اللہ کے دین پر قائم ہونے کے سوا اور کچھ نہیں جانتا۔" (۱)

---

(۱) خطباتِ غوثیہ:۵۷۶، مجلس:۶۲

اس کے ایک ایک حرف پر غور کر کے آج کل کے جاہل صوفیوں اور حقیقت اور طریقت کے مدعیوں کے احوال پر ان کو منطبق کر کے دیکھا جائے، تو واضح ہو جائے گا کہ یہ لوگ حقیقت سے کس قدر دور ہیں اور یہ کہ یا تو خود دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں یا دوسروں کو دھوکہ دے رہے ہیں۔

نیز حضرت شیخ جیلانی رحمہ اللہ اپنی دوسری کتاب ''فتوح الغیب'' میں بھی فرماتے ہیں:

> ''پس مذکورہ رتبۂ ولایت کو پانے کے لیے اتباعِ نفس، فسق و فجور اور لغویات سے پرہیز کرتے ہوئے توحیدِ خالص کے ساتھ شریعت کی پیروی کر اور یاد رکھ کہ جس حقیقت یا طریقت کی، شرع تائید و توثیق نہ کرے اور اسے جائز نہ ٹھہرائے وہ صریحاً کفر و الحاد ہے۔'' (۱)

مشہور صوفی و بزرگ حضرت سید الاولیا احمد کبیر رفاعی رحمہ اللہ نے فرمایا:

> ''جو خلافِ شریعت ہو راہِ حق سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اصل راستہ صرف شریعت ہے۔ یہ بات میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ لوگوں کے دلوں سے اہلِ محو، مجذوبین اور نظر انداز کیے ہوئے بھولے بھالے کی طرف سے حسنِ ظن اور عقیدت نکال لوں؛ کیوں کہ اولیا کے گروہ میں ایک ایسی قوم بھی ہے، جو اہلِ محو اور جذب اور سادہ لوحی اور گمنامی کی زندگی گزارتی ہے؛ بل کہ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مرتبۂ ولایت کا کمال نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمہ کے کامل اختیار کا نام ہے اور فضل و خوبی اور فخر و مجد و بزرگی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال پر عمل کرنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کو عام کرنے اور

---

(۱) فتوح الغیب:۱۰۹

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال سے آراستہ ہونے میں ہے۔" (۱)
اور لیجیے! آپ رحمہ اللہ ہی اپنے ملفوظات میں فرماتے ہیں:

"معروف کرخی، داؤد طائی، حسن بصری رحمہم اللہ اور ان صوفیا نے جوان حضرات کی صحبت سے فیض پانے والے ہیں، اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے راستوں کا خلاصہ دو جملوں میں بیان کیا ہے: (۱) شریعت پر مضبوطی کے ساتھ چلنا (۲) صرف اللہ تعالیٰ کا طالب بننا۔" (۲)

نیز آپ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"جو عمل اور جو کوشش شریعت کے خلاف کسی اور طریق پر ہو، اس سے کچھ بھی فائدہ نہیں۔" (۳)

اور حضرت مجدد الف ثانی سرہندی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس نعمتِ عظمیٰ (ولایت) تک وصول سید الاولین والآخرین علیہ وعلی آلہ من الصلوات افضلہا ومن التحیات اکملہا کی اتباع سے وابستہ ہے، بندہ جب تک اپنے آپ کو پورے طور پر شریعت میں گم نہ کر دے اور اوامر کی بجا آوری اور ممنوعات سے رکنے کے ساتھ مزین و آراستہ نہ کرے، اس دولت و نعمت کی خوشبو بندے کی روح سونگھ نہیں سکتی۔" (۴)

یہ ساری عبارات ان اکابر صوفیا کی ہیں، جن کا لمحہ لمحہ یادِ خدا و عشقِ رسول میں گزرتا تھا، ان حضرات نے بتا دیا کہ دین و شریعت کی اتباع کے بغیر کوئی شخص ولایت کا مقام کبھی اور کسی بھی صورت میں نہیں پا سکتا اور جو لوگ شریعت و دین کے خلاف

---

(۱) مجالس رفاعیہ: ۵۹
(۲) ارشاداتِ حضرت رفاعی رحمہ اللہ: ۷۵
(۳) ارشاداتِ حضرت رفاعی رحمہ اللہ: ۶۷
(۴) مکتوبات دفتر اول: مکتوب نمبر: ۴۷

رہتے ہوئے ولایت کا دعوی کرتے ہیں، ان کی حقیقت حضرت سید احمد کبیر رفاعی رَحِمَہُ اللہُ نے یوں کھول دی ہے، وہ فرماتے ہیں:

”برخوردار! آج تم تصوف کے دعوے داروں کو دیکھ رہے ہو کہ ان کی اکثریت یا تو زندیقوں، بے دینوں کی ہے یا بدعتیوں، جدت پسندوں کی ہے یا پھر وہ آزاد منش، لاپرواہ لوگ ہیں۔ یہ سبھی کے سبھی اول درجے کے جاہل اور احمق لوگ ہیں، ہاں! حیلہ تراشیوں میں، دھوکہ دہی و مکاری اور یاوہ گوئی میں اور دوسروں کو مرعوب کرنے کے لیے کرتب بازی میں یہ لوگ بڑے تجربہ کار و ماہر اور کہنہ مشق اور اس کے ساتھ ساتھ یہ لوگ اہلِ حق سے حد درجہ بدظن رہتے ہیں اور ان کے لیے بدظنی پیدا کرتے ہیں۔“(۱)

باطنی احکام سے اعراض-علمائے ظاہر کی غلطی

اور رہے متفقہ و مدعیانِ فقہ تو ان میں بعض وہ ہیں، جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اصل ظاہری احکام ہی ہیں اور وہ باطنی احکام کا انکار و رد کرتے ہیں اور واقعی و حقیقی تصوف کا بھی مذاق اڑاتے ہیں، ان کے نزدیک توکل، انابت، خشوع، اخلاص، صبر، شکر، خوف و خشیت، تقویٰ و طہارت وغیرہ احکام بے معنی ہیں؛ اسی طرح ریاکاری و حب دنیا و بے خوفی و غفلت عن الآخرۃ، تکبر و عجب وغیرہ، جن سے بچنے کا حکم ہے، یہ سب کوئی اہمیت کی چیزیں نہیں ہیں۔

اسی ذہنیت کے حامل علمائے ظاہر کے متعلق حضرت حکیم الامت تھانوی رَحِمَہُ اللہُ نے اپنے وعظ ”العلم والخشیۃ“ میں فرمایا:

---

(۱) اللہ کے ساتھ اولیاء اللہ کا حال: ۱۳۵

”اہلِ علم میں تو یہ مفسدہ پیدا ہوا کہ وہ اس آیت ﴿إنما یخشی اللہ من عبادہ العلماء﴾ سے علم کی فضیلت ثابت کر کے رہ جاتے ہیں کہ دیکھو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے علما کی تعریف بیان فرمائی ہے، ....مگر جو اصل منشا اس فضیلت کا ہے یعنی خشیت اس کو بیان نہیں کرتے، نہ تو دوسروں کو اس کا امر کرتے ہیں کہ خشیت حاصل کرو اور نہ خود اس کا اہتمام کرتے ہیں؛ بل کہ اس کی جڑیں کھوکھلی کرتے ہیں۔ چناں چہ بہ کثرت اہلِ ظاہر علمِ باطن کو، جس سے خشیت حاصل ہوتی ہے، فضول اور لغو سمجھتے ہیں اور جو لوگ اس کی تعلیم و تعلم میں مشغول ہیں، ان پر اعتراض کرتے ہیں؛ بل کہ ستم یہ ہے کہ بعض تو عدمِ خشیت کی تعلیم دیتے ہیں، گو اس کا عنوان دوسرا ہو؛ مگر معنون یہی ہوتا ہے۔“(۱)

اگر پہلے گروہ نے باطنِ شریعت کو لینے کا دعویٰ کیا اور ظاہر سے غفلت ہی نہیں؛ بل کہ نفرت اختیار کی تو دوسرے گروہ نے ظاہری احکامات کو لے لیا اور شریعت کے باطن کو خیر باد کہہ دیا۔

دونوں طبقے غلطی پر

یہ دونوں باتیں دین میں غلو اور حدودِ شرع سے تجاوز کی ہیں، جو کسی مسلمان کے لیے روا نہیں ہو سکتیں؛ لہٰذا ایک جانب علما کو احکامِ باطنی کی طرف بھی توجہ دینا چاہیے؛ تا کہ اپنے نفوس کا تزکیہ و اصلاح ہو اور اللہ کی معرفت و محبت، خوف و خشیت، تقوی و طہارت، انابت و اطاعت، اخلاص و للّٰہیت، توکل علی اللہ و اعتماد علی اللہ وغیرہ صفات اپنے اندر پیدا ہوں اور دوسری جانب باطن کا دعوی کرنے والوں کو احکامِ شرع کی

(۱) خطباتِ حکیم الامت رحمہ اللہ: ۲/۲۴۵-۲۴۶

پابندی، شریعت کا لحاظ و ادب کرتے ہوئے اپنی زندگی کو ان احکامات سے آراستہ و معمور کرنا چاہیے۔

شریعت جامعِ ظاہر و باطن ہے- علامہ ابن تیمیہ رَحِمَهُ اللهُ کا کلام

علامہ ابن تیمیہ رَحِمَهُ اللهُ نے اس سلسلے میں عمدہ کلام کیا ہے اور دونوں طبقوں کی غلطی کو واضح کیا ہے، مناسب ہے کہ ان کا کلام یہاں نقل کر دیا جائے، آپ اپنے فتاویٰ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

" وهذا الصراط المستقيم يشتمل على علم، و عمل، علم شرعي و عمل شرعي، فمن علم، ولم يعمل بعلمه كان فاجراً، و من عمل بغير علم كان ضالًا، .... ولهذا كان السلف يقولون: احذروا فتنة العالم الفاجر، والعابد الجاهل، فإن فتنتهما فتنةٌ لكل مفتون، وكانوا يقولون: من فسد من العلماء ففيه شبه من اليهود، و من فسد من العباد ففيه شبه من النصارى، فمن دعا إلى العلم دون العمل المأمور به كان مُضِلًّا، ومن دعا إلى العمل دون العلم كان ضالًّا، و أضلُّ منهما من سلك في العلم طريق أهل البدع، فيتبع أموراً تخالف الكتاب، و السنة يظنها علوماً، وهي جهالات، و كذلك من سلك في العبادة طريق أهل البدع، فيعمل أعمالاً تخالف الأعمال المشروعة، يظنها عباداتٍ، وهي ضلالاتٌ. فهذا و هذا كثيرٌ في المنحرف المنتسب إلى

فقه ، و فقر يجتمع فيه أنّه يدعو إلى العلم دون العمل و العمل دون العلم ، و يكون ما يدعو إليه فيه بدع تخالف الشريعة ، وطريق الله لا تتم إلا بعلم ، و عمل ، يكون كلاهما موافقاً للشريعة ، فالسالک طريق الفقر ، و التصوف ، والزهد ، و العبادة إن لم يسلک بعلم يوافق الشريعة ، و إلا كان ضالًّا عن الطريق ، وكان ما يفسده أكثرَ مما يصلحه ، و السالک من الفقه ، والعلم ، والنظر و الكلام إن لم يتابع الشريعة و يعمل بعلمه ، و إلا كان فاجراً ضالًّا عن الطريق . فهذا هو الأصل الذي يجب اعتماده على كل مسلم ، و أما التعصب لأمرٍ من الأمور بلا هدىً من الله فهو من عمل الجاهلية ، و من أضل ممن اتبع هواه بغير هدى من اللّٰه .''

(یہ ''صراطِ مستقیم'' علم وعمل پر مشتمل ہے: علم شرعی وعملِ شرعی پر، پس جو علم رکھے اور اپنے علم پر عمل نہ کرے وہ فاجر ہوگا اور جو بغیر علم کے عمل کرے وہ گمراہ ہوگا؛ .... اسی لیے حضرات سلفِ صالحین کہا کرتے تھے: عالم فاجر اور عابد جاہل کے فتنے سے ڈرو؛ کیوں کہ ان دونوں کا فتنہ ہر کسی کو مفتون بنا دیتا ہے اور فرماتے تھے کہ علما میں سے جو بگڑ گئے، ان میں یہود کی مشابہت پائی جاتی ہے اور عابدین میں سے جو بگڑے ان میں نصاریٰ کی شباہت ملتی ہے، پس شریعت میں جس عمل کا حکم دیا گیا ہے، اس کو چھوڑ کر جو شخص صرف علم کی

جانب لوگوں کو بلائے، وہ گمراہ ہے اور جو علم چھوڑ کر عمل کی طرف بلائے وہ بھی گمراہ ہے اور ان دونوں سے بڑھ کر گمراہ وہ ہے، جو علم میں بدعتیوں کے طریقے پر چلے اور علوم سمجھ کر ایسے امور کا اتباع کرے، جو کتاب وسنت کے خلاف ہیں، حال آں کہ وہ جہالتیں ہیں؛ اسی طرح جو شخص عبادت کے اندر اہلِ بدعت کے طریقے پر چلے اور عبادت سمجھ کر ایسے اعمال کرے، جو کتاب وسنت کے خلاف ہیں؛ حال آں کہ وہ گمراہیاں ہیں۔ پس یہ صورت اور وہ صورت دونوں ان لوگوں میں بہت پائی جاتی ہے، جو صحیح راستے سے منحرف، علم یا زہد کی جانب منسوب ہیں، اس میں جو بات مشترک ہے، وہ یہ ہے کہ وہ عمل چھوڑ کر علم اور علم چھوڑ کر عمل کی جانب دعوت دیتا ہے اور جس کی طرف دعوت دیتا ہے، اس میں خلافِ شریعت نئی نئی باتیں ہوتی ہیں اور اللہ کا راستہ اس علم وعمل کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، جن میں سے ہر ایک موافق شرع ہو؛ لہٰذا زہد و تصوف، فقر وعبادت کے طریق پر چلنے والا اگر اس علم پر نہ چلے، جو شریعت کے موافق ہے، تو وہ گمراہ ہے اور اس کی اصلاح سے زیادہ اس کا فساد ہوتا ہے، اسی طرح جو علم وفقہ اور نظر وکلام کے راستے پر چلے، وہ اگر شریعت کی اتباع نہ کرے اور اپنے علم پر عمل نہ کرے؛ تو وہ بھی فاجر، راستہ گم کردہ ہے، پس یہ ہے وہ اصول جس پر اعتماد کرنا ہر مسلم پر لازم ہے اور رہا کسی امر میں بغیر اللہ کی ہدایت کے تعصب برتنا، تو یہ جاہلیت کا کام ہے اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے؟ جو بغیر اللہ کی ہدایت کے اپنے نفس کی اتباع کرتا ہے۔)(۱)

---

(۱) مجموعة الفتاوی:۱۱/۲۷-۲۸

شیخ احمد کبیر رفاعی رَحِمَہُ اللّٰہُ کا دونوں طبقوں سے خطاب لاجواب

اسی سلسلے میں حضرت احمد کبیر رفاعی رَحِمَہُ اللّٰہُ کی ایک بات بھی سنتے چلیں، جو خود اپنے زمانے کے بڑے صوفیا میں مانے جاتے ہیں، آپ فرماتے ہیں:

''صوفیا کے طریق کا ملتہیٰ وہی ہے، جو فقہا کے طریق کا ملتہیٰ ہے، فقہا کے طریق کا منتہی وہی ہے، جو صوفیہ کے طریق کا منتہی ہے۔ جن گھاٹیوں میں پھنس کر فقہا مقصود کی طلب سے رہ جاتے ہیں، ان ہی گھاٹیوں میں صوفیہ بھی اپنے سلوک میں مبتلا ہوتے ہیں۔ دونوں کو مقصود سے روکنے والی ایک ہی چیز ہے یعنی غرضِ نفسانی اور حبِ دنیا و حبِ جاہ اور دونوں کو مقصود تک پہنچانے والی بھی ایک ہی چیز ہے یعنی اخلاص اور ماسوائے حق سے رخ پھیر لینا۔ طریقت میں شریعت ہے اور شریعت میں طریقت ہے، دونوں میں صرف لفظی فرق ہے، اصل اور مقصود اور نتیجہ دونوں کا ایک ہے، میرے نزدیک جو صوفی فقیہ عالم کی حالت پر انکار کرے، اس کو برا کہے یقیناً مبتلائے قہر ہے اور جو فقیہ صوفی کی حالت پر انکار کرے، اس کو برا کہے وہ بھی راندۂ درگاہ ہے۔ ہاں! اگر کوئی عالم صرف اپنی زبان سے حکم کرتا ہو، شریعت کی ترجمانی نہ کرتا ہو یا صوفی اپنے طور پر راستہ طے کررہا ہو، شریعت کے موافق نہ چلتا ہو، تو پھر ایک دوسرے کو برا کہنے میں کسی پر گناہ نہیں۔'' (۱)

ان محققین علما و حقیقی صوفیا کے کلام نے جھوٹے متصوفین و بطال مشائخ کے باطل دعووں اور ناقص مدعیانِ فقہ و علم کے بے حقیقت خیالات کی واضح طور پر تردید کرکے حق کو واضح کردیا کہ شریعت دونوں قسم کے احکام کا مجموعہ ہے اور ان میں سے

---

(۱) ارشاداتِ حضرت رفاعی رَحِمَہُ اللّٰہُ: ۱۲۱

کسی سے بھی بے اعتنائی برتنا یا ان میں تفریق کرنا غلو فی الدین ہے۔

منصوص وغیر منصوص میں فرق نہ کرنا

غلو کی ایک شکل یہ ہے کہ منصوص وغیر منصوص میں فرق نہ کیا جائے اور دونوں کو برابر کر دیا جائے۔

منصوص وغیر منصوص کیا ہے؟

پہلے یہ سمجھ لیں کہ کچھ امور وہ ہیں؛ جو شریعت میں منصوص ہیں اور دوسرے کچھ امور وہ ہوتے ہیں؛ جو شریعت میں منصوص نہیں ہوتے۔

منصوص وہ چیزیں ہیں جنھیں اللہ ورسول نے دین وشریعت میں صاف وواضح طریقے سے بیان کر دیا ہے اور غیر منصوص ان باتوں کو کہتے ہیں، جو دین وشریعت میں اس طرح بیان نہ کی گئی ہوں؛ بل کہ کسی عالم نے یا کسی شیخ نے یا کسی اور نے کسی مصلحت وضرورت کی وجہ سے ان کو جاری کیا ہو۔ یہ امور اگر چہ کہ جائز ہوں؛ مگر ان کا درجہ ظاہر ہے کہ منصوص کے برابر نہیں ہو سکتا۔

منصوص وغیر منصوص کی ایک مثال یہ ہے کہ شریعت میں نماز اور نماز کا طریقہ، اس کے فرائض، واجبات، سنن ومستحبات، سب مقرر ومنصوص ہیں اور ذکر اللہ تو منصوص ہے؛ مگر اس کا کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں کیا گیا ہے؛ لہٰذا اگر کسی نے کوئی خاص طریقے کسی حکمت ومصلحت سے ایجاد کیا، مثلاً یکسوئی پیدا کرنے یا دھیان جمانے کے لیے ضربیں لگانے کا طریقہ، جیسا کہ حضراتِ صوفیا میں ہے، تو یہ ضرورت وحکمت کے پیشِ نظر تو جائز ہے؛ مگر اس کو منصوص نہیں سمجھا جائے گا۔

ان دونوں میں فرق نہ کرنے سے غلو پیدا ہوتا ہے

مگر غلو کرنے والوں نے ہمیشہ یہ کیا ہے کہ دونوں کو ایک جیسا قرار دے دیا اور

جو معاملہ منصوص کے ساتھ کیا جانا چاہیے، وہی غیر منصوص کے ساتھ بھی وہ کرتے ہیں۔ یہ بھی غلو اور حد سے تجاوز ہے۔

اس کی مثال وہی نماز و ذکر اللہ سے لیجیے کہ نماز شروع سے اخیر تک اپنے تمام امور کے لحاظ سے منصوص ہے؛ لیکن ذکر اللہ کا کوئی خاص طریقہ منصوص نہیں، اگر اس میں کوئی خاص طریقہ کسی حکمت و مصلحت سے جاری کیا جائے، تو جائز ہے؛ مگر اس کو منصوص کی طرح سمجھا جائے اور اس کو اختیار نہ کرنے والوں پر اس طرح نکیر کی جائے جیسے کسی منصوص سنت کے ترک پر کی جاتی ہے، تو یہ بھی حرام و ناجائز ہے؛ کیوں کہ ایسا کرنے والے نے منصوص و غیر منصوص دونوں کو ایک ہی درجہ کر دیا، جو حدود سے تجاوز و غلو ہے۔

معلوم ہوا کہ کوئی بھی کام جو منصوص نہ ہو، وہ اس کام کے برابر نہیں ہوسکتا، جو منصوص ہے۔ دونوں کو ایک قرار دینا یا سمجھنا تجاوز و غلو کی صورت ہے۔

دعوت الی اللہ کے کسی خاص طریقے پر اصرار بھی غلو ہے

اسی سے سمجھ لینا چاہیے کہ دین کے کسی بھی کام کے سلسلے میں جو طریقے منصوص اور شریعت میں مقرر نہیں ہیں، ان میں اگر ہم اپنی سہولت و ضرورت اور اپنی حیثیت کے پیشِ نظر دائرۂ شریعت میں رہتے ہوئے کوئی طریقہ جاری کریں، تو یہ بلاشبہ ایک وسیلے و ذریعے کی حد تک جائز ضرور ہے؛ لیکن ہمیں یہ اختیار نہیں کہ ہم اس کے ساتھ منصوص چیز کا سا معاملہ کریں اور سب کو اسی طریقے پر چلنے پر اصرار کریں اور جو کوئی اپنی ضرورت و مصلحت کی وجہ سے اسی دینی کام کے لیے کسی اور طریقے کو اختیار کرے تو اس کو مطعون کریں؛ کیوں کہ اللہ و رسول نے اسی طریقے کو لازم نہیں قرار دیا ہے؛ لہٰذا ہمارا جاری کردہ طریقہ منصوص کی طرح لازم نہیں ہو جائے گا؛ اس لیے اس پر

اصرار کرنا جائز نہ ہوگا اور جب اصرار ہی جائز نہیں، تو نہ کرنے والوں پر طعن و تشنیع اور ان سے بغض و عداوت کیسے روا ہو جائے گی؟

دینی جماعتوں کے لیے مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ کا ایک اہم بیان

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مفتی اعظم حضرت اقدس مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ کی ایک نہایت اہم تحریر، جو اسی سلسلے میں ہے، اس کو اپنی اس کتاب کا جز بنا دوں اور اپنی تحریر کو اس سے زینت و رونق دوں؛ لہٰذا اس کو آپ کے رسالے ''وحدتِ امت'' سے نقل کرتا ہوں، وھو ھذا:

''ہماری دینی جماعتیں جو تعلیمِ دین یا ارشادِ تلقین یا دعوت و تبلیغ اور اصلاحِ معاشرہ کے لیے قائم ہیں اور اپنی اپنی جگہ مفید خدمات بھی انجام دے رہی ہیں، ان میں بہت سے علما و صلحا اور مخلصین کام کر رہے ہیں، اگر یہی متحد ہو کر تقسیم کار کے ذریعے دین میں پیدا ہونے والے تمام رخنوں کے انسداد کی فکر اور امکانی حد تک باہم تعاون کرنے لگیں اور اقامتِ دین کے مشترک مقصد کی خاطر ہر جماعت دوسری کو اپنا دست و بازو سمجھے اور دوسروں کے کام کی ایسی ہی قدر کریں جیسی اپنے کام کی کرتے ہیں، تو یہ مختلف جماعتیں اپنے اپنے نظام میں الگ رہتے ہوئے بھی اسلام کی ایک عظیم الشان طاقت بن سکتی ہیں اور تقسیمِ عمل کے ذریعے اکثر دینی ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہیں۔

مگر عموماً یہ ہو رہا ہے کہ ہر جماعت نے جو اپنے سعی و عمل کا ایک دائرہ اور نظامِ عمل بنایا ہے، عملی طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدمتِ دین کو اسی میں منحصر سمجھ رہے ہیں، گو زبان سے نہ کہیں، دوسری جماعتوں سے

اگر جنگ وجدل بھی نہیں، تو بے قدری ضرور دیکھی جاتی ہے، اس کے نتیجے میں ان جماعتوں میں بھی ایک قسم کا تشتت پایا جاتا ہے۔ غور کرنے سے اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقصد سب کا اگرچہ دین کی اشاعت، حفاظت اور مسلمان کی علمی، عملی، اخلاقی اصلاح ہی ہے؛ لیکن اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے کسی نے ایک دار العلوم قائم کر کے تعلیمِ دین کی اہم خدمت انجام دی، کسی نے ایک تبلیغی جماعت بنا کر رشد و ہدایت کا فرض ادا کیا، کسی نے کوئی انجمن بنا کر احکامِ دین کی نشر و اشاعت کا تحریری انتظام کیا، کسی نے فتوے کے ذریعے خلقِ خدا کو ضروری احکام بتانے کے لیے دار الافتا قائم کیا، کسی نے اسلام کے خلاف ملحدانہ تلبیسات کے جواب کے لیے تصنیفات کا یا ہفتہ واری، ماہواری رسالہ و اخبار کا سلسلہ جاری کیا، یہ سب کام اگرچہ صورت میں مختلف ہیں، مگر درحقیقت ایک مقصد کے اجزا ہیں، ان مختلف محاذوں پر جو مختلف جماعتیں کام کریں گی، یہ ضرور ہے کہ ہر ایک کا نظامِ عمل مختلف ہوگا؛ اس لیے ہر جماعت نے بجا طور پر سہولت کے لیے اپنے اپنے مذاق اور ماحول کے مطابق ایک نظامِ عمل اور اس کے اصول وقواعد بنا رکھے ہیں اور ہر جماعت ان کی پابند ہے، یہ ظاہر ہے کہ اصل مقصد، تو منصوص اور قطعی اور قرآن وسنت سے ثابت ہے، اس سے انحراف کرنا قرآن وسنت کے حدود سے نکلنا ہے؛ لیکن یہ اپنا بنایا ہوا نظامِ عمل اور اس کے تنظیمی اصول وقواعد نہ منصوص ہیں، نہ ان کا اتباع از روئے شرع ہر ایک کے لیے ضروری ہے؛ بل کہ جماعت کے ذمے داروں نے سہولتِ عمل کے لیے ان کو اختیار کرلیا ہے، ان میں حسبِ ضرورت

تبدیلیاں، وہ خود بھی کرتے رہتے ہیں اور حالات اور ماحول بدلنے پر اس کو چھوڑ کر کوئی دوسرا نظامِ عمل بنالینا بھی کسی کے نزدیک ناجائز یا مکروہ نہیں ہوتا؛ مگر اس میں عملی غلو تقریباً ہر جماعت میں یہ پایا جاتا ہے کہ اپنے مجوزہ نظامِ عمل کو مقصد و منصوص کا درجہ دے دیا گیا، جو شخص اس نظامِ عمل میں شریک نہیں، اگرچہ مقصد کا کتنا ہی عظیم کام کر رہا ہو، اس کو اپنا بھائی، اپنا شریک کار نہیں سمجھا جاتا اور اگر کوئی شخص اس نظامِ عمل میں شریک تھا، پھر کسی وجہ سے اس میں شریک نہ رہا، تو عملاً اسے اصل مقصد اور دین سے منحرف سمجھ لیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جاتا ہے، جو دین سے انحراف کرنے والوں کے ساتھ ہونا چاہیے، اگرچہ وہ اصل مقصد یعنی اقامتِ دین کی خدمت پہلے سے بھی زیادہ کرنے لگے، اس غلو کے نتیجے میں وہی تحزب و تعصب اور گروہ بندی کی آفتیں اچھے خاصے دین دار لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہیں، جو جاہلی عصبیتوں میں مبتلا لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔"(۱)

دعوتِ دین کے دوسرے طریقوں سے انکار بھی غلو ہے

مگر افسوس کہ آج بعض لوگوں نے دینی کام و دعوت الی اللہ کے لیے اپنے بنائے ہوئے اصول و طریقے و منہاج کو بالکل منصوص سمجھ لیا ہے اور اس کے خلاف دوسرے طریقے پر کیے جانے والے دینی کام و دعوت الی اللہ والے کام کو دینی کام و دعوت الی اللہ کا کام ماننے ہی تیار نہیں ہیں، حتی کہ دوسرے طریقوں سے کی جانے والی اللہ کے راستے کی محنتوں و خدمتوں کو لایعنی و فضول و بے کار قرار دینے و سمجھانے

---

(۱) وحدتِ امت: ۲۲-۲۴

کی کوششیں کی جاتی ہیں اور پھر یہیں سے حضراتِ علما و اکابرینِ امت کے خلاف ایک ذہن تیار ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ دین و دعوت کا کام نہیں کر رہے ہیں ؛ حال آں کہ وہ دوسرے طریقوں سے اسی کام میں بہت عمدہ طریقے پر لگے ہوئے ہوتے ہیں، یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ اس کی وجہ وہی ہے کہ منصوص و غیر منصوص میں فرق و تمیز نہیں ہوتی ، یہ وہی غلو فی الدین ہے، جس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

تبلیغی کام کرنے والوں کو مفکرِ اسلام مولانا علی میاں رَحِمَہُ اللّٰہُ کی تلقین

مفکرِ اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے ''تبلیغ دین کے لیے ایک اصول'' کے عنوان سے ایک نہایت ہی جامع بیان تحریر کیا ہے، جو''خطباتِ علی میاں'' کی جلد پنجم کے اخیر میں درج ہے، جس کے سطر سطر سے اسی غلو آمیز طریق پر لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ یہاں اس سے چند اہم اقتباسات نقل کریں۔

> ''اب دعوت الی اللہ کی مثال لیجیے! اللہ کی طرف اور اس کے دین کی طرف لوگوں کو بلانا فرض ہے، انفرادی ہو یا اجتماعی، تقریر سے ہو یا تحریر سے، علانیہ ہو یا خلوت میں، اس میں کوئی شکل متعین نہیں ....
>
> ......لہٰذا دعوتِ دین کا کام کرنے والے ہر فرد و جماعت کو اختیار ہے کہ وہ جس ماحول میں اپنے لیے جو طریقہ صحیح جانے وہ مقرر کرے اور اپنی سعی و جہد کا جو طرز مناسب اور مفید سمجھے وہ اختیار کرے، اس میں کسی کو جائز یا ناجائز کہنے یا کوئی روک لگانے کا حق حاصل نہیں ہے، جب تک کہ اس میں کوئی ایسا عنصر شامل نہ ہو جائے جو شرعی طور پر منکر یا مقاصدِ دینیہ کے لیے مضر ہو۔

بعض عوامی حلقوں میں اس وقت ان دونوں حصوں کو خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ منصوص کو غیر منصوص کا درجہ دیا جاتا ہے اور غیر منصوص کو منصوص کے مقام پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں اور مختلف اداروں اور دعوتوں میں اکثر تنازعہ کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ہم ان چیزوں کے فرق کو سمجھ لیں، تو بہت سی مشکلات حل ہو جائیں گی، سینکڑوں تنازعوں کا سد باب ہو جائے گا اور بہت سی ذہنی الجھنیں ختم ہو جائیں گی۔

دعوت الی اللہ کی مخصوص شکل اور طرز کی افادیت و تاثیر کی وضاحت کی جا سکتی ہے؛ لیکن کسی کو اپنے تجربے یا مطالعے کا اس طرح پابند نہیں کیا جا سکتا، جیسے احکامِ قطعیہ اور نصوصِ قرآنیہ کا، دین کی خدمت کرنے والی کوئی جماعت اگر کسی خاص طریقۂ کار کو اختیار کرتی ہے (بہ شرط کہ وہ دین کے اصول اور سلفِ صالحین کے متفقہ مسلک اور طرزِ عمل کے مخالف نہ ہو) تو وہ اپنے فیصلے میں حق بہ جانب ہے۔ ہم اپنے مخصوص طرزِ کار کو دوسری دعوتوں اور دین کی خدمت کرنے والے دوسرے حلقوں کے سامنے بہتر سے بہتر طریقے پر پیش کر سکتے ہیں؛ لیکن اگر صرف طرزِ کار کے فرق کی وجہ سے ہم ان کو غلط کار سمجھیں یا ان کی دینی مساعی اور مشاغل کی نفی کریں، جن کو انھوں نے اپنے تجربے اور مطالعے اور زمانے کے تقاضوں کے پیشِ نظر اختیار کیا ہے اور ان کی افادیت، واقعات اور برسوں کے تجربے سے ان پر واضح ہو چکی ہے اور کتاب و سنت اور سیرتِ نبوی اور حکمتِ دین کے وسیع دائرے میں اس کے لیے ان کے پاس شواہد اور دلائل پائے جاتے ہیں، تو یہ ہماری غلطی

اور زیادتی ہے۔

کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک طبقہ یہ سمجھنے لگا ہے کہ یہی طریقۂ کار اور یہی طرزِ دین کی خدمت اور احیا کے لیے ہمیشہ کے واسطے اور ہر جگہ کے لیے ضروری ہے اور اس کے علاوہ سب غلط ہے، جب تک اس مخصوص طریقے پر کام نہ ہو تو سمجھا جاتا ہے کہ ساری جد و جہد رائیگاں گئی اور جو کچھ ہوا سب فضول ہوا، یہ بے اعتدالی ہے اور یہ رویہ خطرناک ہے۔"(۱)

تبلیغ مختلف طریقوں سے کی جاسکتی ہے

اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دعوت الی اللہ و تبلیغِ دین کے مختلف راستے و طریقے ہو سکتے ہیں؛ بل کہ ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی طریقہ شرعی دائرے میں رہتے ہوئے اختیار کیا جا سکتا ہے اور اس میں شریعت نے پابند نہیں کیا ہے کہ کوئی خاص طریقہ اختیار کیا جائے؛ لہٰذا ایک اپنے ہی طریقے کو لازم و ضروری اور منصوص کی طرح سمجھنا اور دوسروں کو بھی اسی طریقے پر کام کرنے کے لیے اصرار کرنا حدود سے تجاوز و غلو ہے اور اگر دوسرے طریقے پر کام کرنے والوں کو مطعون کیا جائے، تو یہ ناجائز ہے۔

حضرت مفتی اعظم مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ (سابق مفتیِ اعظم دارالعلوم دیوبند) اپنے ایک فتوے میں لکھتے ہیں:

"حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین سیکھنا، اس پر عمل کرنا اس کو دوسروں تک پہنچانا، نہایت اہم اور ضروری ہے، امت نے اس کی اہمیت کو محسوس کیا ہے؛ البتہ طریقہ اس کا یکساں اختیار نہیں کیا، کسی

---

(۱) دیکھیے: خطباتِ علی میاں: ۵/۴۴۱-۴۴۸)

ایک طریقے کو سب کے لیے لازم نہیں قرار دیا، وعظ وتقریر، تصنیف و تالیف، ارشاد و تلقین حسب استعداد مناسب طرق سے کام لیا گیا، جس طرح مدارس کا نصاب ونظم ہے کہ وہ نہایت مفید ہے اور اس کو برقرار رکھنا ضروری ہے، مگر قرونِ اولیٰ میں یہ طریقہ موجود نہیں تھا، محض اس بنا پر اس کو غلط نہیں کہا جائے گا اور متقدمین پر یہ الزام نہیں ہوگا کہ انھوں نے اس کو کیوں اختیار نہیں کیا؛.............لیکن جو شخص مدرسے میں داخل نہ ہو، اس کو مطعون وملعون نہیں قرار دیا جائے گا، بہت سے بہت یہ کہا جائے گا کہ وہ اس نصاب کے فوائد سے بے بہرہ ہے۔ اس دور میں بے علمی و بے عملی عام ہے، مدارس میں پڑھنے والوں کی تعداد قلیل ہے، تو عوام تک دین پہنچانے اور ان کے دین کو پختہ کرنے کا ذریعہ موجودہ تبلیغی جماعت ہے، جو کہ بے حد مفید ہے اور اس کا مشاہدہ ہے؛ لیکن جو شخص دوسرے طریقے سے دین حاصل کرے اور دوسروں تک پہنچائے، اس کو مطعون اور ملعون کرنا ہرگز جائز نہیں۔'' (۱)

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

''عقائدِ حقہ، اخلاقِ فاضلہ، اعمالِ صالحہ کی تحصیل فرض ہے اور حسبِ حیثیت اس کی تبلیغ واشاعت بھی لازم ہے؛ مگر تحصیل وتبلیغ کی کوئی معین ومشخص صورت علی الاطلاق لازم نہیں کہ سب کو اس کا مکلّف قرار دیا جائے۔ مدارس، خانقاہوں، انجمنوں، کتابوں، رسالوں، اخباروں، مواعظ، مذاکرے، تقاریر، مجالس، تعلیمات، توجہات اور اس کے علاوہ بھی جو صورتیں مفید ومعین ہوں، ان کو اختیار کیا جا سکتا ہے، جب تک

(۱) فتاوی محمودیہ: ۴/۲۱۴

ان میں کوئی قبح و مفسدہ نہ ہو، مختلف استعداد رکھنے والوں کے لیے کوئی خاص صورت اسہل و انفع ہو، اس کا انکار بھی مکابرہ ہے اور اس خاص صورت کو سب کے لیے لازم قرار دینا بھی تضییق و تحجیر ہے۔ اگر کسی فرد یا جماعت کے لیے اسبابِ خاصہ کی بنا پر دیگر طرق مسدود و متعذر ہوں اور کوئی ایک طریقہ ہی متعین ہو، تو ظاہر ہے کہ اس صورت کو لازم کہا جائے گا.................. تبلیغی جماعت کا اصل مقصد دین کی طلب عام کرنا ہے، جس سے مدارس کو طلبا بھی کثرت سے ملیں اور خانقاہوں کو ذاکر بھی کثرت سے ملیں اور ہر مسلمان کے دل میں دین کی اہمیت پیدا ہو، اہلِ علم اہلِ مدارس حضرات کو حسبِ موقعہ تعاون فرمائیں۔ اگر اس میں کوتاہی اور خلافِ اصول چیزیں دیکھیں، تو خیر خواہی اور ہمدردی سے ان کی تصحیح کریں، اصلاح کریں اور جماعتوں کے ذمے ضروری ہے کہ خانقاہ اور مدارس کا پورا احترام کریں اور اپنی اصلاح کے لیے ان حضرات سے مشورہ لیں اور ان کی ہدایات کو دل و جان سے قبول کریں، ان کو ہرگز ہرگز دعوت نہ دیں کہ یہ حضرات اپنے دینی مشغلے کو ترک کر دیں اور مدارس و خانقاہوں کو بند کر کے تبلیغ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔" (۱)

الغرض دین کی دعوت و تبلیغ کسی بھی شرعی طریقے سے کی جا سکتی ہے، اس کے لیے اپنے ہی طریق و انداز کو لازم سمجھنا اور دوسروں کو اس کا مکلّف ٹھیرانا غلو ہے اور اس بیماری کا ایک سبب منصوص و غیر منصوص میں فرق نہ کرنا ہے، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔

---

(۱) فتاویٰ محمودیہ: ۴/۲۴۲-۲۴۳

وسائل و مقاصد میں تمیز نہ کرنا

دین میں بعض امور وہ ہیں، جن کو مقاصد گردانا گیا اور بعض وہ ہیں جو مقاصد کی تحصیل کے لیے محض وسائل و ذرائع کا درجہ رکھتے ہیں ، یہ دونوں ایک درجے کی چیزیں نہیں ہیں ؛ لہٰذا ان کو ایک درجے کی سمجھنا یا قرار دینا یا ان کے ساتھ ایک جیسا معاملہ کرنا بھی غلو ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ نماز با جماعت یا حج مقصود عبادات ہیں اور ان کو ادا کرنے کے لیے مختلف وسائل و ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں۔ مثلاً کوئی پیدل نماز کو آتا ہے، کوئی سائیکل میں ، کوئی اسکوٹر میں ، کوئی کار میں ، اسی طرح حج کو بھی لوگ مختلف طریقوں سے اپنی اپنی سہولت و ضرورت دیکھ کر آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو مقام و درجہ حج یا نماز با جماعت کا ہے، وہ ان وسائل کا نہیں ہیں؛ کیوں کہ وسائل اپنی سہولت و ضرورت و حیثیت وغیرہ کی وجہ سے مختلف ہو سکتے ہیں ؛ لہٰذا جس طرح حج یا نماز پر اصرار و شدت ہونا چاہیے، وہ اصرار و شدت ان وسائل و ذرائع کے سلسلے میں نہیں کی جا سکتی۔

مثلاً ایک شخص پیدل نماز کو آئے اور دوسرا کار میں، تو نہ کار والا پیدل آنے والے پر کوئی اعتراض کر سکتا ہے کہ تم کار میں کیوں نہیں آئے؟ اور نہ پیدل آنے والا کار والے پر کوئی لعنت و ملامت کر سکتا ہے کہ تم کار میں کیوں آئے ؟ کیوں کہ ان وسائل و ذرائع میں اسلام نے کوئی پابندی نہیں لگائی ہے۔

مفکرِ اسلام مولانا علی میاں رَحِمَہُ اللّٰہُ کی ایک تجزیاتی تحریر

یہاں مفکرِ اسلام حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی رَحِمَہُ اللّٰہُ کی ایک نہایت عالمانہ و فاضلانہ عبارت پیش کر دینا مناسب ہے، جو آپ نے حضرت شیخ الحدیث

مولانا زکریا صاحب کاندھلوی رَحِمَہُ اللّٰہُ کے ملفوظات و مضامین پر مشتمل ایک رسالہ ''اکابر کا سلوک و احسان'' کے شروع میں مقدمے کے طور پر تحریر کیا تھا، اس میں تصوف و سلوک کے سلسلے میں پیدا ہونے والی غلط فہمیوں و غلطیوں کا سبب زیادہ یہی وسائل و مقاصد کے فرق کو نظر انداز کرنے کو قرار دیا ہے؛ لہٰذا ملاحظہ کیجیے:

''مذاہب، اخلاقیات، تعلیم و تربیت، اصلاح و تجدید اور علوم و فنون سب کی تاریخ میں دو مرحلے بڑے سخت پیش آتے ہیں اور ان سے ان میں سے کسی کو مفر نہیں۔ ایک جب کہ وسائل مقاصد بن جاتے ہیں، دوسرے جب اصطلاحات حقائق کے لیے حجاب بن جاتے ہیں۔ وسائل و اصطلاحات دونوں نہایت ضروری اور بالکل قدرتی و طبعی چیزیں ہیں، جن کے بغیر ان مقاصدِ عالیہ کی تبلیغ و توسیع اور تشریح و تفہیم عام طور پر ممکن نہیں ہوتی؛ لیکن وسائل ہوں یا اصطلاحات، مقاصد و حقائق کے لیے ان کا درجہ خادم و معاون کا ہے، ان کو وقتی طور پر ایک ضرورت کی تکمیل کے لیے اختیار کیا جاتا ہے اور بعض اوقات ان پر مقاصد و حقائق ہی کی طرح زور دیا جاتا ہے اور ان کا مطالبہ کیا جاتا ہے؛ لیکن ان میں سے ہر فن کا مجتہد جب ضروری سمجھتا ہے، ان سے نہ صرف استغنا اختیار کرتا ہے؛ بل کہ بعض اوقات بہ طور علاج ان کے ترک کا بھی حکم دیتا ہے، وہ ان کا محکوم ہونے کے بجائے ان کا حاکم ہوتا ہے، وہ اس کا بھی لحاظ رکھتا ہے کہ اس تناسب سے آگے نہ بڑھنے پائیں کہ بجائے مفید ہونے کے مضر اور موصل الی المطلوب ہونے کے بجائے سدِ راہ اور طریق کے رہزن ثابت ہوں؛ لیکن اس تاریخی حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ان مقاصدِ عالیہ کو یہ ابتلا بار بار پیش آیا ہے کہ وسائل مقاصد بن گئے

اور اصطلاحات نے حقائق پر ایسے دبیز پردے ڈال دئے ہیں کہ وہ نہ صرف یہ کہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے؛ بل کہ ان سے ان تلخ تجربوں اور غلطیوں کی بنا پر جو ان اصطلاحات کے علمبرداروں سے سرزد ہوئیں ایسی شدید غلط فہمیاں پیدا ہوئیں کہ حق جو اور سلیم الفطرت انسانوں کی ایک بڑی تعداد کو ان مقاصد ہی سے ایسی وحشت اور بے زاری پیدا ہو گئی کہ ان کو ان مقاصد کے حصول و تکمیل اور ان حقائق کے قدر و اعتراف پر آمادہ کرنا ایک نہایت دشوار کام بن گیا۔" (۱)

صوفیا کے اشغال وطرق اور ان میں غلو

الغرض وسائل و مقاصد دونوں کو شریعت نے الگ الگ خانوں میں رکھا ہے؛ لہٰذا ان کو اسی طرح اپنے اپنے مقام و خانے میں رکھنا چاہیے؛ ورنہ اس سے غلو پیدا ہوگا اور وہ دین کا حلیہ بگاڑ دے گا، جیسے غالی و جاہل صوفیا نے تصوف کے نام سے بہت سی ایسی باتوں کو مقاصد سمجھ کر خود بھی راہِ استقامت سے دور ہو گئے اور دوسروں کو بھی غیر ضروری امور میں پھنسا کر صراطِ مستقیم سے بھٹکا دیا۔

اس کی ایک مثال حضراتِ صوفیا کے جاری کردہ اشغال و خاص قسم کے مراقبے ہیں، جن کا مقصد صرف یہ تھا کہ ایک انسان جو اللہ کے راستے میں چلنا چاہتا ہے، وہ یکسوئی کے ساتھ اس میں چلے اور اس کا انتشارِ ذہنی ختم ہو جائے اور اس راہ کا وہ کامیاب مسافر ہو، ظاہر ہے کہ یہ اشغال بنفسہٖ عبادات نہیں ہیں؛ بل کہ عبادتِ خداوندی کا ایک وسیلہ و ذریعہ ہیں، ان کو اسی حیثیت سے اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں؛ مگر بعد میں لوگوں نے ان ہی کو مقصود بنالیا اور ان کی نگاہ سے یہ بات روپوش ہوگئی کہ یہ

---

(۱) دیکھو: اکابر کا سلوک و احسان: ۷-۸

محض ذرائع کی قبیل سے ہیں؛ اس لیے علما نے اس طرح ان کو مقصود سمجھنے پر بدعت ہونے کا حکم لگایا ہے اور اگر ان کو ان ہی کی حیثیت پر رکھ کر اختیار کیا جائے، تو جائز ٹھیرایا ہے۔

علامہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی وضاحت

چناں چہ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے "ایضاح الحق الصریح" میں ان صوفیانہ اشغال و افعال اور طرق کے بارے میں فرمایا:

"اوراد و وظائف اور اذکار و ریاضات کو معین کرنا، عزلت نشینی اور چلہ کشی اختیار کرنا اور نفل عبادات اپنے اوپر لازم کرنا اور ذکرِ الٰہی کے طریقے اور ترکیبیں معین کرنا۔ مثلاً پکار کر یا آہستہ آواز میں یا ضربوں کے ساتھ یا ان کی گنتی اور تعداد کا تعین کرنا اور برزخی مراقبے اور اسی طرح کی دیگر مشکل و دقت طلب عبادات کو اپنے اوپر لازم کر لینا، یہ اکثر طالبین کے حق میں طاعت حقیقی کی قسم میں داخل ہے؛ کیوں کہ وہ اس کو ہی اصل کمال شرعی سمجھتے ہیں یا شریعت کا تکملہ گردانتے ہیں؛ البتہ خواص کے حق میں یہ بدعتِ حکمیہ ہوگی، جو ان امور کو صرف وسیلے سمجھ کر ان کی تعلیم و ترویج کی کوشش کرتے ہیں اور جہاں تک خاص الخاص حضرات کا تعلق ہے جو کہ محض چند غبی اور کند لوگوں کی ہدایت کے لیے ان کو ان امورِ بالا کی تعلیم دیں اور بہ قدرِ ضرورت وسیلوں کے طور پر اور بغیر کسی التزام کے اور بغیر کسی ترویجِ عام اور اہتمام کے ان امور کو کام میں لائیں اور مقصد حاصل ہونے کے بعد ان کو چھوڑ دیں، تو بے شک اس صورت میں مذکورہ بالا امور کی تعلیم ان کے حق میں بدعت شمار نہ

ہوگی؛ لیکن ہم یہاں جو کلام کر رہے ہیں، وہ اہلِ زمانہ کی اکثریت کے بارے میں ہے، جو ان امور کو ایک شریعتِ مستمرہ اور طریقۂ مسلوکہ کے مثل سمجھتے ہیں۔" (۱)

یہ طرق و اشغال اور احوال و مواجید غیر مقصود ہیں

اسی طرح محققینِ اہلِ تصوف نے سالکین کو پیش آنے والے احوال و مواجید اور علوم و معارف کے غیر مقصود اور وسائل میں سے ہونے کی تصریح کی اور جو لوگ ان کو مقصود سمجھتے ہیں ان کی تغلیط کی ہے۔

امام ربانی مجدد الف ثانی سرہندی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اپنے مکتوبات میں اسی سلسلے میں فرمایا:

"احوال و مواجید اور علوم و معارف، جو صوفیہ کو راستے میں ہاتھ آتے ہیں، وہ مقاصد نہیں ہیں؛ بل کہ اوہام و خیالات ہیں، جن سے اطفالِ طریقت کی تربیت مطلوب ہوتی ہے، ان تمام سے گزر کر مقامِ رضا میں پہنچنا چاہیے، جو جذب و سلوک کے مقامات کی انتہا ہے؛ کیوں کہ طریقت و حقیقت کے منازل طے کرنے سے اخلاص کا حاصل کرنا مقصود ہے، جو رضا کو مستلزم ہے.................کوتاہ اندیش لوگ احوال و مواجید کو مقاصد اور مشاہدات و تجلیات کو مطالب شمار کرتے ہیں؛ اس لیے وہم و خیال کے زنداں خانے میں گرفتار رہتے ہیں اور شریعت کے کمالات سے محروم رہتے ہیں۔" (۲)

---

(۱) ایضاح الحق الصریح مترجم: ۷۹-۸۰

(۲) مکتوباتِ امام ربانی رَحِمَہُ اللّٰہُ: مکتوب: ۳۶

نیز محقق صوفیا نے ان اشغال و اعمال کی حیثیت کو واضح کر دیا ہے، چناں چہ حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَهُ اللهُ ایک صاحب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے ضرب و شغل کے بارے میں پوچھا، تو آپ نے اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا:

"طریق خاص ضرب نہ مقصود ہے نہ موقوف علیہ، جس طرح بے تکلف بن جائے، کافی ہے"۔(۱)

نیز آپ ہی نے اپنی کتاب "قصد السبیل" میں فرمایا:

"ان (تسبیحات) کو تھوڑی آواز اور ہلکی ضرب سے کریں؛ لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ زور سے ذکر کرنا اور ضرب لگانا، خود کوئی ثواب کی بات نہیں ہے، ایسا اعتقاد کرنا گناہ ہے۔"(۲)

اور میرے شیخ و استاذ مسیح الامت حضرت اقدس مولانا مسیح اللہ خان صاحب رَحِمَهُ اللهُ نے اپنی کتاب لاجواب "شریعت و تصوف" میں لکھا ہے:

"یہ سب طرق مقصود بالذات نہیں؛ بل کہ وسیلۂ یکسوئی ہیں، جو ایک درجے میں شرعاً مطلوب ہیں-- آگے چل کر فرماتے ہیں-- بس یہ بات خوب یاد رکھنے کی ہے کہ یہ کیفیات اگر مقدمۂ عبادت نہ بنائی جائیں، تو پھر ان کا کچھ اجر نہیں اور مقاصد میں سے تو کسی حال نہیں۔"(۳)

حاصل ان سب اکابر کے بیانات کا یہ ہے کہ جو کام و امر کسی مصلحت و ضرورت سے شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے جاری کر لیے جاتے ہیں۔ جیسے صوفیا نے

---

(۱) انفاس عیسیٰ: ۶۳

(۲) تسہیل قصد السبیل: ۱۷

(۳) شریعت و تصوف: ۲/۲۲-۲۳

بعض خاص انداز کے وظائف یا اشغال اور مراقبات وغیرہ، تو یہ اگر صرف اسی مصلحت کے پیشِ نظر اور اس مصلحت کے حصول تک جاری رہیں اور ان کو لازم و ضروری اور منصوص کی طرح نہ سمجھا جائے، تو یہ جائز و درست ہیں؛ لیکن اگر ان کو منصوص طریقے کی طرح سمجھا جائے اور لازم کرلیا جائے، تو وہ بدعت میں داخل ہو جاتا ہے، اگر چہ کہ وہ کسی دینی مقصد ہی سے کیوں نہ کیا جاتا ہو۔

دین کے بجائے مدارس کو مقصود بنانے والوں کا غلو

وسائل و مقاصد میں فرق نہ کرنے کی صورت میں پیش آنے والی اس غلو آمیز صورتِ حال کی ایک مثال ہمیں ان مدارسِ اسلامیہ میں نظر آتی ہے، جو بہ جائے خود مدارس کو مقصود بنا کر اس بات کو فراموش کر جاتے ہیں کہ مدارسِ اسلامیہ علم دین کی حفاظت و اشاعت اور دین و شریعت کے احکام کی تحقیق و تبلیغ کے مراکز ہیں، جہاں یہ دینی و علمی کام مقصود ہے، خود مدارس کا وجود کوئی مقصود نہیں۔ یہ لوگ جب اصل مقصد و منشا کو نظر انداز کر کے ایک وسیلے کو مقصد کا درجہ دے دیتے ہیں، تو اب یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ یہ لوگ حلال و حرام تک کی تمیز نہیں کرتے، احکامِ اسلام کو خود ہی پامال کرتے رہتے ہیں، حساب و کتاب کی صفائی کا کوئی خیال نہیں کرتے، زکاۃ و غیر زکاۃ کی مدات میں امتیاز نہیں رکھتے، نہ آمدنی میں احکام کی رعایت کرتے ہیں، نہ خرچ میں اس کا لحاظ رکھتے ہیں؛ بل کہ پوری توجہ و دھیان اس پر ہوتا ہے کہ کسی بھی طرح چندے کی شرح بڑھتی جائے اور اس کو من مانی طریقے سے وہ استعمال کرتے رہیں۔

ان لوگوں کو تعلیم و تربیت مقصود نہیں ہوتی؛ بل کہ خود مدرسہ مقصود ہوتا ہے اور پھر ان میں دو قسم کے لوگ ہیں: ایک وہ جن کو ان مدارس کے نام سے دنیا کمانا مقصود ہوتا ہے اور دوسرے وہ ہیں جن کو دنیا تو مقصود نہیں؛ لیکن دین و علمِ دین بھی مقصود نہیں ہوتا۔

پہلی قسم کے لوگ مدارس کو دنیا کمانے کا ایک ذریعہ و وسیلہ بنا کر سچ و جھوٹ، جس طرح ہو، چندہ کرتے پھرتے ہیں؛ تا کہ اپنا پیٹ پالیں اور دنیا حاصل کریں۔

جھوٹے مدارس، جھوٹی رسیدیں

(۱) ان میں بعض لوگ وہ ہیں، جو مدارس کے نام سے جھوٹی رسیدیں بنوا کر اور جھوٹی دستاویزات و تصدیقات لے کر لوگوں میں گھومتے رہتے ہیں، ان کے کوئی مدرسے ہی نہیں ہوتے یا ہوتے ہیں، تو برائے نام ہوتے ہیں، وہاں نہ تعلیم ہوتی ہے، نہ تربیت کا کوئی نظام ہوتا ہے؛ بل کہ دو چار طلبہ کو کہیں سے فراہم کر لیتے اور ایک بورڈ مدرسے کا لگا کر مہتمم صاحب صرف چندہ کرنے کے لیے گھومتے رہتے ہیں، کہاں کی تعلیم اور کیسی تربیت! اور اس سے ان کو غرض ہی کیا! ان لوگوں کا اصل کام یہ ہوتا ہے کہ لوگوں سے چندہ لیا جائے اور خوش آمد و چاپلوسی کے ساتھ وصول کیا جائے اور حلال و حرام کسی بھی طرح وصول کیا جائے اور اپنی دنیا بنائی جائے۔ اس سلسلے میں احقر کے سامنے کئی واقعات و حالات آچکے ہیں، ان کو یہاں درج کیا جائے، تو بات کافی طویل ہو جائے گی؛ لہٰذا ان کو اس وقت نظر انداز کرتا ہوں۔

واللہ! یہ علما نہیں؛ بل کہ علما کے لباس میں یا تو بھکاری ہیں یا دھوکے باز اور علما کے نام پر ایک داغ کی حیثیت رکھتے ہیں؛ لہٰذا امت کو بھی چاہیے کہ وہ حقیقی علما اور ان دھوکے بازوں کے مابین فرق و امتیاز کرے اور پہچان پیدا کرے اور خود دھوکہ نہ کھائے اور اس قسم کے لوگوں کی چاپلوسی و تملق کو دیکھ کر حقیقی علما سے بدظنی میں مبتلا نہ ہو۔

چندہ وصولی میں بے احتیاطی و بے اصولی

(۲) نیز اس قسم کے لوگ چندہ کرنے میں علم دین اور علمائے دین کے وقار کو ٹھیس پہنچاتے اور علم و علما کو ذلیل بھی کرتے ہیں؛ کیوں کہ عام طور پر یہ لوگ چندہ

وصول کرنے میں نہایت بے غیرتی کا مظاہرہ کرتے ہیں، مال داروں و دنیا داروں سے تملق و چاپلوسی اور ان کی خوش آمد کرتے پھرتے ہیں، حرام کمائی والوں سے بھی وصول کرتے ہیں، ذلت و دناءت والا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللہُ نے بیان کیا ہے :

> ''ایک جگہ ایک مدرسہ تھا، اس کے جلسے میں ایک واعظ صاحب فرمارہے تھے کہ ''افسوس کی بات ہے کہ اتنی دیر اگر ایک کسبی ناچتی، تو لوگ اس کو کس قدر دیتے، ہمیں ایک کسبی کے برابر بھی نہیں سمجھتے کہ گھنٹہ بھر سے ہم مانگ رہے ہیں اور کوئی کچھ نہیں دیتا'' افسوس اس واعظ کو بیان کرتے ہوئے غیرت بھی نہ آئی۔''(۱)

اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے مولویوں کو دیکھنے والے، ایک جانب علما سے بدظنی کا شکار ہوتے ہیں اور دوسری طرف مدارس؛ بل کہ خود علمِ دین سے بھی بے زار ہو جاتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ سارے علما اور سارے مدارس ایسے ہی ہوتے ہیں، اگر چہ کہ ان لوگوں کی یہ غلطی ہے اور سخت قسم کی غلطی ہے؛ کیوں کہ چند اس قسم کے لوگوں کو دیکھ کر سارے علما اور سارے مدارس سے بدظن ہونا ایسا ہی ہے جیسے بعض دھوکے باز ڈاکٹروں یا وکیلوں کو دیکھ کر سارے ڈاکٹروں اور وکیلوں کو غلط کار و دھوکے باز سمجھا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ بے وقوفی ہے؛ لیکن یہاں روئے سخن ہمارا ان علما و مولویوں یا صحیح لفظوں میں مولوی نما لوگوں سے ہے، جن کی ان بے جا حرکتوں و بے اعتدالیوں کے نتیجے میں علم و علما کی توہین و تذلیل ہو رہی ہے۔

اس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے جس کو حضرت مولانا تھانوی رَحِمَہُ اللہُ نے فرمایا:

---

(۱) خطبات حکیم الامت: ۴۳۹/۸

اسی طرح مدرسے کی تشہیر کے لیے مدرسے کی تصویر کے ساتھ اساتذہ وطلبائے مدرسہ کی تصاویر بھی شائع کرتے ہیں، جس کا حرام ہونا جمہور کے نزدیک مسلم ہے، اسی طرح اپنے مدرسے کے جلسوں میں بھی تصویر کشی وویڈیو گرافی کا نظم کرتے ہیں۔

دوسری خرابی ان میں یہ ہے کہ مدرسہ چلانے کے لیے وہ بھی لوگوں سے تملق وچاپلوسی کرتے اور ذلت کا انداز اختیار کرتے ہیں، جو مدارس کی عظمت وجلالت کے بالکل خلاف ومنافی ہے، اسی طرح اس بات کی بھی کوئی رعایت نہیں کی جاتی کہ چندہ صحیح طریقے وحلال ذرائع سے حاصل ہو۔

یہاں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ کے اس سلسلے میں ایک دو ملفوظات نقل کردینا مناسب ہے، آپ نے اپنے وعظ ''شفاء العی'' میں فرمایا:

''اسی طرح احکام کی تحقیق نہ ہونے سے چندہ جمع کرنے میں اس کی رعایت بالکل نہیں ہوتی کہ خوشی سے دے رہا ہے یا بغیر خوشی ....
..................دین کے لیے چندے کی غرض رضائے خداوندی ہے اور وہ جب نصیب ہوتی ہے کہ قواعدِ شرعیہ کے موافق کام کیا جائے؛ ورنہ بہ جائے رضائے باری تعالیٰ کے غضبِ الٰہی کا اندیشہ ہے۔''(۱)

آپ نے ایک وعظ ''تاسیس البنیان'' میں فرمایا:

''پس یاد رکھو کہ بڑی چیز دین کی محبت اور عزت ہے، علما کو دین کی عزت کا لحاظ رکھنا چاہیے، جس میں ان کی بھی عزت ہوگی اور دین کی عزت استغنا میں ہے، علما دنیا داروں سے جب تک استغنا نہ کریں، اس وقت تک ان کی عزت نہ ہوگی اور جب علما استغنا کریں گے؛ اسی وقت عزت وعظمت رونما ہوگی؛ مگر آج کل تو علما نے اپنی قدر کھودی ہے

(۱) خطبات حکیم الامت:۲۱/۱۶۷

کہ دنیاداروں کے دروازوں پر جاتے اور کھانالاتے ہیں۔‘‘(۱)

لہٰذا اہلِ مدارس کو چندے کے سلسلے میں بہت احتیاط برتنے کی ضرورت ہے اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے، جب کہ ہم مدرسے کو مقصود بنانے کے بہ جائے علم و تعلیم اور دین و شریعت کو مقصود بنائیں اور یہاں جن امور کی جانب اشارے کیے گئے ہیں، ان کی اساس و بنیاد ہی یہ ہے کہ مدرسے ہی کو مقصود سمجھ لیا اور ٹھیرالیا، حال آں کہ یہ مقصود نہیں؛ بل کہ دین و علم دین کے لیے ایک وسیلہ و ذریعہ تھا۔ اگر دین مقصود ہوگا؛ تو ہم مدرسے کی خاطر دین کے اصول کو نہیں توڑیں گے۔

ایک قابل توجہ بات

یہاں ایک بات کی جانب اہلِ مدارس کو توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عموماً یہ دیکھنے میں آیا کہ جب مدارسِ اسلامیہ کے چندے کا اعلان ہوتا ہے، تو اس طرح اعلان کیا جاتا ہے:

> ’’مدرسے میں اتنے غریب و یتیم بچے پڑھتے ہیں اور ان کے لیے کھانے پینے وغیرہ ضروریات کو پورا کرنا ہے، جو آپ لوگوں کے چندوں سے پورا کیا جاتا ہے؛ لہٰذا اس مدرسے کی امداد کریں۔‘‘

یعنی مدرسے کا اعلان غربت کے حوالے سے کیا جاتا ہے؛ حال آں کہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مدرسے کا اعلان دین و علم دین کے تحفظ و بقا کے حوالے سے کیا جاتا اور لوگوں کو یہ بتایا جاتا کہ یہ دینی مدارس دنیا میں علوم اسلامیہ کے سرچشمے، دین و علم دین کے بقا کا سامان، مسلمانوں کی دینی و شرعی ضرورتوں کے مراکز اور سب سے بڑھ کر ملتِ اسلامیہ کی شان و بان و آن ہیں؛ لہٰذا ان کا تحفظ و بقا اور ان کی ترقی و تطویر میں

(۱) خطبات حکیم الامت: ۴۳۸/۸

حصہ لینا، اہلِ اسلام کی ایک اجتماعی ذمے داری ہے۔ اعلان تو اس طرح ہونا چاہیے؛ مگر جو اعلان، غربت کے حوالے سے کیا جاتا ہے، غور کیجیے کہ اس طرزِ اعلان کا کیا اثر رونما ہوتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ اعلان کا یہ انداز لوگوں کی نظر میں مدرسے کو ایک غریب خانے کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور عوام الناس یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ مدارس دراصل غریب خانے ہیں، جس کی حیثیت یتیم خانے کی ہے، جس کو کھانا میسر نہ ہو، جس کو کپڑے میسر نہ ہوں، جس کو دنیا کمانا نہ آتا ہو؛ اس کے لیے اس کے پاس اسباب نہ ہوں، وہ مدرسے میں آئے گا اور ہمارے دیے ہوئے صدقات وخیرات سے اپنی غربت کا علاج کرے گا، پھر اسی تصور وخیال سے ایک اور ذہنیت پیدا ہوتی ہے، وہ یہ کہ مدارس صرف غریبوں اور محتاجوں، یتیموں کے لیے ہوتے ہیں، یہاں مال داروں اور رئیسوں کے بچوں کے لیے کچھ نہیں ؛ اسی لیے آج مدارس صرف غربت زدہ لوگوں کے لیے مخصوص ہو گئے ہیں اور مال دار و رئیسوں کا طبقہ کبھی اپنے بچوں کے لیے مدارس میں بھیجنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کیوں؟ اس کی بہت سی وجوہات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ علمائے مدارس نے خود لوگوں کے سامنے وہ انداز اختیار کیا ہے، جس کی وجہ سے وہ یہ سمجھنے لگے کہ مدارس غریبوں کے ٹھکانے اور یتیم خانوں کے ہمدوش ہیں۔

غور کیا جائے کہ اس انداز وطریقے نے صرف یہ نہیں کہ مدارس کی حیثیت عرفی و شرعی کو ٹھیس پہنچایا؛ بل کہ درحقیقت خود دین کی حیثیت کو بھی مجروح کر دیا، حال آں کہ یہ انداز ایک بھیک مانگنے کا تو ہو سکتا ہے، مگر مدارسِ اسلامیہ جو دینِ اسلام کے عظیم قلعے کہلاتے ہیں، ان کے لیے کیا یہ انداز مناسب ہے؟ کیا اس سے لوگوں کے ذہنوں میں مدارس کی عظمت پیدا ہو گی یا ان کی حقارت؟ الغرض مدارس کی عظمت و جلالت، ان کے عظیم ترین کام و خدمت کے پیشِ نظر حضراتِ علما کو مدارسِ اسلامیہ

کے چندے کے سلسلے میں انتہائی استغنا کی شان کے ساتھ لوگوں کو متوجہ کرنا چاہیے۔

وسائل کو مقاصد سمجھ لینے کے نقصانات

اب یہ بھی سمجھیے کہ وسائل کو مقاصد کے برابر سمجھنے سے متعدد مضرت رساں ونقصان دہ چیزیں ظاہر ہوتی ہیں:

ایک بڑی گمراہ کن بات یہ پیدا ہوتی ہے کہ لوگوں کی نگاہ صرف وسائل پر رہتی ہے اور اسی کو حاصل کرنے وکرانے کی فکر میں لگ کر مقاصد سے غفلت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً نماز با جماعت میں شامل ہونے کے مختلف وسائل ہیں، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا؛ لیکن اگر ہم ان وسائل ہی کو مقصد کا درجہ دے دیں، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم اسی کے پیچھے پڑے رہیں گے کہ فلاں شخص کار میں آیا یا پیدل آیا یا سائیکل پر آیا، اسی بحث وتکرار میں نماز با جماعت کی فکر چھوڑ کر غفلت میں مبتلا ہو جائیں گے، حال آں کہ اہم موضوع تو نماز با جماعت تھا۔

اسی طرح دینی کاموں کو انجام دینے کے وسائل کو خود دینی کام کے برابر سمجھ جانے یا قرار دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ دین پر کون ہے اور کون نہیں؟ اور دینی کام میں کون ہے اور کون نہیں؟ بل کہ اس کے بہ جائے اس فکر میں پڑے رہتے ہیں کہ فلاں طریقے سے کون کام کر رہا ہے اور کون نہیں؟ حال آں کہ مقصود تو دین و دینی کام ہے، طریقہ خواہ کچھ بھی ہو، اسی لیے ایسے لوگوں کے پاس ایک ایسا شخص جو دین پر ہے؛ مگر ان کے طریقے سے دین و دین داری نہ سیکھا ہو، تو وہ اس کو دین دار نہیں مانتے؛ بل کہ اس کی برائی کی جاتی ہے اور اس کو مطعون کیا جاتا ہے اور اس کے برعکس ایک ایسا شخص جو دین دار نہ ہو؛ لیکن ان کے طریقے سے جڑا ہوا ہو، تو اس کو دین دار سمجھتے ہیں، اس کی تعریفیں کرتے ہیں، حال آں کہ اس میں دین داری نہیں ہوتی؛ بل کہ بہت سے اعمال دین کے خلاف کرتا رہتا ہے۔

اسی سے ایک بیماری یہ نکلتی ہے کہ ایسے لوگ چوں کہ وسائل ہی کو مقصود کا درجہ دیے ہوتے ہیں؛ اس لیے ان مخصوص وسائل اور خاص طریقوں کے مطابق دینی کام کیا جائے، تو اس کو دینی کام قرار دے کر اس کی تائید و تصدیق اور اس میں مدد و نصرت کرتے ہیں اور اسی مقصود کو دوسرے وسائل و طریقوں سے کیا جائے، تو نہ صرف یہ کہ اس کی تائید و نصرت نہیں کرتے؛ بل کہ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

ایک جگہ حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے فرمایا:

''غضب تو یہ ہو رہا ہے کہ بعضے مبلغین دوسری جماعتِ مبلغین کی مذمت کر کے ان ناواقف نومسلموں کو ان کی اتباع کرنے سے روک رہے ہیں............ تعلیمِ اسلام میں بھی دو حیثیت ہیں: میرا سکھلایا ہوا اسلام اور دوسرے کا سکھلایا ہوا باطل، جیسے دو طالب علم تھے اور دونوں سگے بھائی تھے، آپس میں لڑے اور ایک نے دوسرے کو ماں کی گالی دی، کسی نے کہا کہ: ارے کم بخت! وہ تیری بھی تو ماں ہے۔ تو کہنے لگا کہ اس میں دو حیثیت ہیں: ایک یہ کہ میری ماں ہے، اس حیثیت سے معظّمہ مکرمہ ہے اور ایک یہ کہ وہ اس کی ماں ہے، اس حیثیت سے وہ ایسی اور ویسی ہے۔ اسلام میں بھی دو حیثیتیں بنالیں ایک یہ کہ میں سکھاؤں، اس حیثیت سے اسلام برحق ہے۔ ایک یہ کہ تو سکھائے، اس حیثیت سے برحق نہیں۔''(۱)

اسی مثال کا مصداق نظر آتے ہیں، وہ لوگ جو وسائل کو مقصود قرار دے کر دوسرے طریقوں سے وہی کام و خدمت کرنے والوں کی مخالفت کرتے ہیں۔

آج کل تبلیغی جماعت سے وابستہ افراد میں بڑے پیمانے پر یہ غلو پیدا ہو گیا ہے

---

(۱) خطبات حکیم الامت: ۱۳/۵۳-۵۴

کہ وہ اپنے خاص طریقے وطرزِ عمل کے علاوہ سارے طریقوں کو ایسا لگتا ہے کہ نہ صرف غیر مفید؛ بل کہ گویا ناروا سمجھتے ہیں؛ اس لیے حضراتِ علمائے کرام عموماً جو طریقے ''دعوت و تبلیغِ دین'' کے اختیار کرتے ہیں، جیسے تفسیری حلقے و درس حدیث کی محافل، خطباتِ جمعہ و دیگر عوام خطابات و بیانات وغیرہ کے سلسلے، ان کو یہ لوگ تبلیغ و دعوت کی مد ہی میں شمار نہیں کرتے اور یہ اعتراض کیے جاتے ہیں کہ علما تبلیغی و دعوتی کام نہیں کرتے؛ حال آں کہ وہ حضرات اپنے اپنے طریقوں سے یہ کام کیے جارہے ہیں۔

اسی کو دیکھ کر حضرت مرشدی مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رَحِمَهُ اللهُ خلیفۂ حضرت تھانوی رَحِمَهُ اللهُ نے اپنی کتاب ''اشرف الہدایات لاصلاح المنکرات'' کے دیباچے میں تحریر فرمایا تھا:

''بعض وہ صاحبان جن کو کچھ توفیق دینی جد و جہد کی عطا ہوئی، وہ حضراتِ علمائے کاملین پر یہ اعتراض کرنے لگے کہ دین مٹ رہا ہے اور یہ حضرات تبلیغ نہیں کرتے ہیں۔ حال آں کہ وہ حضرات بڑی دینی خدمات میں ہمہ تن مشغول رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے اعتراض سے ظاہر ہوا کہ تبلیغ کی ضروری حدود؛ بل کہ اس کی حقیقت سے ناواقفیت کے ساتھ ساتھ یہ لوگ اس نظام خاص کو جس کے موافق دینی مساعی کرتے ہیں مقصود سمجھتے ہیں، جو افراط کا مصداق ہے؛ حال آں کہ نظام سنت کے علاوہ کوئی اور نظام مقصود نہیں اور کسی دوسرے نظام کو یہ درجہ دینا صریح تعدی اور بدعت ہے، جس کی قباحت ظاہر ہے۔''(۱)

نیز اسی کتاب میں ایک اور موقعے پر آپ لکھتے ہیں:

''یہ خوب ذہن نشین کرلیا جائے کہ نظام سنت کے علاوہ کوئی نظام تبلیغ

---

(۱) اشرف الہدایات:۳۰

وغیرہ مقصود نہیں؛ لہٰذا اس کو مقصود سمجھنا (جو اس میں مشغول نہ ہو، اس کو تبلیغ کرنے والا نہ سمجھنا) یہ صریح حدود سے تجاوز اور بدعت ہے۔ البتہ اگر کسی نظام میں اصول وحدودِ دین کے خلاف کوئی بات ہو، تو وہ قابل اصلاح ہے۔ اس نظام کے منتظمین کو اصلاح طلب امور سے مطلع کرنا عملِ خیر ہے۔ اگر کسی دوسرے نظام میں کوئی دینی خرابی نہ ہو، پھر بھی اس سے انقباض ہو، گرانی ہو کہ یہ کام کیوں جاری ہوا، یہ بھی حدود سے تجاوز ہے اور نشانی ہے عدمِ اخلاص کی۔ ایسوں کو اپنی اصلاح کا اہتمام ضروری ہے اور آج کل یہ مرض بہت عام ہے۔"(۱)

ایک اور بات اس کے نتیجے میں یہ دیکھنے اور سننے کو ملتی ہے کہ اس غلو میں مبتلا لوگ علما و ائمہ کے خلاف کارروائیاں کرنے اور ان کو منصبِ امامت و خطابت سے بے دخل کرنے کی سازشیں و کوششیں بھی کرتے رہتے ہیں اور بعض اوقات ان پر جھوٹے الزامات تھوپ کر اور گھناؤنی سازشیں کر کے ان کو ذلیل و رسوا کرتے ہیں اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ وہ لوگ انتہائی مخلصانہ طور پر کرتے ہیں؛ کیوں کہ ان کے نزدیک ایسے اماموں اور علما، جو ان کے خاص طرز و انداز پر دینی جدو جہد نہیں کرتے، وہ گمراہ یا کم از کم ناکارہ و نالائق سمجھے جاتے ہیں اور فکرِ امت و دردِ ملت سے عاری و خالی ہوتے ہیں؛ لہٰذا ان کو ان مناصب و عہدوں سے ہٹانا، ان لوگوں کے نزدیک برحق اور ان کا فرض ہوتا ہے۔ فیا للعجب!

اس نظریے کے حاملین کی اس قسم کی مجرمانہ کارروائیوں کی وجہ سے بہت سے علما و ائمہ ان کے شاکی ہیں اور یہ کوئی اکا دکا واقعہ نہیں؛ بل کہ بہت سے مقامات پر ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں؛ حال آں کہ یہ کارروائی سراسر حرام و ناجائز ہے، جس

---

(۱) اشرف الہدایات: ۵۵

میں علما کی توہین وتحقیر کے علاوہ اذیت رسانی بھی شامل ہے۔ بس اللہ ہی ان کو ہدایت دے۔

لہٰذا وسائل وذرائع کو مقاصد کی طرح نہیں سمجھنا چاہیے؛ بل کہ دیکھنا یہ چاہیے کہ دین کا کام ہورہا ہے اور لوگ دین سے وابستہ ہورہے ہیں، یا نہیں؟ اگر ہورہے ہیں؛ تو مقصد کا حصول اس طریقے سے ہو یا کسی اور طریقے سے، ہر صورت میں مقصود و مطلوب حاصل ہے، رسمیت کے بہ جائے حقیقت اور ظاہر داری کے بہ جائے حق شناسی سے کام لینا چاہیے؛ تاکہ غلو کی بات ہم سے سرزد نہ ہو اور ہم اس کا ارتکاب کر کے گناہ گار نہ بنیں۔

دینی امور وشعبوں کی تحدید یا ان میں تقابل

غلو کی ایک صورت یہ ہے کہ دینی امور اور شعبوں کو اپنی جانب سے کسی خاص امر و شعبے میں منحصر سمجھا جائے اور باقی اور دینی امور و شعبوں کو دین سے خارج یا غیر اہم سمجھا جائے۔ جیسے بہت سے اہلِ اسلام میں یہ بات پیدا ہوگئی ہے کہ وہ دین و دین داری اس کو سمجھتے ہیں کہ نماز و روزہ یا زیادہ سے زیادہ زکوۃ و حج کرلیا جائے، یہ دین کے لیے کافی ہے اور دین کے جو دیگر شعبے ہیں، جیسے معاشرت و معاملات و اخلاق، ان کو یا تو دین ہی نہیں سمجھتے یا اہم وضروری نہیں سمجھتے؛ لہٰذا نماز بھی جاری رہتی ہے اور اسی کے ساتھ معاملات ومعاشرت میں بے حد بے اعتدالیاں بھی جاری رہتی ہیں، جھوٹ وفریب و دھوکہ دہی، حلال وحرام کی تمیز نہ ہونا وغیرہ؛ یہاں تک کہ ان بے اعتدالیوں کو وہ کوئی گناہ بھی نہیں سمجھتے۔

اسی طرح کا غلو یہ بھی ہے کہ دین کے مختلف شعبوں: تعلیم وتعلم، تبلیغ و دعوت، تزکیہ وسلوک اور پھر دعوت وتبلیغ کے دو رکن: ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' وغیرہ

میں سے بعض کو دین سمجھا جائے اور بعض کو دین ہی نہ سمجھا جائے یا دین تو سمجھا جائے؛ لیکن ان کو غیر اہم قرار دیا جائے یا ان میں تقابل و تفاضل کی صورت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

آج کل دیکھنے میں آتا ہے کہ بہت سے عوام الناس دین کے مختلف شعبوں میں سے ایک یا چند شعبوں کو تو دین سمجھتے ہیں اور دیگر شعبوں کو یا تو دین ہی نہیں سمجھتے یا ضروری نہیں سمجھتے؛ حال آں کہ دین کے مختلف شعبوں میں سے ہر شعبہ اپنی جگہ اہم و ضروری ہے اور ایک دوسرے سے ان کا ربط و تعلق بھی ہے۔ مثلاً دین کے اہم و بنیادی شعبوں میں سے ایک شعبہ ''تعلیم و تعلم'' کا ہے، ایک شعبہ ''اصلاح و تزکیہ'' کا ہے اور ایک شعبہ ''دعوت و تبلیغ'' کا ہے اور یہ تینوں شعبے اہم و ضروری ہونے کے ساتھ ایک دوسرے سے مربوط و متعلق بھی ہیں۔

دین کے بہت سے شعبے ہیں اور سب ضروری ہیں

چناں چہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے مقاصدِ بعثت کا تذکرہ فرماتے ہوئے آپ کی ذمے داریوں میں ان تینوں شعبوں کا ذکر کیا ہے:

ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنے بے پایاں احسانات کا ذکر اس طرح کیا ہے:

﴿ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ (آل عمران: ۱۶۴)

(تحقیق کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین پر بڑا احسان فرمایا کہ ان ہی میں سے ایک رسول برپا کیا، جو ان پر اس کی آیات کو پڑھتا، ان کی اصلاح

کرتا اور ان کو کتاب اللہ و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ کہ یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی بے راہ روی میں تھے۔)

ایک اور موقعے پر اللہ تعالیٰ نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بھی اسی بات کا تذکرہ فرمایا ہے:

﴿هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (الجمعۃ:۲)

(اللہ کی ذات وہ ہے، جس نے ان پڑھ لوگوں میں ایک رسول برپا کیا، جو ان پر اس کی آیات کو پڑھتا، ان کی اصلاح کرتا اور ان کو کتاب اللہ و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ کہ یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی بے راہ روی میں تھے۔)

اور ایک جگہ حضرت سیدنا ابراہیم و حضرت سیدنا اسماعیل علیہما السلام کی دعاؤں کا ذکر کرتے ہوئے جو ان حضرات نے تکمیلِ کعبہ کے وقت کی تھی، ایک دعا ان الفاظ میں نقل فرماتے ہیں:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ (البقرۃ:۱۲۹)

(اے ہمارے پروردگار! اور آپ ان ہی لوگوں میں سے ایک رسول بھیجئے، جو ان پر آپ کی آیات پڑھے، کتاب اللہ و حکمت کی ان کو تعلیم دے اور ان کی اصلاح کرے، بلا شبہ آپ زبردست حکمت والے ہیں۔)

یہ تین آیات حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصدِ بعثت کو واضح کر رہی ہیں اور یہ سب دراصل دین کے شعبے ہیں، جن کو جاری و نافذ کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بھیجا گیا۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اپنے ''فوائدِ تفسیر'' میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خلاصہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چار شانیں ہیں:

(۱) ''تلاوتِ آیات'' (اللہ کی آیات پڑھ کر سنانا) جن کے ظاہری معنے وہ لوگ اہلِ زبان ہونے کی وجہ سے سمجھ لیتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے۔

(۲) ''تزکیۂ نفوس'' (نفسانی آلائشوں اور تمام مراتب شرک و معصیت سے ان کو پاک کرنا اور دلوں کو مانجھ کر صیقل کرنا) یہ چیز آیات اللہ کے عام مضامین پر عمل کرنے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور قلبی توجہ و تصرف سے باذن اللہ حاصل ہوتی تھی۔

(۳) ''تعلیمِ کتاب'' (کتاب اللہ کی مراد بتانا) اس کی ضرورت خاص خاص مواقع پر پیش آتی تھی۔

(۴) ''تعلیمِ حکمت'' (حکمت کی گہری باتیں سکھلانا) اور قرآنِ کریم کے غامض اسرار و لطائف اور شریعت کی دقیق و عمیق علل پر مطلع کرنا۔'' (۱)

اور اس سے زیادہ واضح بیان اس سلسلے میں حضرت مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا ہے، آپ ان تینوں آیات کا حوالہ دے کر ان پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

---

(۱) تفسیر عثمانی: ۹۲-۹۳

”﴿سُورَةُ الْبَقَرَةِ﴾ کی اس آیت میں اور ﴿سُورَةُ آلِ عِمْرَانَ﴾ و ﴿سُورَةُ الْجُمُعَةِ﴾ کی آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایک ہی مضمون ایک ہی طرح کے الفاظ میں آیا ہے، جن میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا میں تشریف لانے کے مقاصد یا آپ کے عہدۂ نبوت و رسالت کے فرائضِ منصبی تین بیان کیے گئے ہیں: ایک تلاوتِ آیات، دوسرے تعلیمِ کتاب و حکمت، تیسرے تزکیۂ اخلاق وغیرہ۔“ (پھر آپ نے ان مقاصد کی تشریح و توضیح کی ہے)(۱)

اس آیت سے اور ان حضراتِ اکابر کے اس تفسیری بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جن مقاصد کے لیے بھیجا تھا، وہ تین تھے: ایک تلاوت آیات یعنی اللہ کا پیغام من وعن لوگوں کے سامنے پیش کر دینا، دوسرے کتاب اللہ کی تعلیم یعنی ان کے معانی و مضامین کی تفسیر و تشریح کرنا اور اسی کے ساتھ حکمت کی تعلیم اور حکمت سے مراد ”حدیث“ ہے؛ لہٰذا حدیث وسنت کی تعلیم بھی اسی میں داخل ہے اور تیسرے تزکیہ واصلاح یعنی لوگوں کے ظاہر و باطن کو کفر و شرک و معصیت کی نجاستوں و آلودگیوں سے صاف کر کے ان میں نیکی و بھلائی، ایمان و یقین، توکل واعتماد علی اللہ، محبت و تعلق مع اللہ، خوف وخشیت، تقوی و انابت، خشوع و زاری کی صفات و کیفیات پیدا کرنا۔

لہٰذا ان شعبہ ہائے دین میں سے بعض کو ماننا یا ضروری خیال کرنا اور دوسرے بعض کو غیر ضروری قرار دینا یا ان سے بے اعتنائی برتنا، یہ بھی غلو فی الدین کی صورت ہے، جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ دین کے اور شعبوں کی جانب سے لاپروائی و بے اعتنائی

---

(۱) دیکھو! معارف القرآن: ۱/۳۳۳-۳۳۶

پیدا ہوگی اور کبھی یہ بھی ہوگا کہ یہ شعبے دین سے نکال دیے جائیں گے یا ان میں تقابل کیا جائے گا۔

اکابرین کی اس سلسلے میں تنبیہات

اسی لیے حضراتِ اکابرین نے ہمیشہ اس قسم کی ذہنیت کو ختم کرنے اور امت کو راہِ استقامت دکھانے کی کوشش کی ہے، یہاں مناسب ہے کہ بعض اکابرین کے بیانات سے اہم اقتباسات پیش کر دیے جائیں، تاکہ لوگ غلو سے دور رہیں اور راہِ راست سے دور نہ ہوں۔

حضرت اقدس مولانا سعید احمد خان صاحب مکی رَحِمَہُ اللّٰہُ، جو تحریکِ دعوت وتبلیغ کے اساطین میں مانے جاتے ہیں، انھوں نے اپنے ایک مکتوب میں جو "تبلیغی کام کے اہم اصول" کے نام سے شائع شدہ ہے، لکھا ہے:

> "دین کے تمام شعبے ایسے ہی ہیں جیسے انسان کے اعضا و جوارح، آنکھ سے دیکھنے کا کام، زبان سے بولنے کا کام، ہاتھ سے پکڑنے، کانوں سے سننے، پیروں سے چلنے، دماغ سے سوچنے کا کام، یہ سارے کام انسان کے لیے ضروری ہیں۔ اگر ایک عضو میں بھی کمزوری ہوگی یا نقص ہوگا، تو اس سے تمام جسم کو تکلیف ہوگی اور چیزوں سے استفادہ میں نقصان ہوگا۔ ان سب اعضا کی سخت ضرورت ہے۔ یہ سب اعضا ایک دوسرے کے معاون ہیں، مقابل نہیں ہیں۔ اسی طرح سے اللہ کا ذکر اور علم، عبادت، خدمت اور معاملات، قضا، سب ایک دوسرے کے معاون ہیں، مقابل نہیں ہیں، معاون ہونے ہی کی وجہ سے دین مکمل ہوتا ہے، دعوت تو ان تمام شعبوں کو دنیا میں پھیلانے اور عام کرنے ہی

کے لیے ہے۔"(۱)

نیز حضرت والا رحمۃ اللہ نے اس سے ذرا پہلے ان لوگوں کے طرزِ عمل پر نکیر کی ہے، جو دیگر شعبوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جس سے ان شعبوں کی تنقیص و تحقیر لازم آتی ہے۔ آپ اسی مکتوب میں لکھتے ہیں:

"بہت سارے حضرات کو خصوصاً کسی دینی شعبے کو چلانے والے کے لیے ہماری دعوت اور ہمارے بیانوں سے اعتراض پیدا ہو جاتے ہیں کہ گویا ہم ان شعبوں کو ناقص سمجھ رہے ہیں یا ان کو حقیر سمجھ رہے ہیں، اگر ہمیں دعوت کا صحیح صحیح طرز آ جائے، تو ہر ایک ہمیں اپنا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھ کر خود بھی قریب ہوگا اور ہمیں بھی اپنے سے قریب کرے گا، مثلاً جب ہم دعوت کے نمبر کو اور اس کی اہمیت کو بیان کرتے ہیں، تو کبھی علم والوں کے شعبے پر یعنی مدارس پر اس طرح فوقیت دیتے ہیں، گویا وہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں اور کبھی ذکر والوں کے مقابلے میں، جیسا کہ بہت سے واعظین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت دوسرے انبیا کے مقابلے میں اس طرح بیان کرنے لگتے ہیں کہ دوسرے انبیا کی تنقیص لازم آنے لگتی ہے اور ان کا یہ طرزِ بیان دین کے لیے بہت خطرناک ہے، ایسے ہی ہمارا طرزِ بیان بھی خطرناک ہو جاتا ہے۔"(۲)

حضرت مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ، جو حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ کے بلا واسطہ فیض یافتہ ہیں، انھوں نے اپنے مواعظ میں متعدد مواقع پر اس بات کی وضاحت اور اس پر تنبیہ کی ہے کہ دین کے

(۱) تبلیغی کام کے اہم اصول: ۷-۸
(۲) تبلیغی کام کے اہم اصول: ۵

شعبے: علم وذکر اور دعوت سب ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور سب کی ضرورت ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں:

"اللہ جل جلالہ وعم نوالہ نے ہماری کامیابی کے لیے اور ہم سب کو ایمان دار بنانے کے لیے تین چیزیں اتاری ہیں۔ تعلیم، تبلیغ اور تزکیہ اور ان تین چیزوں میں تضاد نہیں ہے؛ بل کہ "توأم" (جڑواں) ہیں، بغیر ذکر کے علم پر عمل مشکل، بغیر علم کے ایمانی زندگی کا حاصل ہونا مشکل، بغیر تبلیغ کے ایمانی زندگی کا چلنا اور پھیلنا مشکل۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تینوں چیزیں ساتھ دی ہیں۔" (۱)

ان تینوں شعبوں کی ضرورت وافادیت اور ان کے باہمی ربط وتعلق کے سلسلے میں بانئ جماعتِ تبلیغ حضرت اقدس مولانا شاہ محمد الیاس صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ کا نقطۂ نظر سن لیں، حضرت مولانا عبید اللہ بلیاوی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"حضرت مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ نے ان تینوں کو جوڑا، ان تینوں کو اکھٹا کیا ہے، جو صرف علم حاصل کر رہا ہے، بے شک اس کے پاس علم کا نور ہو اور علم کے اعتبار سے اس کو پتہ چل جائے؛ لیکن اگر اس کے پاس ذکر نہیں ہے، تو ہو سکتا ہے کہ وہ علم والا ظلمت میں رہے اور بہک جائے اور پھسل جائے اور جو صرف ذکر کر رہا ہے اور علم حاصل نہیں کر رہا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس ذکر کرنے والے کو نور ذکر کامل جائے؛ لیکن اس سے کوئی لغزش ہو جائے، کوتاہی ہو جائے، علم نہ ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ خطرے کے موقعے پر ہے اور صرف علم وذکر والا، جو دعوت وتبلیغ (یعنی کسی بھی نہج وطریقے سے اللہ کے دین کو لوگوں تک

---

(۱) مواعظِ عبیدیہ: ۵۵۶

پہنچانے اور پھیلانے کا کام) کے میدان میں نہیں ہے، تو اس کے علم و ذکر سے ہوسکتا ہے کہ ایک دائرے میں اسلام محفوظ رہے اور کچھ خاص اشخاص کے پاس علم آجائے اور ذکر آجائے؛ لیکن پوری دنیا میں خدا کا نظم آجائے اور پوری دنیا میں اللہ کا حکم نافذ ہوجائے، تو یہ غلبہ بغیر دعوت و تبلیغ کے کام کے نہیں ہوگا۔ اس واسطے یہ تینوں چیزیں متلازم ہیں اور بڑے حضرت رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ تینوں چیزیں متلازم ہیں۔'' (۱)

اسی کے ساتھ حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب رحمہ اللہ کا ایک ملفوظ سن لیجیے! جس کو حضرت مولانا عبید اللہ صاحب رحمہ اللہ نے اپنے مواعظ میں نقل کیا ہے، فرمایا:

''حضرت مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ میں علم اور ذکر کی تقویت کے لیے تبلیغ کا کام کر رہا ہوں، جب آدمی جماعت میں چل کر تین چلے لگالے گا اور پھر تم اس کو علم پر اور دوازدہ تسبیح پر ڈال دوگے، تو وہ زیادہ نفع بخش کام کرنے والا بن جائے گا۔ فرماتے تھے کہ تبلیغ کے ذریعے تصوف کی طرف کھینچنا ہے اور تبلیغ کے ذریعے علم کی طرف کھینچنا ہے ....(مولانا عبید اللہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:) ''اسی طرح حضرت (مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ) بغیر ذکر اور علم کے تبلیغ سے بہت جلد فتنوں کے آنے کا اندیشہ ظاہر کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ بغیر علم و ذکر والی تبلیغ کے ذریعے صدیوں میں آنے والا فتنہ و فساد منٹوں میں آجائے گا اور جب تبلیغ کا کام صحیح اصولوں پر ہوگا، تو

---

(۱) مواعظِ عبیدیہ: ۴۵۱

صدیوں کے فتنے وفساد منٹوں میں ٹل جائیں گے۔‘‘(۱)

الغرض ان اکابر کے بیانات وتصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دین کے تمام شعبے اپنی اپنی جگہ لازم وضروری ہیں اور ایک دوسرے سے مربوط بھی اور ایک شعبے والے دوسرے شعبے والوں کے معاون ہیں نہ کہ مقابل اور ایک دوسرے کے رفیق ہیں، نہ کہ فریق؛ لہٰذا سب کو اسی طرح دین کے شعبوں میں معاون بننا چاہیے؛ نہ کہ ایک دوسرے کے مقابل۔

جب تمام شعبوں کی اہمیت وضرورت و افادیت معلوم ہوگئی، تو کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں ہے کہ جب بعض حضراتِ علما ان شعبوں میں سے بعض شعبوں پر کام کرتے ہیں، تو ان پر اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ کیوں یہ کام کیا جارہا ہے؟ جب کہ وہ بھی دین ہی کا ایک شعبہ ہے اور اس پر بھی کام وخدمت کی اسی طرح ضرورت ہوتی ہے، جس طرح دیگر شعبوں پر محنت وخدمت کی ضرورت ہے۔

تمام شعبے ایک دوسرے سے مربوط ہیں

یہاں یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ دین کے تمام شعبے اس لیے بھی ضروری ہیں کہ یہ سب ایک مربوط نظام کا حصہ ہیں، تعلیمی شعبوں کو تزکیتی شعبوں و دعوتی شعبوں سے مربوط وہم آہنگ ہونا چاہیے، اسی طرح تبلیغی و دعوتی شعبہ جات کو علمی و اصلاحی شعبوں سے مربوط رہنا چاہیے۔

کیوں کہ اگر علم نہ ہو، تو نہ ذکر مفید و بارآور ہے، نہ دعوت وتبلیغ ہی صحیح طریقے سے انجام دی جاسکتی ہے اور اگر ذکر نہ ہو، تو علم ایک فتنہ بن سکتا ہے اور تبلیغ ایک بے نور عمل ہوکر رہ جائے اور اگر تبلیغی محنت نہ ہو، تو علم وذکر دونوں ناکام ہوجاتے ہیں؛

(۱) مواعظِ عبدیہ: ۱۹۷

اس لیے یہ سب اوران کے ذیلی تمام شعبہ جات کومربوط سمجھنا اور رکھنا چاہیے؛ نیز علم کے لیے قائم کردہ مدارس درحقیقت صرف مدارسِ علم نہیں ہیں؛ بل کہ وہ بہ یک وقت مدارس بھی ہیں اور دینی دعوت کے مراکز بھی ہیں اور جن حضرات نے ان کو قائم کیا، ان کے پیشِ نظر بھی یہی تھا کہ ان مدارس سے ایک جانب علمِ دین کی تدریس و تحقیق، ان کی حفاظت وصیانت کے ساتھ ساتھ دین وعلمِ دین کی تبلیغ واشاعت بھی ہوگی۔

حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی رَحِمَہُ اللہُ اپنے عربی رسالے " الأضواء علی الحرکات ، والدعوات الدینیة ، والإصلاحیة "میں ہندوستان میں مدارس کے قیام کا پسِ منظر اور دارالعلوم دیوبند ومظاہر علوم سہارنپور اور ان سے منسلک یا ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے مدارس کے قیام کا مقصد واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"علما نے دین وعلومِ دین کے ضائع ہونے کا اندیشہ کیا اور بلادِ ہند میں اسلامی حکومت کے زوال اور اس کی جگہ کفار کے حکومت کے لے لینے کے بعد اسلام کے مستقبل کے بارے میں خوف کیا...............

...............اور اپنے سامنے عربی مدارس و دینی معاہد کھولنے کے سوا کوئی راستہ نہیں دیکھا، پس انھوں نے یہ دین کے قلعے بنائے؛ تا کہ اسلامی حیات کے بچے کچے حصے کو محفوظ کریں اور مغربی تہذیب وتمدن کی لہر کا مقابلہ کریں اور ان مدارس سے اسلام کے داعی و واعظ، مصلح و عالم پیدا کریں؛ تا کہ اہلِ اسلام کے لیے ان کے دین کو محفوظ کریں اور ان کے اعتماد کو بہ حال کریں.........................پس ان مدارس کا دین و دعوتِ اسلامی کی نشر واشاعت اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے مختلف طبقات میں رواج دینے اور بدعات وخرافات کا مقابلہ کرنے اور عوام میں دینی روح کے پھونکنے کے سلسلے میں بڑا عظیم

کارنامہ ہے۔“(۱)

معلوم ہوا کہ مدارس کے قیام کا مقصد صرف تعلیم ہی نہیں؛ بل کہ دعوت وتبلیغِ اسلام و اِعلام بھی ان کے مقاصد میں داخل ہے اور اسی کے موافق یہ اب تک نمایاں خدمات بھی انجام دیتے چلے آئے ہیں۔ الغرض یہ سارے شعبہ ہائے دین ایک دوسرے سے مربوط اور ایک دوسرے کو تقویت پہنچانے کے بڑے ذرائع ہیں۔

اس کا اندازہ حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ کے ایک ملفوظ سے بہ خوبی ہوسکتا ہے، آپ نے فرمایا:

”علما سے کہنا ہے کہ ان تبلیغی جماعتوں کی چلت پھرت، زور ومحنت وکوشش سے عوام میں دین کی صرف طلب اور قدر ہی پیدا کی جاسکتی ہے اور ان کو دین سیکھنے پر آمادہ ہی کیا جاسکتا ہے، آگے دین کی تعلیم وتربیت کا کام علما وصلحا کی توجہ فرمائی ہی سے ہوسکتا ہے؛ اس لیے آپ حضرات کی توجہات کی بڑی ضرورت ہے۔“(۲)

اس ملفوظ سے واضح طور پر سمجھا جاسکتا ہے کہ حضرت رَحِمَہُ اللّٰہُ کی نظر میں علما ومشائخ اور ان کے زیرِ نگرانی قائم و جاری تعلیمی و اصلاحی ادارے، جن کو مدارس وخانقاہیں کہا جاتا ہے، ان کی کس قدر اہمیت تھی؟! آپ صاف فرماتے ہیں کہ اس تبلیغی کوشش ومحنت کا اثر تو صرف یہ ہے کہ لوگوں میں دین کا ذوق وشوق، اس کی قدر ومنزلت اور اس کی طلب وجستجو پیدا کی جاسکتی ہے؛ مگر اس کے بعد وہ علم حاصل کریں یا اپنی تربیت چاہیں تو کیا کریں؟ اس کا جواب یہ دیا کہ وہ علما وصلحا ہی کا کام ہے، یہ کام تو وہی حضرات کرسکتے ہیں؛ اسی لیے علما نے مکاتبِ اسلامیہ و مدارسِ دینیہ کا جال

---

(۱) الأضواء علی الحرکات والدعوات: ۲۳-۲۴

(۲) ملفوظات: مرتبہ مولانا منظور نعمانی رَحِمَہُ اللّٰہُ: ۱۴۲

بچھایا ہے اور مشائخ نے خانقاہی نظام و اصلاحی پروگرام ترتیب دیا ہے اور ان دونوں طبقات کی محنتیں جاری ہیں؛ لہٰذا مدارس و خانقاہوں کو اسی تبلیغ کا ایک اہم جزو حصہ سمجھا جائے، تو یہ سب کے سب مربوط رہیں گے۔

حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ کا ایک اور ارشاد آپ کے ملفوظات میں ہے، جو تمام تبلیغی جماعتوں اور اس سلسلے سے وابستہ حضرات؛ بل کہ سبھی دینی کام کرنے والوں کے لیے فکر انگیز ہے، ملاحظہ کیجیے:

> ”ہماری اس دینی دعوت میں کام کرنے والے سب ہی لوگوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دینی چاہیے کہ تبلیغی جماعتوں کے نکلنے کا مقصد صرف دوسروں کو پہنچانا و بتانا ہی نہیں ہے؛ بل کہ اس کے ذریعے سے اپنی اصلاح اور اپنی تعلیم و تربیت بھی مقصود ہے، چناں چہ نکلنے کے زمانے میں علم و ذکر میں مشغولیت کا بہت زیادہ اہتمام کیا جائے۔ علمِ دین و ذکر اللہ کے بغیر نکلنا کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ علم و ذکر میں مشغولیت اس راہ کے بڑوں سے وابستگی رکھتے ہوئے اور ان کے زیرِ ہدایت و نگرانی ہو۔ انبیا عَلَیْہِمُ الصَّلاۃُ وَالسَّلام کا علم و ذکر اللہ کے زیرِ ہدایت تھا اور صحابۂ کرام حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے علم و ذکر لیتے تھے اور حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ان کی پوری پوری نگرانی فرماتے تھے، اسی طرح ہر زمانے کے لوگوں نے اپنے بڑوں سے علم و ذکر لیا اور ان کی نگرانی و رہنمائی میں تکمیل کی۔ ایسے ہی آج بھی ہم اپنے بڑوں کی نگرانی کے محتاج ہیں؛ ورنہ شیطان کے جال میں پھنس جانے کا بڑا اندیشہ ہے۔“(۱)

---

(۱) ملفوظاتِ شاہ محمد الیاس رَحِمَہُ اللّٰہُ :مرتبہ مولانا منظور نعمانی رَحِمَہُ اللّٰہُ :۹۳-۹۴

اس میں حضرت نے علم دین وذکر اللہ کے بغیر دعوتی وتبلیغی مہم وتحریک کو" کچھ بھی نہیں" کہہ کر غیر مفید قرار دے دیا ہے، پھر ایک اہم بات یہ بتائی کہ علم وذکر کی تحصیل "اس راہ کے بڑوں" سے حاصل کی جائے اور یہ معلوم ہے کہ علم کی راہ کے بڑے "علمائے امت" ہیں اور ذکر کی راہ کے بڑے "مشائخِ صوفیا" ہیں؛ لہٰذا ان سے علم وذکر کی تحصیل کی جائے اور یہ بھی واضح کر دیا کہ اوپر سے ہی یہ طریقہ وسنت چلی آ رہی ہے کہ علم وذکر اس راہ کے بڑوں سے حاصل کیا جاتا ہے؛ لہٰذا دعوت وتبلیغ سے نسبت رکھنے والے اپنے علم وذکر کی تحصیل علما وصلحا سے کریں، تو یہ سارے شعبے مربوط رہیں گے اور یہ لوگ بھی ان سارے شعبوں سے مربوط رہیں گے۔

نیز آپ نے فرمایا:

"ہماری اس تحریک کا اصل مقصد ہے مسلمانوں کو جمیع ما جاء بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سکھانا (یعنی اسلام کے پورے علمی وعملی نظام سے امت کو وابستہ کر دینا) یہ تو ہے ہمارا اصل مقصد۔ رہی قافلوں کی چلت پھرت اور تبلیغی گشت، سو یہ اس مقصد کے لیے ابتدائی ذریعہ ہے اور کلمہ ونماز کی تلقین وتعلیم گویا ہمارے پورے نصاب کی "الف بے تے" ہے، یہ بھی ظاہر کہ ہمارے قافلے پورا کام نہیں کر سکتے، ان سے تو بس اتنا ہی ہو سکتا ہے، تو ہر جگہ پہنچ کر اپنی جد وجہد سے ایک حرکت و بیداری پیدا کر دیں اور غافلوں کو متوجہ کر کے وہاں کے مقامی اہلِ دین سے وابستہ کرنے کی اور اس جگہ دین کی فکر کرنے والوں (علما وصلحا) کو بیچارے عوام کی اصلاح پر لگا دینے کی کوشش کریں۔ ہر جگہ تو اصلی کام وہیں کے کارکن کر سکیں گے اور عوام کو زیادہ فائدہ اپنی جگہ کے اہلِ دین ہی سے استفادہ کرنے سے ہوگا۔ البتہ اس کا طریقہ ہمارے ان آدمیوں سے

سیکھا جائے، جو ایک عرصے سے افادہ واستفادہ اور تعلیم وتعلم کے اس طریقے پر عامل ہیں اور اس پر بڑی حد تک قابو پا چکے ہیں۔"(۱)

نیز آپ نے خانقاہی نظام ومشائخِ صوفیا سے جماعتوں کو وابستہ رکھنے کی جد وجہد بھی فرمائی؛ تاکہ وہاں سے بھی فیض پانے کا سلسلہ جاری رہے۔ حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ نے آپ کی سوانح میں حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ کے ایک خط کا ذکر کیا ہے، جو آپ نے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ کو تحریر فرمایا تھا، اس میں آپ نے لکھا:

"میری ایک پرانی تمنا ہے کہ خاص اصول کے ساتھ مشائخِ طریقت کے یہاں یہ جماعتیں آدابِ خانقاہ کی بجا آوری کرتے خانقاہوں میں فیض اندوز ہوں اور جس میں باضابطہ خاص وقتوں میں حوالی کے گاؤں میں تبلیغ بھی جاری رہے، اس بارے میں ان آنے والوں سے مشاورت کر کے کوئی طرز مقرر فرما رکھیں، یہ بندہ ناچیز بھی اسی ہفتے بہت زیادہ اغلب ہے کہ چند رؤسا کے ساتھ حاضر ہو، دیو بند اور تھانہ بھون کا بھی خیال ہے۔"(۲)

بل کہ اس نظام کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے یہاں تک آپ نے فرمایا:

"مجھے جب بھی میوات جانا ہوتا ہے، تو ہمیشہ اہلِ خیر اور ذکر کے مجمع کے ساتھ جاتا ہوں، پھر بھی عمومی اختلاط سے قلب کی حالت اس قدر متغیر ہو جاتی ہے کہ جب تک اعتکاف کے ذریعے اس کو غسل نہ دوں یا چند روز کے لیے سہارنپور یا رائے پور کے خاص مجمع یا ماحول میں جا کر نہ

(۱) ملفوظات: مرتبہ مولانا منظور نعمانی رحمۃ اللہ: ۲۹-۳۰

(۲) مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ اور ان کی دینی دعوت: ۱۲۴-۱۲۵

رہوں قلب اپنی حالت پر نہیں آتا۔“(۱)

حضرت مولانا جیسی روحانی و علمی شخصیت کو کسی اور کام کے لیے نہیں؛ بل کہ تبلیغی کام کے لیے گشتوں میں جانے کے بعد محسوس ہو رہا ہے کہ قلب کی حالت میں فرق آ گیا ہے؛ لہٰذا غسلِ اعتکاف اور صحبتِ صالحین سے اس کو ٹھیک کرنا چاہتے ہیں، تو ہمہ وشما کا کیا کہنا؟! کیا ہم جیسے لوگوں کو ان مشائخ سے اور خانقاہی نظام سے وابستہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے؟!

نیز قرآن پڑھنا اور صحت و تجوید سے پڑھنا، ایک اہم وضروری کام ہے، حضرت مولانا رَحِمَهُ اللهُ نے اس اہم وضروری کام کی جانب تبلیغی جماعتوں کو متوجہ کیا اور اس کو بھی اہلِ علم سے حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے، چناں چہ ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں:

”تبلیغی جماعتوں کے نصابِ تعلیم کا ایک اہم جز تجوید بھی ہے، قرآن شریف اچھی طرح پڑھنا بڑی ضروری چیز ہے............لیکن تجوید کی تعلیم کے لیے جتنا وقت درکار ہے، جماعت میں اتنا وقت نہیں مل سکتا؛ اس لیے ان ایام میں تو صرف اس کی کوشش کی جائے کہ لوگوں کو اس کی ضرورت کا احساس ہو جائے اور کچھ مناسبت ہو جائے اور پھر اس کو سیکھنے کے لیے وہ مستقل وقت صرف کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔“(۲)

اندازہ لگائیے کہ اس میں صاف اقرار ہے کہ محض تبلیغی جماعت میں نکل جانے سے یہ اہم وضروری کام ”تجوید کی تحصیل“ پورا نہیں ہو سکتا، جماعت میں صرف

---

(۱) ملفوظات: مرتبہ مولانا منظور نعمانی رَحِمَهُ اللهُ: ۶۵

(۲) ملفوظات: مرتبہ مولانا منظور نعمانی رَحِمَهُ اللهُ: ۱۳۸

ترغیب وتشویق پیدا کی جاسکتی ہے؛ لہٰذا اس کے بعد اہلِ علم حضرات سے رجوع کر کے اس کو مستقل وقت میں پڑھنا چاہیے؛ لہٰذا ان مدارس کو اس طرح تبلیغ سے مربوط کر دیا۔

یہی نہیں کہ یہ سارے شعبہ جاتِ اسلامیہ وخدماتِ دینیہ آپ کی نظر میں ضروری تھے؛ بل کہ یہ بڑے اہم و اونچے درجے کے کام بھی تھے۔ چناں چہ آپ کے ملفوظات میں ایک ارشاد یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

> ''بزرگوں کی خدمت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کے جو عمومی و معمولی کام دوسرے لوگ انجام دے سکتے ہوں، وہ ان کو اپنے ذمے لے لیں؛ تاکہ ان کے اوقات اور ان کی قوتیں ان بڑے کاموں کے لیے فارغ ہوجائیں جو وہی انجام دے سکتے ہیں، مثلاً شیخ وقت یا کسی عالم و مفتی کے وہ عمومی کام آپ اپنے ذمے لے لیں، جو آپ کے بس میں ہیں اور ان کو ان کی طرف سے فارغ و بے فکر کر دیں۔ تو وہ حضرات دین کے جو بڑے بڑے کام کرتے ہیں (مثلاً اصلاح وارشاد اور درس و افتاوغیرہ) تو وہ زیادہ اطمینان و یکسوئی سے ان کو انجام دے سکیں گے اور اس طرح یہ خدام ان کے ان بڑے کاموں کے اجر میں حصہ دار بن جائیں گے۔''(۱)

اس میں آپ نے لوگوں کو اس بات کی ترغیب دی اور متوجہ کیا کہ علما و مشائخ، جو بڑے بڑے کاموں میں لگے ہیں، ان کے دنیوی معمولی وعمومی کاموں کو خود کر کے ان کو فارغ کردیں؛ تاکہ وہ اپنی بڑی و عظیم الشان خدمات، قرآن و سنت کی تدریس، قلوب ونفوس کی اصلاح وتزکیہ، علوم کی تحقیق وترتیب، افتا وغیرہ میں خوب

(۱) ملفوظات: مرتبہ مولانا منظور نعمانی رحمہ اللہ: ۱۳۸-۱۳۹

یکسوئی سے خدمت انجام دے سکیں۔

اب اخیر میں حضرت کی ایک نہایت ہی اہم بات سن لیں اور عبرت حاصل کریں کہ حضرت مولانا نے اپنے نہج کی دعوتی و تبلیغی سرگرمیوں میں لگنے والوں کو اس بات کی بھی تلقین کی ہے کہ وہ اس خیال سے استغفار کی کثرت کریں کہ اس کام میں لگنے سے کئی اہم شعبوں کے سلسلے میں ہم سے تقصیر ہوگئی۔ لیجیے آپ کے الفاظ پڑھیے:

''کسی کام میں اشتغال اس کے علاوہ اور بہت سی چیزوں سے اعراض کو مستلزم ہوتا ہے، یعنی اشتغال فی شَے ہوگا تو اشتغال عن اشیا ہوگا اور پھر جس درجے کا اشتغال فی شے ہوگا، تو دوسری چیزوں کے اہتمام میں اسی درجے کی کمی ہوگی، شریعت میں جو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہر اچھے سے اچھے کام کے ختم پر استغفار کیا جائے، میرے نزدیک اس میں ایک راز یہ بھی ہے کہ شاید اس اچھے کام میں مشغولی اور انہماک کی وجہ سے کسی دوسرے امر کی تعمیل میں کوتاہی ہوگئی ہو، خاص کر جب کسی کام کی لگن میں دل لگ جاتا ہے اور دل دماغ پر وہ کام چھا جاتا ہے، تو پھر اس کے ماسوا دوسرے کاموں میں بسا اوقات تقصیر ہو جاتی ہے، اس لیے ہمارے کام میں لگنے والوں کو خصوصاً کام کے زمانے میں اور کام کے خاتمے پر استغفار کی کثرت اپنے اوپر لازم کر لینی چاہیے۔'' (۱)

اللہ اکبر! کیا اعتدال و توسط ہے اور کس قدر حقیقت کشا بیان ہے کہ آپ کی نظر میں دیگر کام بھی نہایت اہم ہیں؛ مگر انسان ایک کام میں مشغولی کی وجہ سے دوسرے امور سے کبھی غفلت یا اعراض کر جاتا ہے، اسی طرح حضرت کہتے ہیں کہ دعوتی کام میں لگنے والے بھی سوچیں کہ ہم سے دیگر شعبوں اور کاموں کے بارے میں غفلت

---

(۱) ملفوظات: مرتبہ مولانا منظور نعمانی رحمۃ اللہ: ۱۴۱-۱۴۲

ہورہی ہے؛ اس لیے استغفار کریں اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جس کا یہ احساس ہو، وہ اس سلسلے میں سعیٔ بلیغ بھی کرے گا کہ مجھ سے یہ کوتاہی نہ ہو؛ لہٰذا اس میں تعلیم ہے کہ دیگر کاموں وخدمات سے غفلت نہ کی جائے۔

الحاصل تمام شعبہ جات، دینی شعبے ہونے کی وجہ سے اہمیت کے حامل ہیں اور سب کے سب ضروری بھی ہیں اور ایک دوسرے سے مربوط بھی۔

سب اہلِ اسلام کا ایک ہی شعبے میں لگ جانا صحیح نہیں

جب اپنے شعبے کے علاوہ دوسرے شعبوں کو غیر ضروری وغیر اہم سمجھ لیا جاتا ہے، تو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ سب کے سب اسی ایک شعبے میں محنت کریں اور لگیں، حال آں کہ قرآنِ کریم نے اس سے منع کیا ہے۔

ایک جگہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْٓا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ﴾ (التوبۃ:۱۲۲)

(اور مسلمانوں کو یہ نہیں چاہیے کہ سب کے سب جہاد میں نکل جائیں، لہٰذا ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جہاد میں جائے؛ تاکہ باقی لوگ دین میں تفقہ حاصل کریں اور جب وہ جہاد میں گئے ہوئے لوگ واپس ہوں، تو ان کو ڈرائیں؛ تاکہ وہ بچیں۔)

اس آیتِ کریمہ میں پہلے ایک اصولی بات فرمائی گئی، وہ یہ کہ اہلِ اسلام سب کے سب جہاد میں نہ نکل جائیں، یہ اس صورت میں حکم ہے، جب کہ امام المسلمین کی

جانب سے نفیر عام نہ ہو اور جہاد، فرض کفایہ رہے جیسے کہ عام حالات میں ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ جہاد اگر چہ بہت بڑی عبادت واہلِ اسلام کی ایک ضرورت ہے؛ مگر اس میں بھی اصول یہ ہے کہ سب کے سب اسی میں نہ لگ جائیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جس طرح جہاد کا شعبہ اہم وضروری ہے، اسی طرح دیگر بہت سے شعبے اہم وضروری ہیں، اگر سب ایک ہی میں لگ جائیں گے، تو دیگر شعبے معطل یا کمزور ہو جائیں گے۔ پھر اسی اصول کے پیشِ نظر یہ حکم دیا گیا کہ جہاد میں سب نہ جائیں؛ بل کہ ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت تو جہاد میں لگے اور باقی لوگ اپنی جگہ دین میں تفقہ اور دین کی سمجھ پیدا کرنے میں لگے رہیں؛ تاکہ جہاد میں جانے والے واپس آئیں، تو ان کو دین کی باتیں سکھائیں۔

مذکورہ آیت کی تفسیر میں تھوڑا اختلاف ہے؛ مگر جمہور مفسرین نے اس آیت کا یہی منشا ومقصود بیان کیا ہے، جو اوپر عرض کیا گیا اور اسی قول کو اس آیت کی تفسیر کے طور پر قبول کیا ہے۔

یہاں صرف اردو والوں کی خاطر مفسرِ قرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ کا حوالہ لکھا جاتا ہے، آپ "معارف القرآن" میں مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں رقم طراز ہیں:

"جہاد کی طرح اسلام اور مسلمانوں کے اجتماعی مسائل اور مہمات بھی ہیں، جو جہاد ہی کی طرح فرضِ کفایہ ہیں؛ ان کے لیے بھی مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو تقسیم کار کے اصول پر کا کرنا ہے؛ اس لیے سب مسلمانوں کو ہر جہاد میں نکلنا نہیں چاہیے......... (آگے چل کر فرماتے ہیں:) اسی فرضِ کفایہ کے سلسلے کا ایک اہم کام "دینی تعلیم" ہے، اس آیت میں خصوصیت کے ساتھ اس کے فرض ہونے کا اس طرح ذکر

فرمایا ہے کہ جہاد جیسے اہم فرض میں بھی اس فرض کو چھوڑنا نہیں، جس کی صورت یہ ہے کہ ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جہاد کے لیے نکلے اور باقی لوگ علمِ دین حاصل کرنے میں لگیں، پھر یہ علمِ دین حاصل کر کے جہاد میں جانے والے مسلمانوں کو اور دوسرے لوگوں کو علمِ دین سکھائیں۔'' (۱)

اسی آیت پر کلام کرتے ہوئے حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا تھانوی رحمہ اللہ نے اپنے ایک وعظ میں فرمایا:

''یعنی جہاد کے لیے سب مسلمانوں کو نہیں جانا چاہیے؛ بل کہ ایک جماعت جائے؛ تا کہ باقی لوگ دین کا علم حاصل کریں۔ شریعت کا حکم تو یہ ہے کہ سارے آدمی ایک ہی طرف نہ جھکیں؛ بل کہ ایک بڑے فرقے میں سے چھوٹی سی جماعت اس کام کے لیے جائے، باقی لوگ فقہِ دین حاصل کریں۔ شریعت تو فقہِ دین کو اصل بتاتی ہے اور دوسرے کاموں کو اس کی فرع قرار دیتی ہے؛ مگر آج کل ہندوستان میں ایک ہوا چلی تھی، جس میں ہر تقریر میں کہا جاتا تھا کہ مدرسوں کو آگ لگادو، خانقاہوں کو بند کردو اور سب کے سب اس تحریک میں شریک ہو کر کام کرو۔ نا معلوم ان کے پاس بہ جز رائے محض کے اس پر کیا دلیل تھی؟ اور یہ رائے تو شریعت اور عقل و تمدن دونوں کے خلاف ہے: شریعت کے خلاف تو اس لیے ہے کہ آیتِ قرآنیہ میں سب کے (جہاد میں) جانے کی ممانعت صریح مذکور ہے اور عقل و تمدن کے خلاف اس لیے ہے کہ اہل تمدن کا قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی مہم کام درپیش ہوتا ہے

(۱) معارف القرآن: ۴/ ۴۸۷-۴۸۸

تو ریل، ڈاک، عدالت، دیوانی وغیرہ سب محکمے برابر چلتے رہتے ہیں اور ایک خاص جماعت امرِ مہم میں لگی رہتی ہے؛ بل کہ ان کا اصول تو یہ ہے کہ جو جماعت امرِ مہم کو سرانجام دینے والی ہے، اس کے سوا دوسرے محکموں کے ملازموں کو اس مہم کی خبر بھی نہیں کرتے؛ تاکہ دوسرے محکموں کے ملازم بے فکر ہو کر اپنے کام میں لگے رہیں۔‘‘(۱)

الحاصل دین کے مختلف شعبوں کے لیے تقسیمِ کار کے اصول پر کام کیا جانا خود قرآن وسنت کے نصوص سے ثابت ہے۔ اس کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ نعرہ لگانا کہ سب کے سب تمام شعبوں کو چھوڑ کر کسی ایک شعبے ہی کو اختیار کریں، عقلاً و شرعاً دونوں لحاظ سے ناقابلِ لحاظ اور دین وشریعت کو کما حقہ نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔

متشابہات کی اتباع

غلو فی الدین کی صورتوں میں اتباعِ متشابہات کی صورت بھی ہے یعنی متشابہ آیات واحکام کے پیچھے پڑنا اور ان کی خواہ مخواہ تاویل کرنا۔

یہاں پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ اسلام میں جو خاص الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جن کا معنی و مراد معلوم و متعین ہے، دوسرے وہ جن کا معنی ہی معلوم نہیں یا ان کی مراد متعین نہیں ہے، پہلی قسم کو ’’محکمات‘‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ان کی مثالوں سے پورا قرآن لبریز ہے اور دوسری قسم کے الفاظ ’’متشابہات‘‘ کہتے ہیں۔

متشابہات کی مثال ایک تو قرآنِ کریم میں حروف مقطعات ہیں: ﴿الٓمٓ، الٓمٓصٓ، الٓرٰ، الٓمٓرٰ، الٓمٓصٓ، حٰمٓ﴾ وغیرہ، جن کے کوئی معنے ہی معلوم نہیں،

---

(۱) خطباتِ حکیم الامت: ۱۳/۱۶۵-۱۶۶

دوسرے وہ الفاظ جس کے معنے تو ہیں؛ مگر مرادِ خداوندی معلوم نہیں، جیسے اللہ کے لیے ہاتھ، آنکھ، پنڈلی، نیز آنے جانے، اترنے اور عرش پر مستوی ہونے آسمان پر ہونے کا ذکر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے معنی تو ہم کو معلوم ہیں؛ مگر اللہ کے لیے جب ان الفاظ کا استعمال ہو، تو اس سے کیا مراد ہوتی ہے؟ یہ ہمیں معلوم نہیں ہے اور یہ بات طے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں ان کے ظاہری معنی مراد نہیں لیے جا سکتے؛ کیوں کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ (اللہ کے جیسی کوئی چیز نہیں) لہٰذا اللہ کے شایانِ شان یہ ظاہری معنی مراد نہیں ہیں۔

متشابہات میں غلو اس طرح کیا جاتا ہے کہ بعض لوگ اسی کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ اس کی کیا مراد اور کیا معنی ہے؟ حال آں کہ نہ قرآن نے اس کا معنی و مراد بتائی اور نہ حدیثِ رسول نے اس کو کھولا ہے اور یہ لوگ عموماً ''آیاتِ محکمات'' سے روگردانی کرتے اور اس پر عمل سے گریز کرتے ہیں، جیسے نماز، روزہ، عورتوں سے پردہ وغیرہ صاف وصریح وواضح احکامات سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ اس طرح اس سلسلے میں غلو کرتے ہیں کہ ''صفات باری'' میں وارد نصوص کو ان کے ظاہری معنی پر محمول کر جاتے ہیں اور ان کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے لیے وہ امور ثابت کرتے ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ بری ومنزہ ہیں اور کچھ لوگ اس کے برعکس ان نصوص کے ظاہری معانی کو اللہ کے حق میں ماننے سے جو استحالہ لازم آتا ہے، اس کے پیشِ نظر ان معانی ہی کا انکار کر جاتے ہیں۔

اس لیے سلفِ صالحین کا اس سلسلے میں مسلک یہ ہے کہ اس پر ایمان لائیں اور اس کے معنے اللہ کے حوالہ کریں اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ متشابہات کے پیچھے نہ پڑیں۔

قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ

هُنَّ أُمُّ الْكِتٰبِ وَ أُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَأَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَاتَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَأْوِيْلِهٖ ، وَ مَا يَعْلَمُ تَأْوِيْلَهٗٓ إِلَّا اللّٰهُ ، وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَ مَا يَذَّكَّرُ إِلَّآ أُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۷﴾

(آل عمران :۷)

(وہی ہے جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی ہے، اس میں محکم آیتیں ہیں اور وہی کتاب کا اصل مدار ہیں اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں، پس وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے، وہ شورش اور خواہ مخواہ کی تاویل کی تلاش میں اس کے اسی حصے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، جو متشابہ ہے، حال آں کہ اس کی تاویل تو سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا اور علم میں رسوخ رکھنے والے لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو اس پر ایمان رکھتے ہیں، وہ سب ہمارے رب کی جانب سے ہے اور نصیحت تو بس عقل والے ہی قبول کرتے ہیں۔)

نیز حدیث شریف میں ہے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

" حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت کریمہ کی تلاوت کی اور فرمایا کہ جب تم ان لوگوں کو دیکھو، جو متشابہ آیات کے پیچھے پڑے ہیں، تو سمجھ لینا کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے؛ لہٰذا ان سے بچ کر رہنا۔"(۱)

(۱) الصحيح للبخاري:۴۵۴۷، الصحيح للمسلم:۶۹۴۶، سنن أبي داود:۴۶۰۰، سنن الترمذي:۲۹۹۴، سنن ابن ماجة:۴۷، مسند أحمد:۲۴۲۵۶

متشابہات کے بارے میں سلف وخلف کا مسلک

ایک زمانے سے اور بالخصوص موجودہ دور میں اس مسئلے میں لوگوں کے مابین بحث ومباحثہ کا ایک سلسلہ چل رہا ہے؛ لہٰذا یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ متشابہات کے بارے میں اہلِ حق سلف صالحین کا مسلک کیا ہے؟

متشابہات کے بارے میں علمائے سلف کا مسلک یہ ہے کہ ان کے معانی پر ایمان رکھا جائے؛ لیکن ان کی کیفیت کو اللہ کے حوالے کیا جائے۔ مثلاً: ''اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہیں'' اس پر ایمان لائے اور یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر اپنی شان کے مطابق مستوی ہیں؛ مگر ایسا نہیں جیسے مخلوق کسی چیز، کرسی وتخت وغیرہ پر بیٹھتی ہے۔

اسی طرح اللہ کے لیے چہرہ، آنکھ، قدم، ہاتھ، پنڈلی، انگلی اور آنا وجانا، اترنا وچڑھنا، اوپر ہونا، ہنسنا، پکڑنا، مٹھی لینا وغیرہ صفات جو قرآن وحدیث میں ثابت ہیں، ان میں یوں عقیدہ وایمان رکھا جائے کہ یہ سب اللہ کے شایانِ شان اس کے لیے ثابت ہیں؛ مگر ہم ان امور کی کیفیت نہیں جانتے اور نہ ان کے پیچھے پڑتے ہیں اور اللہ کے ہاتھ، پیر، آنکھ وغیرہ سے وہ مراد نہیں، جو مخلوق کے لیے سمجھے جاتے ہیں؛ کیوں کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لیس کمثله شيء﴾ (اس کے جیسی کوئی چیز نہیں) لہٰذا اللہ کے ہاتھ، پیر، آنکھ وغیرہ ہیں؛ مگر ہماری طرح نہیں اور ان کی حقیقت وکیفیت ہم نہیں جانتے اور نہ جان سکتے؛ لہٰذا اس کو اللہ کے حوالے کرتے ہیں۔

پس صفاتِ باری کے بارے میں ایک تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن وحدیث میں جو صفات وارد ہوئی ہیں، ان کو ماننا لازم ہے، ان کا انکار کرنا گمراہی ہے، جیسے اگر کوئی کہے کہ ''اللہ کے ہاتھ، پیر، انگلیاں، پنڈلی، چہرہ، آنکھ، وغیرہ نہیں ہیں'' تو یہ صاف

طریقے پر قرآن وسنت کا انکار ہے۔ دوسرے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ سب صفات جو اللہ تعالی کے لیے ثابت ہیں، یہ ہماری طرح کی چیزیں نہیں ہیں؛ بل کہ یہ اللہ کی صفات ہیں اور اسی کے شایانِ شان مراد ہیں، جس کی کیفیت اللہ ہی کے حوالے ہے؛ لہٰذا ان الفاظ سے وہ معنی مراد لینا، جو مخلوق کے حق میں مراد لیے جاتے ہیں، گمراہی ہے۔

امام نووی رَحِمَہُ اللہُ کا حوالہ

امام نووی رَحِمَہُ اللہُ شارحِ مسلم نے شرحِ مسلم میں متعدد جگہ ذکر کیا ہے کہ احادیثِ صفات میں سلف کا مسلک یہ ہے کہ ان کے وہ معانی مراد نہیں، جو ان سے بہ ظاہر سمجھے جاتے ہیں۔

ایک جگہ سلف کا مسلک بیان فرماتے ہوئے کہتے ہیں: " أنه يؤمن بأنها حق على ما يليق بالله تعالى ، وأن ظاهرها المتعارف في حقنا غير مراد." (ان صفات پر اس طرح ایمان رکھا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان حق ہیں اور ان کا وہ ظاہری معنی، جو ہمارے حق میں متعارف ہے وہ مراد نہیں۔)(۱)

ایک دوسرے مقام پر سلف کے مسلک کی توضیح میں لکھتے ہیں: "نؤمن بها ، ولا نتكلم في تأويله ، ولا نعرف معناه ؛ لكن نعتقد أن ظاهرها غير مراد." (ان صفات پر ہم ایمان رکھتے ہیں اور ان کی تاویل میں گفتگو نہیں کرتے اور نہ ہم ان کے معانی کو جانتے ہیں؛ لیکن ہم یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ان کا ظاہری معنی مراد نہیں ہے۔)(۲)

---

(۱) المنهاج شرح مسلم:۱/ ۲۵۸

(۲) المنهاج شرح مسلم:۲/ ۱۲۱

لہٰذا اللہ تعالیٰ کے حق میں ظاہری معنی مراد نہیں لیا جائے گا، ہاں! ان سے اللہ کے شایانِ شان معنی مراد ہے، جو ہم نہیں جانتے اور ان پر ہم یقین و اعتقاد رکھتے ہیں۔

مسلکِ سلف کی تشریح از ابن کثیر رَحِمَہُ اللّٰہُ

امامِ تفسیر و حدیث علامہ ابن کثیر رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اپنی تفسیر میں جمہور سلف کا مسلک اس سلسلے میں یہی بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

" و إنما يسلك في هذا المقام مسلك السلف الصالح : مالك ، و الأوزاعي ، والثوري ، والليث بن سعد ، والشافعي ، وأحمد بن حنبل ، و إسحاق بن راهويه و غيرهم من أئمة المسلمين قديماً و حديثاً ، و هو : إمرارها كما جاء ت من غير تكييف ، و لا تشبيه ، و لا تعطيل. والظاهر المتبادر إلى أذهان المشبهين منفي عن الله ؛ فإن الله لا يشبهه شيء من خلقه : ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ، وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴾ (الشُّورىٰ :١١)؛ بل الأمر كما قال الأئمة: منهم نعيم بن حماد الخزاعي شيخ البخاري : " من شبه اللّٰه بخلقه فقد كفر ، و من جحد ما وصف اللّٰه به نفسه فقد كفر ، و ليس فيما وصف اللّٰه به نفسه ، ولا رسوله تشبيه ". فمن أثبت للّٰه تعالى ما وردت به الآيات الصريحة ، و الأخبار الصحيحة على الوجه الذي يليق بجلال اللّٰه تعالى ، و نفى عن اللّٰه تعالى النقائص ، فقد سلك سبيل الهدى ."

(اس مقام میں تو بس سلفِ صالحین: مالک، اوزاعی، ثوری، لیث بن سعد، شافعی، احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ رحمهم الله وغیرہم ائمہ اسلام کے مسلک پر چلنا چاہیے اور وہ مسلک ان نصوص کو بلا کیف و بلا تشبیہ و بلا تعطیل کے اسی طرح جاری کرنا، جیسا کہ وہ وارد ہوئی ہیں اور جو ظاہری معنی تشبیہ دینے والوں کے ذہن میں آتے ہیں، وہ اللہ سے منفی ہیں؛ کیوں کہ اللہ کی مخلوق میں سے کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں ہو سکتی: ﴿ لَيۡسَ كَمِثۡلِهِۦ شَيۡءٌ ، وَ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡبَصِيۡرُ ﴾ (الشُّوریٰ :۱۱) (اس کے جیسی کوئی چیز نہیں، وہ سننے والا دیکھنے والا ہے)

بل کہ بات وہ ہے جو ائمہ کرام نے فرمایا، جن میں امام بخاری رَحِمَهُ اللهُ کے شیخ نعیم بن حماد رَحِمَهُ اللهُ بھی ہیں کہ جس نے اللہ کو اس کی مخلوق سے تشبیہ دی اس نے کفر کیا اور جس نے ان امور کا انکار کیا، جن سے اللہ تعالیٰ نے خود کو متصف فرمایا ہے، اس نے بھی کفر کیا، اور اللہ و رسول نے جن باتوں سے اللہ کو متصف کیا ہے، اس میں تشبیہ نہیں ہے؛ لہٰذا جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے لیے اس کی جلالت کے لائق وہ چیز ثابت کی جو آیاتِ صریحہ و احادیثِ صحیحہ میں وارد ہے اور ان امور سے اللہ سے نقائص کی نفی کی وہ ہدایت کے راستے پر چل پڑا ہے۔)(۱)

امام ابن کثیر رَحِمَهُ اللهُ کی اس عبارت سے اہلِ سنت کا مسلک یہ معلوم ہوا کہ وہ ان صفاتِ باری کی نفی کرتے ہیں، نہ ان کو مخلوق جیسی مانتے ہیں، اگر ان کی نفی کریں تو بھی گمراہی ہے، جیسے "فرقۂ معطلہ" و "معتزلہ" و "قدریہ" نے کیا اور اگر ان کو مخلوقات کے جیسی مانیں، تو یہ بھی گمراہی ہے، جیسے فرقۂ "مجسمہ" و "مشبہہ" وغیرہ

---

(۱) التفسیر لابن کثیر:۳۲۰/۶

نے کیا؛ بل کہ اہلِ سنت یہ کہتے ہیں کہ یہ ساری چیزیں اللہ کے لیے ثابت ہیں؛ مگر وہ ہم جیسی نہیں ہیں؛ بل کہ اللہ کے شایانِ شان ہیں۔

مسلکِ سلف کی وضاحت از امام ترمذی رحمہ اللہ

امام ترمذی رحمہ اللہ نے مسلکِ اہلِ سنت کی جو تشریح و توضیح متعدد حضرات ائمہ سے نقل کی ہے، وہ بھی سن لیجیے، وہ فرماتے ہیں:

" و قد قال غيرُ واحدٍ من أهل العِلْم في هذا الحديث، وما يُشبِهُ هذا من الرِّوَايات في الصِّفَات ، و نُزُولِ الرَّبِّ تبارک و تعالى كُلَّ ليلةٍ إلى السَّماءِ الدُّنيَا ، قالوا: قد ثَبَتَتِ الرِّوَايَات في هذا ، و يُؤمَنُ بِهَا ، ولا يُتَوَهَّمُ ، ولا يُقَالُ : كيف ؟ هكذا رُوِيَ عن مالكٍ ، و سُفيانَ بنِ عُيَيْنَةَ، و عبدِ اللّٰه بنِ المُبَارَک - رحمهم الله - أنَّهم قَالُوا في هذه الأحاديث : أمِرُّوهَا بِلا كيف. و هكذا قولُ أهل العلم من أهل السُّنَّة ، والجماعَةِ. و أمّا الجَهْمِيّةُ فأنْكَرَتْ هذهِ الرِّوايات ، و قالوا: هذا تَشْبِيهٌ.

و قد ذَكَرَ اللّٰهُ في غير موضع من كتابه : اليَدَ ، وَ السَّمْعَ والبَصَرَ ، فَتأوَّلَتِ الجهمية هذهِ الآياتِ ، فَفسَّرُوهَا على غير ما فَسَّرَ أهلُ العلم ، وقالوا: إنَّ اللّٰهَ لم يَخْلُقْ آدمَ بِيَدِه وقالوا: إنَّ معنىَ اليَدِ ههنا : القُوَّةُ.

و قال إسحاق بن إبراهيم : إنَّمَا يكونُ التَّشْبِيهُ إذَا قالَ: يدٌ كَيَدٍ ، أو مِثْلُ يَدٍ ، و سَمْعٌ كَسَمعٍ ، أو مِثلُ سَمْعٍ ، فإذا

قال : سَمْعٌ كسمع ، أو مثل سمع فهذا تشبيهٌ. و أمَّا إذا قَالَ كما قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: يَدٌ ، و سَمْعٌ ، و بَصَرٌ ، ولا يَقُوْلُ : كيف ، و لا كمسع ، و مثلُ سمعٍ ، فهذا لا يَكُوْنُ تَشْبِيْهاً وهو كما قال تعالى في كتابه : ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾(۱)

(اور بہت سے اہلِ علم نے اس حدیث اور اس جیسی احادیث، جن میں صفاتِ باری اور رب تبارک و تعالیٰ کے ہر رات آسمان دنیا پر نزول کا بیان ہے، ان کے بارے میں کہا ہے کہ یہ احادیث ثابت ہیں اور ان پر ایمان لایا جائے گا اور ان میں کوئی وہم و شک نہیں کیا جائے گا اور یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ کس طرح ہے؟ یہی بات امام مالک، سفیان بن عیینہ اور عبداللہ بن المبارک رحمہم اللہ سے مروی ہے۔ یہ سب حضرات کہتے ہیں کہ ان احادیث کو بلا کیفیت کے جاری کرو۔ یہی اہلِ سنت کے علما کا قول ہے۔ رہے ''جہمیہ'' تو وہ ان احادیث کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تشبیہ ہے'' حال آں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں متعدد مواقع پر ہاتھ، سمع و بصر کا ذکر کیا ہے، پس ''جہمیہ'' نے ان آیات میں تاویل کی اور ان کی تفسیر اہلِ علم کے خلاف کی اور کہا: اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے نہیں پیدا کیا اور کہا کہ ہاتھ سے مراد قوت و طاقت ہے۔

امام اسحاق بن ابراہیم بن راہویہ رحمہ اللہ نے کہا کہ تشبیہ تو اس وقت ہوگی، جب کوئی یوں کہے کہ ''ہاتھ جیسا ہاتھ یا سننا جیسا سننا۔'' لہٰذا کوئی یہ کہے کہ اللہ کے ہاتھ ہمارے جیسے ہیں یا اس کا سننا ہمارے جیسا سننا ہے، تو یہ تشبیہ ہوگی؛ لیکن اگر اسطرح کہے جیسے اللہ نے فرمایا کہ ہاتھ و سمع و بصر ہیں اور کیفیت کا سوال نہ کرے اور

(۱) سنن الترمذي: كتاب الزكاة : باب فضل الصدقة

نہ جیسا ویسا کہے، تو یہ تشبیہ نہیں ہے اور وہ ایسا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ کے جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔)

صفاتِ باری میں امام ابوحنیفہ رَحِمَهُ اللّٰهُ کا مسلک

ہمارے امام ابوحنیفہ رَحِمَهُ اللّٰهُ نے اپنی کتاب " الفقه الأكبر" میں واضح الفاظ میں لکھا:

"وله يد ، و وجه ، و نفس كما ذكره الله تعالى في القرآن ، فما ذكره الله تعالى في القرآن من ذكر الوجه ، واليد ، والنفس فهو له صفات بلا كيف، ولا يُقَالُ: إن يده قدرته أو نعمته لأن فيه إبطال الصفة ، و هو قول أهل القدر ، و الاعتزال."(۱)

(اور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اور چہرہ اور نفس ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں ذکر کیا ہے اور جو اللہ تعالیٰ قرآن میں چہرے و ہاتھ و نفس کا ذکر کیا ہے یہ اللہ کی صفات بلا کیف ہیں اور ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ ہاتھ سے مراد قدرت ہے یا نعمت دینا ہے؛ کیوں کہ اس میں اللہ کی صفت کا باطل کرنا لازم آتا ہے اور یہ "قدریہ" و "معتزلہ" کا قول ہے۔)

اس میں امام اعظم رَحِمَهُ اللّٰهُ نے یہ بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہاتھ و چہرہ و نفس ثابت ہے اور یہ اللہ کی صفات ہیں، انسانی وحیوانی اعضا کی طرح ہاتھ، پیر، ساق، آنکھ وغیرہ اعضا نہیں ہیں اور یہ صفات اللہ کے لیے بلا کیف ثابت ہیں، پھر

---

(۱) الفقه الأكبر:٦٦-٦٧

ایک جگہ یہ کہتے ہیں:

" و صفاته كلها بخلاف صفات المخلوقين ، يعلم لا كعلمنا، و يقدر لا كقدرتنا، و يرى لا كرؤيتنا ، و يسمع لا كسمعنا ، و يتكلم لا ككلامنا ، و نحن نتكلم بالآلات، والحروف ، والله تعالى يتكلم بلا آلة ، و لا حروف ".

(اور اللہ کی تمام صفات مخلوقات کی صفات کی طرح نہیں ہیں، وہ جانتا ہے؛ لیکن ہمارے جاننے کی طرح نہیں ، وہ قدرت رکھتا ہے؛ لیکن ہماری قدرت کی طرح نہیں ،وہ دیکھتا ہے؛لیکن ہمارے دیکھنے کی طرح نہیں، وہ سنتا ہے؛ لیکن ہمارے سننے کی طرح نہیں، وہ کلام کرتا ہے؛ لیکن ہمارے کلام کی طرح نہیں اور ہم کلام کرتے ہیں آلات (جیسے زبان وہونٹ وغیرہ) اور حروف کے ذریعے اور اللہ تعالیٰ کلام کرتا ہے بغیر کسی آلے وحروف کے۔)(۱)

اور یہی تمام علمائے اہلِ سنت کا مسلک ہے، جس کی ترجمانی امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی طرح امام مالک رحمہ اللہ نے بھی فرمائی۔

صفات کے بارے میں امام مالک رحمہ اللہ کا قول

امام مالک رحمہ اللہ کے شاگرد حضرت جعفر بن عبد اللہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ امام مالک رحمہ اللہ کی خدمت میں ایک شخص نے آکر سوال کیا: رحمٰن عرش پر کس طرح مستوی ہوا؟ راوی حضرت جعفر بن عبد اللہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک رحمہ اللہ کو کبھی اس قدر غصے میں نہیں دیکھا جتنا کہ اس

(۱) الفقه الأكبر مع شرحه للقاري:۵۷-۵۸

شخص کے اس کہنے سے آپ کو غصہ آیا، یہاں تک کہ آپ کی رگیں پھول گئیں، کہتے ہیں کہ لوگ کن انکھیوں سے آپ کو دیکھ رہے تھے اور منتظر تھے کہ کیا ہوگا؟ جب غصہ فرو ہوا تو فرمایا:

"الكيف غير معقول، و الاستواء منه غير مجهول، والإيمان به واجب، و السؤال عنه بدعة."

(اس کی کیفیت سمجھ میں آنے والی نہیں اور استوا کا معنی مجہول نہیں اور اس پر ایمان رکھنا واجب ہے اور اس کی کھوج کرنا بدعت ہے۔)

پھر آپ نے فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ تو گمراہ ہو جائے گا، پھر آپ نے اس کو باہر نکالنے کا حکم دے دیا۔(۱)

امام محمد بن جعفر رحمہ اللہ کی لاجواب توضیح

اور اس سلسلے میں حضرت محمد بن جعفر رحمہ اللہ نے بہت واضح بات فرما دی ہے، جس سے ساری پیچیدگیاں دور ہو جاتی ہیں، چناں چہ ان سے جب "استوا علی العرش" کے معنے پوچھے گئے، تو انھوں نے بہت جامع بات کہی، فرمایا:

"من زعم أن اللّٰه استوى على العرش استواء مخلوق على مخلوق فقد كفر، و من اعتقد أن اللّٰه تعالى استوى على العرش استواء خالق على مخلوق فهو مؤمن."

(جس نے یہ عقیدہ اختیار کیا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر اس طرح مستوی ہے جیسے ایک مخلوق دوسرے مخلوق پر بیٹھتی ہے، تو اس نے کفر کیا اور جس نے یہ اعتقاد کیا کہ وہ عرش پر اس طرح مستوی ہے، جیسے خالق مخلوق پر تو

(۱) الاعتقاد للالكائي:۳۹۸/۳

وہ مؤمن ہے۔)(۱)

اب ایک بات یہ بھی سمجھ لی جائے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں دو باتوں کا خیال رکھنا چاہیے: ایک یہ کہ مخلوقات سے تمثیل وتشبیہ لازم نہ آئے اور دوسرے یہ کہ تکییف یعنی کوئی کیفیت ان کی متعین نہ کی جائے۔

مسلک اہلِ سنت کی تشریح از امام قرطبی رحمہ اللہ

یہاں میں امام قرطبی رحمہ اللہ کی کتاب ''الأسنى في شرح أسماء الله الحسنى'' سے ان کے کلام کا خلاصہ اپنے الفاظ میں نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہوں، جو آپ نے اسی سلسلے میں فرمایا ہے۔ وہ یہ ہے:

''صفاتِ باری تعالیٰ کے اثبات کے سلسلے میں دو محذورات سے بچنا لازم ہے: ایک ''تمثیل'' دوسرے ''تکییف''۔ تمثیل کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی صفات کو مخلوقات کی صفات کے مماثل اعتقاد کرے۔ یہ اعتقاد شرعی وعقلی دونوں دلیلوں سے باطل ہے۔ اس کے باطل ہونے کی شرعی دلیل اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات ہیں:

ایک جگہ فرمایا:

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ﴾ (الشورىٰ :١١)

(اس کے جیسی کوئی چیز نہیں۔)

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿ أَفَمَنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ أَفَلاَ تَذَكَّرُوْنَ ﴾ (النحل :١٧)

(کیا پیدا کرنے والا اس کے مانند ہو سکتا ہے، جو پیدا نہیں کر سکتا؟ کیا تم لوگ نصیحت نہیں پکڑتے؟)

---

(۱) الاعتقاد للالکائي:۳/۴۰۲

اور ایک موقعے پر فرمایا:

﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا﴾ (مریم: ۶۵)

(کیا تم اللہ کا کوئی ہم صفت جانتے ہو؟)

نیز ایک اور جگہ کہا:

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ﴾ (الإخلاص: ۴)

(اور اس کا کوئی ہمسر نہیں)

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات مخلوقات کے مشابہ نہیں ہیں اور نہ ہو سکتی ہیں؛ لہٰذا اللہ تعالی کی صفات کا مخلوقات سے مشابہ ومماثل ہونے کا عقیدہ باطل ہے۔

اور اس کی عقلی دلیل بھی کئی طرح سے قائم ہے:

ایک یہ ہے کہ یہ بات یقینی ہے کہ خالق ومخلوق میں ذاتی لحاظ سے جدائی وتبائن ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کی صفات میں بھی تبائن ہو؛ کیوں کہ ہر چیز کی صفت اس کے لائق ہوا کرتی ہے، پس خالق کی صفت اس کے شایانِ شان اور مخلوق کی صفت اس کے حسبِ حال ہونا چاہیے، جیسا کہ خود مختلف قسم کی مخلوقات کی صفات میں بھی یہ بات عیاں ہے، چناں چہ اونٹ کی قوت چیونٹی کی قوت سے جدا ہے، جب خود مخلوقات میں امکان وحدوث میں اشتراک کے باوجود تبائن ہے، تو خالق ومخلوق کے مابین تبائن کا ہونا اور زیادہ ظاہر وواضح ہے۔

دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ جو ہر لحاظ سے کامل ہے، وہ مخلوق کے مشابہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جو ہر لحاظ سے ناقص ونامکمل ہے۔

تیسرے یہ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مخلوقات میں بھی ناموں کے لحاظ سے یکسانیت کے باوجود حقیقت میں نمایاں فرق ہوتا ہے، جیسے ہاتھ: انسان کا ہاتھ ہاتھی کے ہاتھ

سے مختلف ہے اور ہاتھی کو جو قوت ہے، وہ اونٹ کو نہیں ہے، حال آں کہ نام میں اشتراک ہے کہ یہ بھی ہاتھ کہلاتا ہے اور وہ بھی، قوت یہ بھی ہے اور وہ بھی، مگر دونوں کی حقیقت و کیفیت میں بڑا فرق ہے۔ معلوم ہوا کہ صرف نام میں یکسانیت سے حقیقت و کیفیت میں بھی یکسانیت کا ہونا لازم نہیں ہے۔

اور تکییف یہ ہے کہ اللہ کی صفات کو کسی خاص کیفیت سے متصف خیال کرے کہ اللہ کا ہاتھ ایسا اور ایسا ہے، اس کی آنکھیں ایسی اور ایسی ہیں وغیرہ، یہ اعتقاد بھی شرعی و عقلی دلیل سے باطل ہے۔

شرعی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا﴾ (طٰہٰ :۱۱۰)

(اور مخلوقات علم کے لحاظ سے اس کا احاطہ نہیں کرسکتیں)

جب اللہ کا کوئی احاطہ نہیں کرسکتا، تو اس کی صفات کی کیفیت کیسے جان سکتا ہے؟

رہی اس کے بطلان کی عقلی دلیل تو وہ واضح ہے کہ کسی چیز کی کیفیت کا علم اسی وقت ہوتا ہے کہ اس چیز کی ذات کا علم ہو یا کم از کم اس کی نظیر کا علم ہو اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا کوئی علم بندوں کو حاصل ہونا محال ہے اور اللہ کی کوئی نظیر نہیں ہے، تو اس کی صفات کی کیفیت آخر کس طرح وہ جان سکے گا؟ (۱)

امام بیہقی رحمہ اللہ کی زبانی مسلکِ سلف کی وضاحت

امام بیہقی رحمہ اللہ " الاعتقاد والهداية إلى سبيل الرشاد "میں سلفِ صالحین کا اس سلسلے میں مسلک بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" و في الجملة يجب أن يعلم أن استواء اللّٰه سبحانه و

(۱) دیکھو: الأسنی:۱۶۶-۱۶۷

تعالى ليس باعتدال عن اعوجاج ، و لا استقرار في مكان ولا مماسة لشيء من خلقه لكنه مستو على عرشه كما أخبر بلا كيف و بلا أين ، بائن من جميع خلقه ، و أن إتيانه ليس إتيانه من مكان إلى مكان ، وأن مجيئه ليس بحركة ، وأن نزوله ليس بنقلة ، وأن نفسه ليس بجسم ، وأن وجهه ليس بصورة ، و أن يده ليست بجارحة ، و أن عينه ليست بحدقة ، و إنما هذه أوصاف جاء بها التوقيف، فقلنا بها ، و نفينا عنها التكييف ، فقد قال: ﴿ليس كمثله شيء﴾ وقال: ﴿ ولم يكن له كفوا أحد﴾ و قال: ﴿ هل تعلم له سمياً﴾''

(اور خلاصہ یہ ہے کہ یہ جان لینا چاہیے کہ اللہ کے مستوی ہونے کا معنی ٹیڑھ پن سے درستی کے نہیں ہیں اور نہ کسی مکان میں ٹھہرنے کے ہیں اور نہ اپنی مخلوق میں سے کسی سے مس ہونے کے ہیں ؛ بل کہ وہ عرش پر بلا کیف وبغیر مکان کے مستوی ہے، اپنی تمام مخلوقات سے الگ وجدا ہےاوراس کا آنا ایک مکان سے دوسرے مکان کی جانب آنا نہیں اوراس کا آنا کوئی حرکت نہیں رکھتا ہےاوراس کا اترنا ادھر سے ادھر نقل ہونا نہیں ہے اوراس کا نفس کوئی جسم نہیں اوراس کا چہرہ کوئی شکل نہیں اوراس کا ہاتھ کوئی عضو نہیں اوراس کی آنکھ کوئی آنکھ کی پتلی نہیں ؛ بل کہ یہ سب اس کی صفات ہیں جن کے بارے میں نص وارد ہوئی ہے؛ لہٰذا ہم اس کے قائل ہوئے اور کیفیت کی نفی کی ؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا کہ اس کے جیسی کوئی چیز نہیں ، یہ فرمایا کہ اس کے برابر کا کوئی

نہیں اور فرمایا: کیا تم اس کا ہم صفت کسی کو جانتے ہو؟)(۱)

جب مسلکِ سلف متشابہات وصفات باری کے بارے میں معلوم ہو گیا، تو اس سے یہ بات بھی سامنے آ گئی کہ اس بارے میں معتدل راستہ وہ ہے، جس میں نہ تعطیلِ صفات ہو، نہ تشبیہ بالمخلوق ہو؛ بل کہ یہاں تنزیہ بلا کیف ہے؛ لہٰذا ایسے الفاظ وتعبیرات سے بھی بچنا چاہیے، جن سے تعطیل لازم آئے، جس طرح یہ بھی واجب ہے کہ ان عبارات والفاظ سے بھی پرہیز کیا جائے، جن سے تشبیہ کا مفہوم نکلتا ہو۔

متشابہات اور علمائے متأخرین

یہاں اتمامِ فائدے کے لیے یہ ذکر کر دینا بھی مناسب ہے کہ اوپر جو کچھ عرض کیا گیا وہ علمائے سلف کا مسلک ہے، رہے علمائے متأخرین، تو ان میں سے اکثر حضرات نے ایک ضرورت شرعی کی بنا پر ان احادیثِ صفات میں مناسب تاویل کی بھی اجازت دی ہے، جیسے ہاتھ سے اللہ کی قدرت مراد لینا اور آنکھ سے اللہ کی حفاظت مراد لینا وغیرہ۔

امام نووی رَحِمَهُ اللهُ نے لکھا ہے:

" اعلم أن لأهل العلم في أحاديث الصفات قولين: أحدهما : وهو مذهب معظم السلف ، أو كلهم أنه لا يتكلم في معناها ، بل يقولون: يجب علينا أن نؤمن بها ، و نعتقد لها معنى يليق بجلال الله تعالى ، و عظمته مع اعتقادنا الجازم أن الله تعالى ليس كمثله شيء و أنه منزه عن التجسم ، والانتقال ، والتحيز في جهة ، وعن سائر صفات المخلوقين ، و هذا القول هو مذهب جماعة من المتكلمين،

(۱) الاعتقاد و الهداية:۱۱۷-۱۱۸

واختاره جماعة من محققيهم ، وهو أسلم . والقول الثاني: وهو مذهب معظم المتكلمين : أنها تتأول على ما يليق بها على حسب مواقعها.''(۱)

(جان لینا چاہیے کہ احادیثِ صفات کے بارے میں اہلِ علم کے دو قول ہیں: ان میں سے ایک جو اکثر سلف؛ بل کہ تمام ہی سلف کا مذہب ہے، یہ ہے کہ ان صفات کے معنے میں کلام نہیں کیا جائے گا؛ بل کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم پر واجب ہے کہ ہم ان صفات پر ایمان لائیں اور ان کے ایک ایسے معنے پر عقیدہ رکھیں، جو اللہ تعالیٰ کی جلالت وعظمت کے شایانِ شان ہے،اس یقین کے ساتھ ساتھ کہ اللہ تعالیٰ کے مانند کوئی چیز نہیں اور وہ جسم ہونے اور کسی جہت میں اپنی جگہ بنانے سے اور تمام مخلوقات کی صفات سے منزہ ہے۔یہی قول متکلمین کی ایک جماعت کا ہے اور اسی کو ان کے محققین کی ایک جماعت نے پسند کیا ہے اور یہی سلامتی والا قول ہے اور دوسرا قول جو کہ اکثر متکلمین کا مذہب ہے، یہ ہے کہ ان صفات کی حسبِ موقعہ مناسب ولائق تاویل کی جاسکتی ہے۔)

اس میں امام نووی رَحِمَہُ اللہُ نے سلف کے مسلک کے بعد اکثر متکلمین حضرات کا قول یہ ذکر کیا ہے کہ کوئی مناسب تاویل کی جاسکتی ہے۔

ملا علی قاری رَحِمَہُ اللہُ نے ''جمع الوسائل شرح شمائل'' میں لکھا ہے:

''و فيها المذهبان المشهوران : التأويل إجمالا ، وهو تنزيه الله تعالى عن ظواهرها ، و تفويض التفصيل إليه سبحانه و تعالى ، وهو مذهب أكثر السلف ، والتأويل

(۱) المنهاج شرح مسلم:۱/۱۰۰

تفصيلا، وهو مختار أكثر الخلف."(۱)

(صفات کے بارے میں دو مشہور مذہب ہیں: ایک اجمالاً تاویل کرنا اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے ظاہری معنے سے منزہ قرار دینا اور تفصیلی تاویل کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کرنا اور یہی اکثر سلف کا مذہب ہے اور دوسرا تفصیلی تاویل کرنا اور یہی اکثر خلف کا مسلک ہے۔)

ملا علی قاری رَحِمَهُ اللهُ کی اس عبارت سے اور امام نووی رَحِمَهُ اللهُ کی پیش کردہ اوپر کی ایک عبارت سے ایک بات واضح ہوتی ہے، وہ کہ صفات کے بارے میں سلف و خلف دونوں ایک بات پر متفق ہیں، وہ یہ کہ ان صفات باری میں وارد احادیث کے وہ معنے اللہ کے حق میں مراد نہیں، جو بہ ظاہر سمجھے جاتے ہیں یا جو مخلوق کے حق میں سمجھے جاتے ہیں؛ لہٰذا تمام سلف و خلف ان میں تاویل کے قائل ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ سلف اجمالی تاویل کے اور خلف تفصیلی تاویل کے قائل ہیں۔ اجمالی تاویل کا حاصل یہ ہے کہ چوں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ان صفات کا وہ معنی مراد نہیں لیا جا سکتا، جو مخلوق کے لیے لیا اور سمجھا جاتا ہے؛ اس لیے ان سے مراد وہ معانی نہیں ہیں، جو بہ ظاہر ان سے سمجھے جاتے ہیں؛ بل کہ مراد اللہ کے شایانِ شان ان کے معانی ہیں، جو ہم نہیں جانتے اور تفصیلی تاویل کا مطلب یہ ہے کہ ان صفات میں سے ایک ایک صفت کی کوئی مناسب تاویل سے کر لی جائے، جیسے آنکھ سے مراد حفاظت، ہاتھ سے مراد قدرت، استوا علی العرش سے مراد استیلا وغیرہ؛ لہٰذا اس سے یہ واضح ہوا کہ ان صفات کے ظاہری معنی جو مخلوق کے لیے سمجھے جاتے ہیں، وہ کسی کے نزدیک مراد نہیں؛ اس لیے سب ہی حضرات اجمالی تاویل کرتے ہیں اور خلف تفصیلی تاویل کے قائل ہیں۔

---

(۱) جمع الوسائل: ۲۶۵

مگر اسلم واحوط سلف کا مسلک ہے، جمہور حضراتِ علما نے اسی کو پسند واختیار کیا ہے۔

متشابہات میں غلو کا سلسلہ

اس تشریح کے بعد عرض ہے کہ موجودہ دور میں بھی متشابہات میں غلو کرنے والے کئی طرح سے غلو کرتے ہیں:

ان میں سے ایک یہ ہے کہ جاہل پیروں و باطل صوفیوں میں معرفت و حقیقت کے نام سے متشابہات میں من مانی تاویلیں تراشی جاتی ہیں اور اس کا نام معرفت رکھا جاتا ہے۔ جیسے کوئی حروفِ مقطعات کے عجیب عجیب معنے بیان کرتا ہے، کوئی (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کی صورت اپنے پیروں کے مشابہ قرار دیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ جسے خدا کو دیکھنا ہو، تو وہ پیر صاحب کو دیکھ لے۔ ظاہر ہے کہ یہ انتہائی سخت اور گستاخی کی بات ہے۔

ایک غلطی بہت عام ہے کہ اللہ کی صفات میں تشبیہ سے پرہیز کرتے کرتے نفی و تعطیل کا رنگ اختیار کر لیا جاتا ہے، مثلاً عموماً اس طرح تعلیم دی جاتی ہے: ''اللہ تعالیٰ کے نہ ہاتھ ہے، نہ پیر، نہ کوئی اور عضو اور نہ کوئی صورت وشکل؛ بل کہ وہ نور ہی نور ہے'' ان جملوں سے مقصود تو تشبیہ بالمخلوق سے بچنا و بچانا ہے؛ مگر ان الفاظ و عبارات سے تعطیل و نفی کا شبہ پیدا ہوتا ہے اور بچوں کو اس کی تعلیم دیتے ہوئے ان کی ذہن سازی بھی کچھ اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ ان صفاتِ باری کے بارے میں مسلکِ سلف (جو اوپر پیش کیا گیا) کے بہ جائے ''معتزلہ'' و ''معطلہ'' کے مشابہ عقیدہ رکھنے ہی کو سلف کا مسلک سمجھ جاتے ہیں۔

اسی طرح یہ عقیدہ پڑھایا جاتا ہے: ''اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہیں'' یہ بات اپنی جگہ

صحیح بھی ہے اور قرآن کی آیت: ﴿ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ ﴾ (جہاں کہیں بھی تم رہو وہ تمھارے ساتھ ہے) (الحدید: ۴) سے ماخوذ بھی ہے؛ مگر اس کا معنے سلف کے مسلک کے مطابق یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے لحاظ سے ہر جگہ ہیں؛ بل کہ مراد یہ ہے کہ وہ اپنے علم وقدرت کے لحاظ سے ہر جگہ موجود ہیں۔ باقی ذات کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہیں؛ مگر بلا کیف و بلا مکان و بلا جہت جیسا کہ تفصیل گزر گئی۔

اسی لیے امام اعظم رحمہ اللہ سے جب ایک عورت نے پوچھا تھا کہ اللہ کہاں ہے؟ تو آپ نے اس پر ایک کتاب لکھی اور اس میں ثابت کیا کہ اللہ تعالیٰ آسمان پر ہے، زمین پر نہیں، جب ایک شخص نے اس پر سوال کیا کہ پھر اس کا کیا معنی کہ اللہ تعالی نے فرمایا: ﴿ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ ﴾ تو فرمایا کہ وہ ایسا ہے، جیسے تو کسی کو خط لکھتا ہے کہ میں تیرے ساتھ ہوں، حال آں کہ تو اس سے غائب ہوتا ہے۔ (۱)

امام مالک رحمہ اللہ نے کہا: اللہ آسمان پر ہے اور اس کا علم ہر جگہ میں ہے، جس سے کوئی جگہ خالی نہیں۔ (۲)

امام ابن عبد البر مالکی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صحابہ وتابعین حضرات علما، جن سے علم حاصل کیا جاتا ہے، انھوں نے آیتِ استوا کے معنی میں فرمایا: اللہ تو عرش پر ہے، اس کا علم ہر جگہ ہے اور اس میں کسی ایسے شخص نے اختلاف نہیں کیا، جس کے قول سے حجت لی جاتی ہے۔ (۳)

الغرض صفات کی تعلیم میں اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ نہ تعطیل ہو، نہ تشبیہ

---

(۱) كتاب العرش للذهبي: ۲/۱۷۰، كتاب العلو للذهبي: ۱۳۴

(۲) إثبات العلو لابن قدامة: ۱۱۵

(۳) التمهيد: ۷/۱۳۸-۱۳۹

لازم آئے؛ لہٰذا اس طرح تعلیم دینا چاہیے جیسے امام ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللّٰہُ کی عبارت میں اور دیگر سلف کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اللہ کے ہاتھ و چہرہ و نفس وغیرہ ہیں؛ لیکن ہمارے اعضا کی طرح نہیں؛ بل کہ اللہ کے شایانِ شان ہیں۔

ایک غلطی کا فرقۂ ظاہریہ ارتکاب کرتا ہے اور بہت سے حنابلہ نے بھی یہی غلطی کی اور کرتے ہیں، وہ یہ کہ تعطیل و نفی سے بچنے کے لیے ایسا اہتمام بلیغ کرتے ہیں کہ ان کا مسلک تشبیہ و تجسیم کے قریب ہو جاتا ہے اور مجسمہ و مشبہہ کے نظریات سے ملتا جلتا معلوم ہوتا ہے۔

ایسے لوگوں پر علمائے اہلِ سنت نے خوب خوب رد کیا ہے، چناں چہ امام ابن الجوزی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اپنے رسالے "دفع شبهة التشبيه" میں ان کا رد لکھا ہے؛ نیز علامہ تقی الدین ابو بکر الدمشقی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے "دفع شبه من شبه و تمرد" میں ان پر کھل کر کلام کیا ہے۔

علامہ ابن الجوزی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے شیخ الحنابلہ حسن بن حامد الوراق رَحِمَہُ اللّٰہُ ، قاضی ابو یعلی الحنبلی رَحِمَہُ اللّٰہُ اور شیخ علامہ ابو الحسن ابن الزاغونی رَحِمَہُ اللّٰہُ کے بارے میں لکھا ہے:

> "انھوں نے عقائد پر ایسی کتابیں لکھیں، جن سے مذہب (حنابلہ) کی شان ہی گھٹ گئی، میں نے ان لوگوں کو دیکھا کہ یہ عوام کی سطح پر اتر گئے اور صفاتِ باری کو محسوسات کے تقاضوں پر ڈھال گئے، پس انھوں نے یہ سنا کہ "اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم عَلَیْہِ السَّلَامُ کو اپنی صورت پر پیدا کیا" تو اللہ کے لیے ذات سے زائد صورت و شکل، چہرہ، دو آنکھیں، منہ، حلق کا گوشت، داڑھیں، چہرے کی رونق، جو کہ "سبحات" کہلاتی ہے اور دو ہاتھ اور انگلیاں، ہتھیلی، کن انگلی، سینہ، ران

، دو پنڈلیاں اور دو پیر ثابت کر بیٹھے۔‘‘(۱)

اسی طرح اہلِ حدیث عالم جناب نواب وحید الزماں صاحب نے لکھا ہے:

’’و مكانه العرش ، وقول المتكملين :أنه ليس في جهة ، ولا مكان باطل بالشرع ، والعقل إذ كل موجود يبغي مكاناً .‘‘(۲)

(اللہ کا مکان عرش ہے اور علمائے متکلمین کا یہ کہنا کہ اللہ کسی جہت میں نہیں ہے اور نہ کسی مکان میں ، یہ از روئے شرع و عقل باطل ہے ؛ کیوں کہ ہر موجود مکان چاہتا ہے۔)

قرآن و سنت میں اللہ کے لیے عرش کا اثبات اور اس پر اس کے مستوی ہونے کی بات تو آئی ہے ؛ مگر اس کو اللہ کے لیے مکان و جگہ پھر اس کو ہر موجود پر قیاس کرتے ہوئے مکان کا محتاج قرار دینا، سخت اور فاحش قسم کی غلطی ہے اور مسلکِ سلف سے ہٹ کر تجسیم و تشبیہ کی راہ اختیار کرنے کے مترادف ہے۔

اسی طرح موصوف نے اپنے ’’ترجمۂ قرآن‘‘ کے حاشیہ ﴿ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ ﴾ پر لکھا ہے:

’’جب کرسی پر بیٹھتا ہے، تو چار انگل کے برابر بھی بڑی نہیں رہتی اور اس کے بوجھ سے چر چر کرتی ہے۔‘‘(۳)

اللہ تعالیٰ کے لیے یہ الفاظ اولاً تو نہ قرآن میں آئے ہیں اور نہ حدیثِ رسول میں؛ لہٰذا اپنی جانب سے ان کا استعمال کرنا ہی محلِ نظر ہے، دوسرے یہ کہنا کہ ’’چار

---

(۱) دفع شبه التشبيه:۷-۸

(۲) هدية المهدي:۱/۹، نزل الأبرار:۱/۳

(۳) قرآن مترجم و محشیٰ:۶۰، بہ حوالہ فرقۂ اہلِ حدیث ہند و پاک از مولانا الیاس گھمن:۱۱۷-۱۱۸

انگل کے برابر بڑی نہیں رہتی'' اور یہ کہنا کہ ''اللہ کے بوجھ سے چر چر کرتی ہے'' کس قدر مخلوق سے تشبیہ وتمثیل کی راہ ہے، جو سلف سے ہٹی ہوئی ہے!! حال آں کہ عرش کو اللہ کا مکان کہنا اور اللہ سے عرش کے پُر ہونے کا قول اور اللہ کے لیے جہت ماننا ''مشبہہ'' کا قول وعقیدہ ہے، جیسا کہ امام ابن ابی شیبہ رَحِمَہُ اللّٰہُ نے '' العرش و ما روي فيه '' میں ذکر کیا ہے۔(۱)

الغرض متشابہات وصفاتِ باری کے اندر متعدد طرح کے غلو ہوتے ہیں، جن سے بچنا لازم وضروری ہے۔

متشابہات کے پیچھے پڑنے والے کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تنبیہ

اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے کے ایک شخص صبیغ بن عسل نامی کو سخت سزا دی تھی کہ وہ متشابہات میں کلام کرتا تھا۔

روایت ہے کہ وہ شخص مدینہ آیا اور قرآن کے متشابہات کے بارے میں سوال وجواب کرنے لگا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب معلوم ہوا، تو اس کو بلوایا اور پہلے سے کھجور کی چند ٹہنیاں منگوا رکھی تھیں، جب وہ آیا تو آپ نے اس سے پوچھا کہ تو کون ہے؟ اس نے کہا کہ میں اللہ کا بندہ صبیغ ہوں، آپ نے فرمایا کہ میں اللہ کا بندہ عمر ہوں، پھر آپ نے اس سے کہا کہ اپنا سر کھول، پھر اس کے سر پر ان ٹہنیوں سے مارنا شروع کیا، یہاں تک کہ اس کا سر زخمی ہو کر خون بہنے لگا۔ اس نے کہا کہ اے امیر المؤمنین! کافی ہے! جو کچھ دماغ میں میرے سمایا تھا سب چلا گیا۔(۲)

اور بعض روایات میں ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی پٹائی کی، تو اس کو

---

(۱) دیکھو: العرش:۹/۱۷۹-۱۸۰

(۲) اعتقاد أهل السنة للإمام لالكائي:۴/۶۳۶، الشريعة للآجري:۱/۱۷

اپنے وطن ''بصرہ'' جانے کی اجازت دی اور حضرت ابوموسیٰ اشعری ﷜ کو لکھا کہ کوئی مسلمان اس کے ساتھ مجالست ومیل جول نہ رکھے۔ پس اس کا حال وہاں ایسا تھا، جیسے خارش والے اونٹ کا ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی حلقے میں جاتا، تو لوگ خارشی اونٹ کی طرح اس سے ڈر کر وہاں سے اٹھ جاتے اور اگر اس سے ناواقف لوگ ہوتے، تو دوسرے لوگ ان سے کہتے کہ حضرت عمر ﷜ نے اس سے ملنے سے منع کر دیا ہے۔ یہ سن کر لوگ متفرق ہو جاتے، جب اس کا حال درست ہو گیا اور اس نے توبہ کی، تو حضرت ابوموسیٰ ﷜ نے حضرت عمر ﷜ کو لکھا کہ اس کا حال درست ہو گیا ہے، تب حضرت عمر ﷜ نے لوگوں کو اس سے میل جول کرنے کی اجازت دی۔(۱)

اصطلاحاتِ شرعیہ کے مفہوم میں تبدیلی یا کمی وزیادتی

ایک صورت دین میں غلو وحد سے تجاوز کی یہ بھی ہے کہ اصطلاحاتِ شرعیہ کے مفاہیم ومصادیق میں اپنی جانب سے کوئی تبدیلی یا تغیر کر دیا جائے یا اس میں کوئی کمی یا زیادتی کر دی جائے۔ چناں چہ متعدد طبقوں وفرقوں نے اس شکل سے بھی دین میں غلو کیا اور راہِ راست سے منحرف ہوتے چلے گئے، اگر چہ کہ یہ انحراف خود بھی مختلف حیثیات کا ہے، کوئی بہت شدید ہے، کوئی بہت خفیف ہے، کوئی درمیانی درجے کا ہے اور ہم نے اوپر متشابہات میں تغیر وتاویل کے ذریعے غلو کا ذکر کر دیا ہے۔

اور ''محکمات'' میں غلو کی دو صورتیں ہیں: کبھی تو یہ کہ ان کے معنے ومراد میں تغیر وتبدیلی کر دی جاتی ہے اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ اس کے معنے میں کمی وزیادتی کر دی جاتی ہیں۔

---

(۱) ذم التأويل لابن قدامة المقدسي:۱۲، اعتقاد أهل السنة:۶۳۶/۴، الاعتصام: ۵۵/۲، عقيدة السلف للصابوني:۱۹

پہلی صورت: مفہوم میں تبدیلی

پہلی صورت یہ ہے کہ شرعی اصطلاح میں تغیر وتبدیلی کردی جائے اور یہ بہت ہی شدید وخطرناک اور نہایت قبیح بات ہے۔ چناں چہ گزشتہ دوروں میں اس راہ سے بھی بعض قوموں میں گمراہی آئی کہ دینی وشرعی اصطلاح کو اپنی جانب سے دوسرے معنے دے دیے گئے، جن میں سے ہم یہاں بعض کا ذکر کرتے ہیں۔

عیسائیوں نے توحید کو ''تثلیث'' کردیا

اس کی مثال ایک نہایت اہم ومعروف اصطلاح ''توحید'' سے دی جاسکتی ہے، جس میں عیسائیوں نے ''تثلیث'' کا مفہوم داخل کیا اور توحید کے راستے سے ہٹ کر شرک وکفر کے راستے پر پڑ گئے۔

عیسائی علما نے عیسائی مذہب کے اس ''عقیدۂ توحید'' یا ''تثلیث'' کی تشریح کرتے ہوئے جو کہا ہے، وہ یہ ہے کہ خدا تین ''اقنوم'' سے مرکب ہے: ایک باپ، دوسرا بیٹا اور تیسرا روح القدس۔ یہ تین مل کر ایک ''خدائی وحدت'' تیار کرتے ہیں، جو اپنی ماہیت وحقیقت کے اعتبار سے نا قابلِ تقسیم ہے، اسی وجہ سے وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ تین خدا نہیں؛ بل کہ سب مل کر ایک خدا ہے۔(۱)

ظاہر ہے کہ توحید ایک خدا کے ماننے کا نام ہے، تین خداؤں کا ماننا کسی طور پر بھی توحید نہیں؛ بل کہ خالص شرک ہے، اس کے باوجود ان عیسائیوں نے اس شرک کو ''توحید'' کا نام دے دیا، جس کا رد قرآن میں فرمایا گیا ہے جیسا کہ اوپر گزرا۔

اسی طرح ایک اصطلاح قدیم شریعتوں میں ''اب'' اور ''ابن'' کی اللہ تعالیٰ کے لیے اور مخصوص ومقرب بندوں کے لیے استعمال کی جاتی تھی اور اس سے مراد

(۱) دیکھو: مقدمۂ بائبل سے قرآن تک: ۱/۴۵

محض ایک تعلق خاص تھا کہ فلاں اللہ کا بیٹا ہے اور اللہ اس کا باپ ہے یعنی اس کو اللہ سے ایک خصوصی تعلق ہے؛ مگر ان الفاظ کو ان میں سے بعض لوگوں نے حقیقی بیٹا اور حقیقی باپ کے معنے میں استعمال کر کے راہِ ہدایت چھوڑ دی اور حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السَّلام کو حقیقی بیٹا اللہ کا ماننے لگے۔

فرقۂ باطنیہ نے تمام شرعی اصطلاحات کو بدل دیا

ان ہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے فرقۂ باطنیہ نے کئی قدم ان سے پیش قدمی کردی اور پوری شریعتِ اسلامیہ کو اپنی باطل تاویلات سے ایک کھیل و مذاق بنا دیا اور شرعی اصطلاحات کو از اول تا آخر من مانی ونفسانی معانی پہنا دئے، یہاں تک کہ ''جنابت'' کے معنی راز فاش کرنا، غسل کے معنی تجدید بیعت کرنا، طہارت کے معنی اپنے امام کے علاوہ کسی اور پر اعتقاد سے بری ہو جانا، روزے کے معنی راز فاش کرنے سے رک جانا، نماز کے معنی دعا کرنا، یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کے لیے لوگوں کو بلانا وغیرہ، سینکڑوں شرعی اصطلاحات کے شرعی مفاہیم کو بدل ڈالا، اسی طرح شراب وزنا وغیرہ محرمات کا جو مفہوم تھا اس کو بھی بدل ڈالا، مثلاً شراب وزنا سے (نعوذ باللہ) حضرت ابو بکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہما کو مراد لیا اور یہ کہا کہ قرآن وحدیث میں جو شراب وزنا سے بچنے کا حکم ہے، اس سے مراد ان لوگوں کی بیعت کرنے سے بچنا ہے، باقی وہ شراب وزنا جس کو لوگ حرام سمجھتے ہیں، یہ حرام نہیں؛ کیوں کہ اللہ نے خود کہا ہے کہ اللہ کی پیدا کردہ زینت کو کس نے حرام کیا؟ لہٰذا یہ جائز ہے، اس طرح ان الفاظ کو من گھڑت معانی پہنا دیے اور اباحیت پسندی کی راہ کھول دی اور سارے محرمات کو حلال کر دیا اور اس طرح خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔

نوٹ: اس کی کچھ تفصیلات دیکھنا ہو، تو امام غزالی رَحِمَہُ اللہُ کی کتاب

"فضائح الباطنية" اور علامہ فقیہ محمد بن مالک یمنی رحمہ اللہ کی کتاب "کشف أسرار الباطنية" ملاحظہ کریں۔

بطال صوفیا کی تحریفات

اس کی ایک اور مثال یہ دی جا سکتی ہے، جو بطال و غالی صوفیا کی جانب سے "تصوف وسلوک" کی راہ میں پیش آئی تھی، وہ یہ کہ انھوں نے "تصوف وسلوک" کی اصطلاحات کو جن میں سے بعض قرآنی و حدیثی ہیں اور بعض حضراتِ اکابر کی وضع کردہ ہیں، ان کو نہایت بے دردی کے ساتھ ان کے اصلی معانی سے ہٹا کر غیر شرعی معنی پہنا دیے تھے، حتی کہ آج وہی غیر شرعی معنی لوگوں میں معروف ہو گئے۔ ان لوگوں کے نزدیک "تصوف" چند بے حقیقت رسموں، خلافِ دین بدعات ولغویات، عرس و فاتحہ، سماع و رقص و قوالی کا نام تھا؛ لہٰذا یہ لوگ شخصیات کے پردے میں دین بے زاری و بے راہ روی کا بازار گرم کرنے، "حقیقت و معرفت" کے نام سے لوگوں کو خلافِ دین باتوں کی تعلیم دینے، اسی طرح "ہمہ اوست" کی صوفیانہ اصطلاح کو کافرانہ و مشرکانہ مفہوم دے کر لوگوں میں رائج کرنے اور (نعوذ باللہ) ہر چیز کو خدا قرار دینے لگے اور "وحدة الوجود" و "وحدة الشهود" کی عوام کے لیے ناقابلِ فہم تعبیرات کی آڑ میں دین و شریعت سے شوخی و بے باکی؛ بل کہ کفر کا کاروبار کرنے لگے۔

اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ بعض نے حقیقت و طریقت اور معرفت وغیرہ الفاظ کو غلط معنی پہنا کر "اباحیت پسندی" کی طرح ڈال دی، یہاں تک کہ زنا و شراب جیسی لعنتیں بھی جائز کر لیں اور عورتوں سے بے پردگی و آزادانہ اختلاط بھی کرنے لگے، اسی طرح مخلوق میں اللہ کے حلول کا عقیدہ گھڑ کر عوام الناس کو توحید سے دور کر دیا اور

ان الفاظ کے پردے میں دین وشریعت سے لوگوں کو ہٹا کر گمراہی کے راستے پر ڈالتے چلے گئے، یہاں تک کہ نماز و روزہ، حج وزکوۃ جیسی اسلامی عبادات وفرائض کو اٹھا دیا اور ان کے مفاہیم بدل دئے اور آج بھی یہ فرقہ اسی طرح اپنے گمراہ عقائد و نظریات کو پھیلانے میں مشغول ہے۔

اس کو مذاق کہا جائے یا کچھ اور نام اس کو دیا جائے، یہ حقیقت ہے کہ ''تصوف'' جس کو قرآن میں ''تزکیے'' سے اور حدیث میں ''احسان'' سے تعبیر کیا گیا ہے، وہ مذکورہ بالا امور کا نام نہیں اور قطعاً نہیں؛ بل کہ وہ کچھ اور ہے اور یہ کچھ اور؛ مگر اس کو کیا کہیے گا کہ آج ''تصوف'' کا نام لوگ سنتے ہیں، تو ان ہی امور کی جانب ان کا ذہن متبادر ہوتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رَحِمَہُ اللہُ کے مکتوبات میں اس گروہ کے سلسلے میں اس کی ان غلو آمیز گمراہیوں کے بارے میں بہت تفصیل سے جگہ جگہ گفتگو کی گئی ہے، وہاں دیکھنا چاہیے۔

الغرض شرعی اصطلاحات میں شریعت کے بتائے ہوئے معنے کے بہ جائے اپنے من مانی معانی لگانے لگے اور اس طرح گمراہ ہو گئے۔

منکرینِ حدیث کا اصطلاحاتِ شرعیہ سے کھلواڑ

اسی طرح منکرینِ حدیث جو خود کو ''اہلِ قرآن'' کہتے ہیں، انھوں نے جب حدیث کا انکار کر دیا اور اس کی حجیت کو ٹھکرا دیا، تو ان کے لیے بڑی پریشانی یہ تھی کہ قرآنِ کریم جس کو ماننے کا وہ دعویٰ کرتے ہیں (اگر چہ کہ حدیث وصاحبِ حدیث کے انکار کے بعد یہ دعویٰ انتہائی مضحکہ خیز بھی ہے اور خود ان کے دعوی ''عمل بالقرآن'' کے بھی خلاف ہے) اس میں جو اصطلاحاتِ اسلامیہ استعمال کیے گئے

ہیں، وہ ان کی راہ میں ''سدِ سکندری'' بنتے جارہے تھے؛ لہٰذا انھوں نے اپنے مفاد کی خاطر ان ساری اسلامی اصطلاحوں کو من گھڑت معانی پہنا دیے، مثلاً قرآن میں اللہ و رسول کی اطاعت کا حکم ہے ، اس کو ان لوگوں نے مرکزِ ملت (Central Authority) کی اطاعت کے معنی دے دیے اور ''اولوالامر'' کی اطاعت سے حکومت کے ماتحت افسران کی اطاعت مراد لے لی اور کہا کہ آخرت سے مراد اپنے مستقبل کی فکر ہے اور جنت و دوزخ سے انسانی کیفیات مراد ہیں اور کہنے لگے کہ ''صلاۃ'' سے مراد یہ نماز نہیں ہے؛ بل کہ قرآنی نظام کو معاشرے میں رواج دینے کا نام ہے، ''زکاۃ'' سے مراد حکومت کو دیا جانے والا ٹیکس ہے، حج کوئی عبادت کا طریقہ نہیں؛ بل کہ ایک عالمی اجتماع ہے، جس کا مقصد امت کے اجتماعی امور کے بارے میں غور و خوض اور ان کے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے اور قربانی اسی اجتماع کے لیے جمع ہونے والوں کی دعوت و ضیافت سے تعبیر ہے۔

نوٹ: ان منکرینِ حدیث کے ان نظریات کی تفصیل مع حوالجات کے لیے دیکھیے: ''فتنۂ انکارِ حدیث'' از حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی، مفتی جامعۃ العلوم بنوریہ، کراچی۔

اور لیجیے! سر سید احمد خان نے جن و ملائک کی تفسیر اچھی بری قوتوں سے کر دی اور جن و ملائک کے حقیقی وجود سے انکار کر دیا؛ جبریل کی تفسیر ملکۂ نبوت سے کر دی، آسمان کی تفسیر ''دخان'' سے کر دی وغیرہ۔

اسی طرح ان منکرینِ حدیث کا کہنا ہے کہ نمازیں صرف دو ہیں، باقی سب نوافل ہیں۔(۱)

غلام احمد پرویز کہتا ہے کہ قربانی کا کوئی ثبوت نہیں، حج میں قربانی کا مقصد حج

(۱) طلوع اسلام: جون ۱۹۵۰ء

میں شرکت کرنے والوں کے خورد ونوش کا انتظام ہے اور اس کے علاوہ جو قربانی ہوتی ہے، اس میں عید کے دن دس کروڑ روپئے کا قومی سرمایہ ضائع ہوتا ہے۔(۱)

بعض کہتے ہیں کہ صرف مردار، بہتا خون، خنزیر اور غیر اللہ کے نام کی طرف منسوب چیزیں حرام ہیں، ان کے علاوہ کچھ حرام نہیں؛ بل کہ محمد صبیح اڈوکیٹ لکھتا ہے کہ مذکورہ چار چیزوں کے علاوہ باقی چیزوں کا کھانا فرض ہے۔(۲)

نیز یہ لوگ معجزات وکرامات کا انکار کرتے ہیں، عذابِ قبر کا انکار کرتے ہیں اور جنت و دوزخ کے بارے میں مختلف الخیال ہیں۔ کوئی ان کو موجود کہتا ہے اور کوئی یہ کہتا ہے کہ فی الحال یہ موجود نہیں اور کوئی کہتا ہے کہ یہ تمثیلی چیزیں ہیں اور کوئی ان کو روحانی چیزیں کہتا ہے۔

مرزا قادیانی اور قادیانیوں کی ''ختم نبوت'' میں تحریف

اس کی ایک مثال قادیانیوں اور ان کے جھوٹے نبی مرزا غلام احمد قادیانی کا آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن میں آئے ہوئے لفظ ﴿خاتم النبیین﴾ کے معنے میں تحریف وتبدیلی کرنا ہے کہ ساری امت اس کا معنی یہ کرتی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں اور آپ نبیوں کے سلسلے کی آخری کڑی ہیں اور آپ کے بعد کوئی نیا نبی آنے والا نہیں؛ مگر یہ مرزا غلام احمد اور قادیانی لوگ ساری امت کے اجماع کے خلاف ﴿خاتم النبیین﴾ کا معنی یہ کرتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بعد آنے والے نبیوں کی مہر ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بعد آنے والے نبیوں کو مہر لگا کر بھیجیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ معنی قرآن کی ''معنوی تحریف'' ہے۔

---

(۱) قرآنی فیصلے:

(۲) طلوع اسلام: جون ۱۹۵۲ء

یہ لیجیے! مرزا غلام احمد کہتا ہے:

''جس کامل انسان پر قرآن شریف نازل ہوا...............اور وہ خاتم الانبیا بنے ؛مگر ان معنوں سے نہیں کہ آئندہ اس سے کوئی روحانی فیض نہیں ملے گا ؛ بل کہ ان معنوں سے کہ وہ صاحبِ خاتم ہے، بہ جز اس کی مہر کے کوئی فیض کسی کو نہیں پہنچ سکتا...............اور بہ جز اس کے کوئی صاحبِ خاتم نہیں، ایک وہی ہے جس کی مہر سے ایسی نبوت بھی مل سکتی ہے، جس کے لیے امتی ہونا لازمی ہے اور اس کی ہمت اور ہمدردی نے امت کو ناقص حالت پر چھوڑ نا نہیں چاہا۔'' (۱)

اور مرزا غلام احمد قادیانی کے ملفوظات میں ہے:

'خاتم النبیین کے معنے یہ ہیں کہ آپ کی مہر کے بغیر کسی کی نبوت کی تصدیق نہیں ہو سکتی، جب مہر لگ جاتی ہے، تو کاغذ سند ہو جاتا ہے اور مصدقہ سمجھا جاتا ہے، اسی طرح آں حضرت کی مہر اور تصدیق، جس نبوت پر نہ ہو، وہ صحیح نہیں ہے۔'' (۲)

الغرض مرزا نے ﴿خاتم النبیین﴾ کے معنی نبیوں کی مہر کے بیان کیے ہیں کہ حضرت محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بعد نبی آئیں گے؛ مگر وہ آپ کی مہر کے ساتھ آئیں گے، مگر ﴿خاتم النبیین﴾ کے یہ معنے نہ قرآن کی رو سے صحیح ہیں اور نہ حدیث کی رو سے اور نہ قواعدِ عربیہ کے لحاظ سے۔

قرآن کے لحاظ سے اس لیے غلط ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت اسی آیت میں اس طرح آئی ہے:

---

(۱) حقیقۃ الوحی: ۲۷، روحانی خزائن: ۲۲/۲۹-۳۰

(۲) ملفوظات احمدیہ: ۳/۴۰۸

﴿وَلٰكِنْ نَبِيًّا خَتَمَ النَّبِيِّيْنَ﴾

(لیکن آپ نبی ہیں، جنھوں نے نبیوں کو ختم کر دیا)

اور یہ مسلمہ اصول ہے کہ قرآن کی ایک قرأت، دوسری قرأت کی تفسیر و تفہیم کرتی ہے، جس طرح ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر کرتی ہے؛ لہٰذا اس قرأت نے مسئلہ صاف کر دیا کہ مراد ﴿خاتم النبیین﴾ سے یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے نبی ہیں، جنھوں نے سلسلۂ نبوت کو ختم کر دیا۔

اور حدیث کی رو سے یہ اس لیے غلط ہے کہ احادیث میں "لا نبي بعدي" کہا گیا، جس کا مطلب یہی ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا، اگر ﴿خاتم النبیین﴾ کے معنی یہ ہوتے کہ آپ کی مہر سے نبی آیا کریں گے تو "لا نبي بعدي" کہنا غلط ہوتا۔

الغرض مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی امت نے اس لفظ ﴿خاتم النبیین﴾ کے معنے میں تحریف کر کے مرزا کی نبوت کا چور دروازہ کھولنے کی کوشش کی، جس کو دنیا کے تمام علما نے باتفاق رد کر کے ان کی اس "تحریفِ معنوی" سے امت کو آگاہ کر دیا۔

اصطلاحاتِ شرعیہ میں مفاہیم کی تبدیلی کفر ہے

الغرض قرآنی و اسلامی اصطلاحات و الفاظ کو اس طرح من گھڑت معانی پہنا کر دین و شریعت سے کھلواڑ کرنا، بدترین جرم اور کفرِ خالص ہے، جس کو اسلام سے کوئی تعلق دور دور تک کا بھی نہیں ہو سکتا، چناں چہ علمائے امت نے اس طرح دین و شریعت کی اصطلاحات کو من گھڑت معانی پہنانے کو کفر اور اس قسم کے لوگوں کو کافر قرار دیا ہے، یہاں صرف دو تین حوالے پیش کرتا ہوں:

(۱) علامہ محمد بن ابراہیم المعروف بابن الوزیر رحمہ اللہ اپنی کتاب "إيثار الحق علی الخلق" میں لکھتے ہیں:

" مثل كفر الزنادقة ، والملاحدة الذين أنكروا البعث ، والجزاء ، والجنة ، والنار ، و تأولوا الرب جل جلاله، وجميع اسمائه بإمام الزمان ، و سموه باسم اللّٰه تعالى ، و فسروا : لا إله إلا اللّٰه أي لا إمام إلا إمام الزمان في زعمهم ، خذلهم اللّٰه تعالى ، و تلعبوا بجميع آيات كتاب اللّٰه عز و جل في تأويلها جميعا بالبواطن التي لم تدل على شيء منها دلالة ، ولا أمارة ، ولا لها في عصر السلف الصالح إشارة ، و كذلک من بلغ مبلغهم من غيرهم في تعفية آثار الشريعة ، و رد العلوم الضرورية التي نقلتها الأمة خلفها عن سلفها. "

(جیسے زندیقوں اور ملحدوں کا کفر ہے، جنھوں نے دوبارہ اٹھائے جانے ، بدلہ و جزا، جنت و جہنم کا انکار کیا اور رب تعالیٰ اور اس کے تمام ناموں کی تاویل امام الزماں سے کرتے اور اس اپنے امام الزمان کو اللہ کا نام دیتے ہیں اور" لا إله إلا اللّٰه" کا بہ زعم خود یہ مطلب لیتے ہیں کہ امام الزمان کے علاہ کوئی معبود نہیں، اللہ ان کو ذلیل و رسوا کرے اور اللہ کی کتاب کی تمام آیات سے کھلواڑ کرتے ہیں، ان کی ایسے باطنی معانی سے تاویل کرتے ہوئے ،جن پر کوئی دلیل یا علامت دلالت نہیں کرتی اور نہ ان کا سلفِ صالحین کے زمانے میں کوئی اشارہ ملتا ہے اور اسی طرح دوسرے وہ لوگ بھی کافر ہیں، جو شریعت کے نشانات کو مٹانے اور ضروری علوم جن کو اس امت کے اگلے لوگوں نے بعد والوں تک پہنچایا ہے، ان کو رد کرنے میں ان ہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔)(۱)

(۱) إيثار الحق :۴۰۲

(۲)علامہ شہاب الخفاجی رحمہ اللہ "نسیم الریاض" میں لکھتے ہیں:

"و كذلك وقع الإجماع من علماء المسلمين على تكفير كل من دافع نص الكتاب أي منع ، و نازع فيما جاء صريحا في القرآن كبعض الباطنية الذين يدعون لها معان آخر غير ظاهرها ."

(اور اسی طرح علمائے مسلمین کا اجماع ہے، ہر اس شخص کی تکفیر پر جو کتاب اللہ کی نصوص کو رد کرتا ہے اور قرآن میں صریح طور پر آئی ہوئی آیات میں منازعت و جھگڑا کرتا ہے، جیسے باطنیہ فرقے ان آیات کے ظاہری معنے سے ہٹا کر ایک دوسرے معنے کا دعوے کرتا ہے۔)(۱)

(۳)امام غزالی رحمہ اللہ "إحياء علوم الدين" میں لکھتے ہیں:

"شریعت کے الفاظ کو ظاہری مفہوم سے ہٹا کر ایسے باطنی معانی کی جانب پھیرنا، جس کی طرف ذہن منتقل ہی نہیں ہوتا، جیسے باطنیہ فرقے کی اس طرح کی چیزوں میں تاویلات کی عادت ہے، یہ بھی حرام ہے اور اس کا ضرر و نقصان بہت بڑا ہے؛ کیوں کہ جب الفاظ کو صاحبِ شرع کی کسی نقل پر اعتماد کے بغیر اور کسی عقلی ضرورت کے بغیر اپنے ظاہری مفہوم سے ہٹا دیا جائے گا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ الفاظ پر سے اعتماد اٹھ جائے گا اور اللہ و رسول کے کلام کا فائدہ ہی سرے سے ختم ہو جائے گا؛ کیوں کہ جو معنے پہلے پہل سمجھے جاتے ہیں، ان پر تو اعتماد نہیں رہا اور رہے باطنی معنے تو ان کا کوئی قاعدہ و اصول ہے ہی نہیں؛ بل کہ ان میں خیالات و افکار کا اختلاف ہوتا ہے اور اس کو مختلف معانی

(۱) نسيم الرياض شرح الشفاء للقاضي عياض:۴/۵۴۵

پر محمول کیا جا سکتا ہے اور اس قسم کے معانی مراد لینے والوں کا مقصد نئی جدت پیدا کرنا ہوتا ہے اور اسی طریقے سے ''باطنیہ'' کو موقعہ ملا کہ وہ تمام شریعت کو اس کے ظاہری معانی سے ہٹا کر اور من مانی معانی پر ان کو ڈھال کر شریعت ہی کو منہدم کر دیں۔''(۱)

دوسری صورت: مفہوم میں کمی یا زیادتی

اصطلاحاتِ شرعیہ میں تغیر و تبدیلی کی دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ بعض وقت ان کے مفہوم و معنی میں کمی و زیادتی کر دی جاتی ہے اور شرعاً ان کو جس عام یا خاص مفہوم کے لیے شرع نے مقرر و وضع کیا تھا یا حضراتِ سلفِ صالحین نے ان کو جن معانی و مفاہیم کے لیے استعمال کیا تھا اور ان کی کتب و مضامین میں ان کے جو معانی و مفاہیم مقصود و مراد تھے، ان سے ان کو ہٹا دیا جاتا ہے اور عموماً یہ بات کسی خاص چیز کے غلبے و رواج کی وجہ سے وجود میں آتی ہے اور کبھی اس کے پیچھے اغراضِ فاسدہ کام کرتے ہیں، ان اغراضِ فاسدہ و مفادات نفسانیہ سے متأثر ہو کر لوگ اس کمی بیشی کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔

علم و فقہ وغیرہ الفاظِ شرعیہ کے معانی میں کمی بیشی

جیسے امام غزالی رَحِمَہُ اللہُ نے ''إحياء علوم الدين'' میں اس قسم کے پانچ الفاظ سے بحث کی ہے اور وہ ہیں: فقہ، علم، توحید، تذکیر اور حکمت۔ امام غزالی رَحِمَہُ اللہُ نے فرمایا:

''اعلم أن منشأ التباس العلوم المذمومة بالعلوم

(۱) إحياء العلوم: ۱/۳۷

الشرعية تحريف الأسامي المحمودة ، و تبديلها ، و نقلها بالأغراض الفاسدة إلى معان غير ما أراده السلف الصالح ، والقرن الأول " .(۱)

(جاننا چاہیے کہ برے علوم کے شرعی علوم کے ساتھ خلط ملط ہو جانے کا سبب یہ ہے کہ اچھے (اسلامی) ناموں (والفاظ) کی تحریف و تبدیلی کردی جائے اوران کو ایسے معنوں کی طرف منتقل کردیا ہے، جو سلفِ صالحین اور قرنِ اول کے لوگوں نے ان سے مراد نہیں لیا تھا۔)

امام غزالی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے ان پانچوں الفاظ پر بحث کی ہے؛ لیکن یہاں ہم اختصار کے پیشِ نظر صرف دو: ایک فقہ اور دوسرے علم کے بارے میں ان کی تحقیق نقل کردینا مناسب سمجھتے ہیں۔

امام غزالی رَحِمَہُ اللّٰہُ فرماتے ہیں کہ "فقہ" کے لفظ میں لوگوں نے تصرف کر کے اس کے معنی میں تخصیص کردی، یہ لفظ پہلے دور میں علم آخرت اور آفاتِ نفس کی گہری باتوں کو جاننے اور اعمال کو فاسد و برباد کرنے والی چیزوں کی جانکاری اور دنیا کی حقارت اور اخروی نعمتوں کی جانب لگاؤ اور دل میں خوف کے غلبہ پر بولا جاتا تھا؛ مگر بعد میں لوگوں نے فرعی و جزئی مسائل میں سے عجیب و غریب باتوں سے متعلق فتاویٰ کے جاننے اور ان کی وجوہات کے دقائق سے واقفیت اور اس سلسلے میں لمبا چوڑا کلام و بحث کرنے اور ان سے متعلقہ مقالات کو یاد کرنے کے لیے اس لفظ "فقہ" کو خاص کردیا؛ لہٰذا جو اس میں خوب گہرائی و گیرائی سے مشغول ہوتا ہے، اس کو لوگ کہتے ہیں کہ یہ "افقہ" ہے۔

اسی طرح لفظ "علم" پہلے زمانوں میں اللہ تعالیٰ کو اور اس کی نشانیوں اور بندوں

---

(۱) إحياء العلوم:۱/۳۲

اور اس کے مخلوق میں اس کے تصرفات کو جاننے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، پھر لوگوں نے اس میں تصرف کر کے اس کو فقہی مسائل میں اپنے مخالف رائے رکھنے والے اور اس سلسلے میں مناظرہ و بحث کرنے والے پر اس کو چسپاں کر دیا، حال آں کہ علم کے فضائل میں جو کچھ وارد ہوا ہے، وہ اللہ کو اور اس کے احکام کو اور اس کے افعال وصفات کو جاننے والے کے حق میں ہے۔(۱)

راقم عرض کرتا ہے کہ اس کی تائید حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ کے قول سے ہوتی ہے کہ جب ان سے عمران القصیر نے کوئی مسئلہ پوچھا اور عرض کیا کہ اس بارے میں فقہا تو یوں کہتے ہیں؟ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ کیا تو نے اپنی آنکھوں سے کسی "فقیہ" کو دیکھا ہے؟ پھر فرمایا:

"إنما الفقيه الزاهد في الدنيا ، البصير بدينه ، المداوم علي عبادة ربه."(۲)

(فقیہ تو بس وہ ہے، جو دنیا سے دل نہ لگانے والا، اپنے دینی امور میں بصیرت رکھنے والا، اپنے رب کی عبادت پر پابندی کرنے والا ہو۔)

اور حضرت مطر الوراق رحمۃ اللہ کہتے ہیں:

"میں نے حضرت حسن رحمۃ اللہ سے ایک مسئلہ معلوم کیا، انھوں نے جواب دیا، میں نے عرض کیا کہ فقہا تو اس میں آپ کے خلاف کہتے ہیں؟ فرمایا کہ کیا تم نے کوئی فقیہ دیکھا ہے؟ کیا تم جانتے بھی ہو کہ فقیہ کون ہے؟ فقیہ تو وہ متقی زاہد سنتِ رسول پر قائم رہنے والا ہے، جو کبھی کسی اپنے سے کم تر کا ٹھٹا نہ کرے اور کسی اپنے سے بڑے کا مذاق

(۱) دیکھو: إحياء العلوم :۱/۳۲-۳۳

(۲) سير إعلام النبلاء:۴/۵۷۶

نہ اڑائے اور اللہ نے جو علم دیا، اس سے دنیا نہ کمائے۔''(۱)

الحاصل علم اور فقہ کی شرعی اصطلاحات لوگوں نے ایک بہت محدود معانی کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا اور ایک غلو کا ارتکاب کیا۔

اور اس غلو کا نتیجہ ایک تو یہ ہوا کہ لوگ عالم اسے تو کہتے ہیں، جو ان ''مسائل جدلیہ و اختلافیہ'' میں مہارت رکھتا ہو؛ مگر اُسے عالم نہیں سمجھتے، جو اللہ کی معرفت کا حامل ہوتا ہے اور خوف و خشیت و فکرِ آخرت سے متعلق احکام و آیات کے معانی پر مہارت رکھتا ہے۔

دوسرا نتیجہ سامنے یہ آیا کہ عموماً طالبینِ علوم نے صرف ان ہی چند ''مسائلِ خلافیہ'' کے علم کو علم سمجھ کر اسی کو اپنا مقصود بنالیا اور علومِ آخرت سے یکسر غافل ہو گئے، جو کہ اصل مقصود تھے۔

اصطلاحِ ''دعوت'' میں تحدید و تقصیر

اور اسی میں یہ بھی داخل ہے کہ آج کل عوام الناس میں ''دعوت و تبلیغ'' کے سلسلے میں غلو پایا جاتا ہے اور اکثر لوگ اس کو ایک خاص صورت و شکل اور ایک خاص نظام کے ساتھ محدود و مخصوص سمجھتے ہیں، حال آں کہ ''دعوت و تبلیغ'' کا مفہوم و مصداق وسیع و عام ہے، اللہ کے دین کی باتیں و احکام خواہ وہ کسی بھی باب و شعبے سے متعلق ہوں، ان کو لوگوں تک پہنچانا اور ان کو اللہ کے راستے کی جانب متوجہ کرنا و بلانا ''دعوت و تبلیغ'' ہے، جس کی بے شمار صورتیں و شکلیں پہلے سے بھی ہر دور میں چلی آ رہی ہیں اور آج بھی جاری ہیں اور ہر ایک کا مقصود یہی ہے کہ اللہ کا دین اور نبی کی لائی ہوئی شریعت اپنوں و غیروں تک پہنچ جائے۔

---

(۱) طبقات الحنابلة:۱۴۸/۲

اس مقصود کو کسی بھی ایسے طریقے سے انجام دینا، جو شرعی دائرے میں ہو جائز و درست ہے اور اس پر ''دعوت و تبلیغ'' کا اطلاق ہوتا ہے، خواہ وہ وعظ و بیان کے ذریعے ہو، جیسے عموماً حضراتِ علما جمعہ میں اور دیگر مواقع پر اپنے مواعظ سے لوگوں کو اللہ کے دین کی دعوت دیتے اور مختلف احکامات پہنچاتے ہیں، خواہ وہ تفسیری حلقے قائم کر کے اس کے ذریعے اللہ و رسول کا پیغام پہنچایا جائے ، یا تصنیف و تالیف کے راستے سے یہ کام انجام دیا جائے۔ الغرض کسی بھی صورت و شکل سے اس کام کو انجام دیا جائے ، وہ بہ ہر حال شرعاً ''دعوت و تبلیغ'' ہے، حتی کہ ایک شخص اپنے گھر کے لوگوں کی اصلاح میں لگا ہے اور وہ ان کو دین پر لانے کی کوشش کر رہا ہے، اگر چہ کہ کہیں باہر نہیں نکلا، تو وہ بھی ''دعوت و تبلیغ'' میں لگا ہوا ہے۔

اور ایک مخصوص نظام کے تحت کی جانے والی جد و جہد ہی کو ''دعوت و تبلیغ'' سمجھنے اور باور کرانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ حضراتِ علمائے کرام کی دعوتی و تبلیغی سرگرمیوں کو ''دعوت و تبلیغ'' کی مد میں شمار ہی نہیں کرتے اور ان کو تارکِ دعوت و تبلیغ قرار دیتے اور ہمیشہ ان سے شاکی رہتے ہیں؛ بل کہ گناہ گار بھی گردانتے ہیں، یہ غلو فی الدین و تجاوز عن الحدود ہے۔

''جہاد'' اور ''فی سبیل اللہ'' کے معانی میں تعمیم و تحدید

ایک اور لفظ جس میں غلو سے کام لیا گیا اور لیا جاتا ہے، وہ ہے ''جہاد فی سبیل اللہ'' یا ''فی سبیل اللہ''۔ بعض لوگ ان الفاظ کو اپنے شرعی مفہوم سے عام کر کے غلو کا ارتکاب کرتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ ''جہاد'' کے معنی لغت عربی میں جد و جہد کرنے اور مشقت اٹھانے کے ہیں اور یہ جد و جہد دین و اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ہو، تو یہ جد و جہد ایک

مقدس عبادت بن جاتی ہے۔ پھر شریعت میں عموماً یہ "جہاد فی سبیل اللہ" کفار و مشرکین سے قتال کرنے کے معنے میں استعمال ہوتا ہے۔

علامہ ابن رشد مالکی رَحِمَہُ اللہُ نے " المقدمات " میں لکھا ہے:

"إن الجهاد إذا أُطلِقَ فلا يَقَعُ بإطلاقه إلَّا على مجاهدة الكفار بالسيف."(۱)

(بلا شبہ جہاد کا لفظ جب بولا جاتا ہے، تو وہ اپنے اطلاق کے ساتھ صرف کفار سے تلوار کے ذریعے جہاد ہی پر بولا جاتا ہے۔)

امام ابن المناصف القرطبی رَحِمَہُ اللہُ نے اپنی کتاب "الإنجاد في أبواب الجهاد" میں جہاد کے لغوی معنے بیان کرنے کے بعد بہت تفصیل سے یہ بیان کیا ہے کہ جہاد کا لفظ دینی وشرعی لحاظ سے تین صورتوں پر اطلاق کیا جاتا ہے: ایک قلبی جہاد، دوسرے لسانی جہاد اور تیسرے ہاتھ سے جہاد، پھر ان میں سے ہر ایک کی تفصیل بیان کرنے کے بعد "جہاد بالید" میں "قتال مع الکفار" کا ذکر کیا ہے، پھر اسی کے بارے میں لکھتے ہیں:

" و يقتضي أن لفظ الجهاد إذا أطلق إنما يحمل على هذا النوع بخاصة. "(۲)

(اس کا تقاضا ہے کہ لفظ جہاد جب بولا جائے، تو وہ صرف اسی خاص قسم کے جہاد ہی پر محمول کیا جائے۔)

مشہور حنفی فقیہ علامہ کاسانی رَحِمَہُ اللہُ نے مشہور فقہی کتاب " بدائع الصنائع" میں لکھا ہے:

---

(۱) مقدمات ابن رشد:۱/۳۴۲

(۲) الإنجاد في أبواب الجهاد:۱۷

" و أما الجهاد في اللغة فعبارة عن بذل الجهد – بالضم – وهو الوسع ، والطاقة ، أو عن المبالغة في العمل من الجهد – بالفتح – و في عرف الشرع يستعمل في بذل الوسع ، والطاقة بالقتال في سبيل اللّٰه بالنفس ، والمال، واللسان ، أو غير ذلک ، أو المبالغة في ذلک." (۱)

(جہاد لغت میں " جُھد" سے محنت خرچ کرنے کے معنی میں ہے یا " جَھد" سے کام کرنے میں مبالغہ کرنے کے معنی میں ہے اور شریعت کے عرف میں جہاد اللہ کے راستے میں جان و مال و زبان وغیرہ کے ذریعے قتال کرتے ہوئے اپنی طاقت و وسعت خرچ کرنے کا نام ہے یا اس میں مبالغہ کرنے کا نام ہے۔)

اور " مجمع الأنهر" میں ہے:

" الجهاد في اللغة : بذل ما في الوسع من القول والفعل. و في الشريعة : قتل الكفار، و نحوه من ضربهم و نهب أموالهم ، و هدم معابدهم ، و كسر أصنامهم وغيرهم." (۲)

(جہاد: لغت میں قول وفعل میں سے جو بھی اپنی وسعت میں ہے، اس کو خرچ کرنے کا نام ہے اور شریعت میں کفار کو قتل کرنے اور دیگر کام جیسے ان کو مارنے، ان کے مالوں کو چھین لینے، ان کے عبادت خانوں کو گرادینے اور ان کے بتوں کو توڑنے وغیرہ کا نام ہے۔)

---

(۱) بدائع الصنائع:۳۷۹/۹

(۲) مجمع الأنهر:۲۷۸/۴

اور ”الدر المختار“ و” تحفة الفقهاء“وغیرہ میں جہاد کی شرعی تعریف میں لکھا ہے:

” هو الدعاء إلى الدين الحق ، والقتال مع من امتنع من القبول بالمال ، و النفس.“

(جہاد: دین حق کی طرف بلانے اور جو اس کو منع کرے اس سے جان و مال سے لڑنے کا نام ہے۔)(۱)

اسی طرح ”أنيس الفقهاء“ میں ہے کہ جہد کے معنے بساط بھر طاقت خرچ کرنے کے ہیں؛ مگر اسلام میں یہ لفظ، کفار سے قتال کے معنے میں غلبہ پالیا۔(۲)

یہ اہلِ لغت و اہلِ فقہ کے چند حوالجات ہیں، جن میں صاف و واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ ”جہاد“ کے شرعی معنے ”قتال مع الکفار“ کے ہیں۔

اور قرآن میں اکثر جگہوں پر یہ لفظ ”جہاد“ اسی معنے میں استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً: قرآن میں دو جگہ یہ آیت آئی ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾ (التوبة :۷۳۔ التحريم :۹)

(اے نبی! کفار و منافقین سے جہاد کیجیے اور ان پر سختی کیجیے اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بڑا برا ٹھکانہ ہے۔)

ان دونوں مقام پر ”جہاد“ سے کفار و مشرکین سے قتال و حرب و ضرب ہی ہے، جیسا کہ مفسرینِ کرام نے تصریح کی ہے، یہاں دوسرے معنے یعنی دینی پیغام پہنچانے کی جد و جہد مراد نہیں ہے۔

---

(۱) الدر المختار مع الشامي:۱۲۱/۴،تحفة الفقهاء:۲۹۳/۳

(۲) أنيس الفقهاء:۶۴/۱

امام طبری رحمہ اللہ نے لکھا ہے: "جاهد الكفار بالسيف و السلاح" اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ کفار سے تلوار کے ذریعے جہاد کریں اور منافقین کے ساتھ حدود جاری کر کے سختی کریں۔(۱)

اسی طرح امام قرطبی و ابن کثیر رحمہما اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ مراد کفار سے تلوار کے ذریعے جہاد کرنا ہے۔(۲)

نیز ایک جگہ غزوۂ احزاب میں منافقین کے نہ نکلنے اور حیلے بہانے کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہے:

﴿ فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ كَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴾ (التوبۃ:۸۱)

(یہ پیچھے رہ جانے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانے کے بعد اپنے بیٹھے رہنے پر خوش ہو گئے اور ان کو گراں معلوم ہوا، اللہ کے راستے میں اپنی جان و مال سے جہاد کرنا اور کہنے لگے کہ گرمی میں نہ نکلو! آپ کہہ دیجیے کہ جہنم کی آگ اس سے زیادہ سخت ہے، کاش وہ لوگ سمجھتے!)

یہاں جہاد سے وہی قتال مراد ہے اور وہ جنگِ احزاب تھی، جس میں منافقین نے روگردانی کی تھی۔

الغرض بہت سی آیات ہیں، جن میں واضح طور پر جہاد سے مراد قتال مع الکفار و

(۱)جامع البیان:۲۳/۴۹۷

(۲) تفسیر القرطبي:۸/۲۰۴، التفسیر لابن کثیر:۴/۱۷۸

المشرکین ہی ہے۔

اسی طرح احادیثِ نبویہ میں بھی عموماً یہ لفظ ''جہاد'' اسی قتال مع الکفار کے معنے میں استعمال کیا گیا ہے۔

ایک حدیث اس سلسلے میں اس قدر واضح وصریح ہے کہ کسی تاویل کی گنجائش نہیں، وہ یہ کہ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم !

''وما الجهاد ؟''(جہاد کیا ہے؟)

آپ نے فرمایا:'' أن تقاتل الكفار إذا لقيتهم ''

(جہاد یہ ہے کہ تو کفار کا آمنا سامنا ہو،تو ان سے قتال کرے)(۱)

اس میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کی حقیقت واضح کر دی کہ وہ قتال مع الکفار ہے۔

نیز ایک حدیث میں فرمایا: شیطان ابن آدم کو بہکانے اس کے مختلف راستوں پر بیٹھ کر اس کو بہکاتا ہے، پھر آپ نے اسلام اور ہجرت کا ذکر کیا پھر فرمایا:

''ثم قعد له بطريق الجهاد ، فقال: تجاهد؟ فهو جهد النفس ، والمال ، فتقاتل فتقتل ، فتنكح المرأة ، و يقسم المال.''(۲)

(پھر شیطان انسان کے جہاد کے راستے پر بیٹھتا اور کہتا ہے کہ کیا تو جہاد کرے گا؟ جہاد تو جان و مال کی مشقت ہے، پس تو قتال کرے گا

---

(۱) مسند أحمد:۱۷۰۶۸،مسند عبد بن حميد:۳۰۱،شعب الإيمان:۲۲، مصنف عبد الرزاق:۲۰۱۰۷

(۲) سنن النسائي:۳۱۳۴، مسند أحمد:۱۶۰۰۰

اور قتل کر دیا جائے گا، پھر بیوی کسی سے شادی ہو جائے گی اور تیرا مال لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔)

اس حدیث نے بھی جہاد کا معنی متعین کر دیا کہ وہ جان و مال کے ساتھ لڑنے کا نام ہے اور شیطان جو انسان کو بہکاتا ہے، تو وہ اسی کا حوالہ دے کر ڈراتا ہے کہ تو جہاد کرے گا؛ تو قتل ہو جائے گا اور تیری بیوی کسی کے نکاح میں چلی جائے گی اور تیرا مال بھی تقسیم ہو جائے گا، یہ سارے احوال ''جہاد بالنفس'' ہی کے ہیں۔

نیز غور کیا جائے کہ جب رسول اللہ ﷺ کے دور میں اور بعد کے ادوار میں اسلامی حکومتوں کے سربراہ جہاد کا اعلان کرتے تھے، تو اس کا معنی صحابہ رضی اللہ عنہم بھی اور بعد والے بھی قتال مع الکفار ہی کے لیتے تھے اور اس کے علاوہ دوسرا کوئی معنی دینی خدمت و جد وجہد وغیرہ کے ان کے ذہنوں میں آتے ہی نہیں تھے اور اس اعلان کو سن کر کوئی قرآن پڑھانے یا درس حدیث دینے یا دعوت و تبلیغ کا فریضہ ادا کرنے کے لیے نکلنے کی تیاری نہیں کرتا تھا؛ بل کہ اس وقت سب جانتے تھے کہ اس اعلان سے مقصود قتال و جنگ کے لیے نکلنا ہے۔

اس تفصیلی گفتگو سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ''جہاد'' کا لفظ قرآن و حدیث و شرعی احکامات میں جب استعمال ہوتا ہے، تو اس کا اصل معنی ''جہاد مع الکفار والمشرکین'' ہی ہوتا ہے۔

ہاں! مجازاً اس لفظ کو دینی محنت و خدمت، اصلاح و تزکیہ، تعلیم و تعلم اور دعوت و تبلیغ؛ بل کہ تمام کے تمام دینی کاموں پر بھی اطلاق کیا جاتا ہے؛ مگر اس صورت میں اس کا یہ معنی مجازی ہوتا ہے۔

چناں چہ بعض آیات میں جہاد سے دینی جد و جہد و اعلائے کلمۃ اللہ کی محنت مراد ہے۔ مثلاً:

﴿فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ (الفرقان:۵۲)

(آپ کافروں کی اتباع نہ کریں اور ان سے بڑا جہاد کریں)

اس آیت میں جو﴿جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ آیا ہے، اس کی تفسیر میں امام طبری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ مراد: قرآن کے ذریعے جہاد کرنا ہے؛ تاکہ وہ قرآن کے احکام و فرائض کا اقرار کرلیں۔ امام التفسیر ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی یہی لکھا ہے کہ مراد ''جہاد بالقرآن'' ہے۔(۱)

امام قرطبی رحمہ اللہ نے بھی یہی لکھا اور اس کو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے اور پھر فرمایا کہ بعض نے یہاں ''جہاد بالسیف'' مراد لیا ہے، مگر اس میں بعد ہے؛ کیوں کہ یہ ﴿سُوْرَةُ الْفُرْقَانِ﴾ ''مکی'' ہے، جو قتال کا حکم آنے سے پہلے نازل ہوئی ہے۔(۲)

اسی طرح درج ذیل آیتِ کریمہ میں بھی جہاد سے بعض حضرات نے دینی جدو جہد و محنت لیا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (العنکبوت:۶۹)

(اور جو لوگ ہمارے راستے میں مجاہدہ کرتے ہیں، ہم ان کے لیے ضرور بالضرور راستے کھول دیں گے۔)

اس آیت میں بھی ''مجاہدے'' سے بہت سے علما نے یہی عموم مراد لیا ہے، حضرت ربیع رحمہ اللہ سے نقل کیا گیا ہے:

'' ليس على الأرض عبد أطاع ربه ، و دعا إليه ، و نهى عنه إلا و أنه قد جاهد في الله. ''

---

(۱) جامع البيان:۱۹/۲۸۱،التفسير لابن كثير:۶/۱۱۷

(۲) تفسير القرطبي:۱۳/۵۸

(روئے زمین پر کوئی بھی بندہ، جو اللہ کی اطاعت کرے اور اس کی جانب دعوت دے اور برائی سے روکے، اس نے اللہ کے لیے جہاد کیا۔)(۱)

اور ابو سلیمان دارانی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''اس آیت میں جہاد صرف یہ نہیں ہے کہ کفار سے قتال کیا جائے؛ بل کہ مراد: دین کی مدد و نصرت اور اہلِ باطل کا رد، ظالموں کا استیصال اور ان سب کا بڑا حصہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے اور اسی سے اللہ کی اطاعت میں نفس سے مجاہدہ کرنا بھی ہے اور یہی ''جہادِ اکبر'' ہے۔''(۲)

الغرض اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض جگہ جہاد سے مراد، دینی و اصلاحی و دعوتی جد و جہد مراد ہوتی ہے اور اس معنے کے لحاظ سے تمام قسم کی دینی محنتیں و کوششیں اور تمام عبادات و نیکیاں جہاد کے مفہوم میں داخل ہیں۔

جیسے ایک حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! ہم جہاد کو سب اعمال میں افضل سمجھتے ہیں، تو کیا ہم جہاد نہ کریں؟ آپ نے فرمایا:

''لا، و لكن أفضل الجهاد حج مبرور.''(۳)

(نہیں! بل کہ افضل جہاد، تو حجِ مبرور ہے۔)

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''أفضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر.''

(افضل جہاد: ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا ہے۔)(۴)

---

(۱) تفسير ابن أبي حاتم:۹/۳۰۸۴

(۲) التفسير للقرطبي:۱۶/۳۹۰

(۳) الصحيح للبخاري:۱۵۲۰

(۴) سنن أبي داود:۴۳۴۶ و اللفظ له، سنن الترمذي:۲۱۷۴

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص آپ کی خدمت میں جہاد میں جانے کی اجازت طلب کرنے آئے، آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے پوچھا کہ کیا تمھارے والدین زندہ ہیں؟ کہا کہ ہاں! تو فرمایا:

" ففيهما فجاهد." (پس ان کی خدمت میں مجاہدہ کرو!) (۱)

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

"من خرج في طلب العلم فهو في سبيل الله حتى يرجع."

(جو شخص علم طلب کرنے کے لئے نکلے وہ اللہ کے راستے میں ہے جب تک کہ واپس نہ لوٹے) (۲)

معلوم ہوا کہ جہاد کبھی نیکی و طاعت اور دینی محنت کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ فرماتے ہیں:

"چوں کہ جہاد کا مقصد اسلام اور مسلمانوں سے دفاع ہے اور دفاع ہر زمانے اور ہر قوم کا جدا ہوتا ہے؛ اس لیے آں حضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: "جاهدوا المشركين بأموالكم و أنفسكم و ألسنتكم" (رواه أبو داود، والنسائي، والدارمي عن أنس رضي الله عنه) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس طرح دفاع و جہاد ہتھیاروں سے ہوتا ہے، بعض اوقات زبان سے بھی ہوتا ہے اور قلم بھی زبان ہی کے حکم میں ہے، اسلام اور قرآن سے کفر و الحاد کے حملوں اور

(۱) الصحيح للبخاري: ۳۰۰۴، الصحيح للمسلم: ۶۶۶۸، سنن أبي داود: ۲۵۳۱، مسند أحمد: ۶۵۴۴

(۲) سنن الترمذي: ۲۶۴۷، مسند بزار: ۶۵۲۰، المعجم الصغير للطبراني: ۳۸۰

تحریفوں کی مدافعت زبان یا قلم سے، یہ بھی اس صریح نص کی بنا پر جہاد میں داخل ہے۔"(۱)

الغرض جہاد کا لفظ کبھی تو دینی جد و جہد کے معنی میں مستعمل ہے اور کبھی قتال و جنگ کرنے کے معنے میں استعمال ہوتا ہے؛ مگر شرعی اصطلاح میں قتال و جنگ کرنے کے معنے ہی غالب ہیں۔

مگر عجیب بات یہ ہے کہ دو قسم کے لوگ اس سلسلے میں غلو کرتے ہیں: ایک وہ جو اس کو دینی جد و جہد کے معنے میں لینے سے صاف انکار کر جاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جہاد کا لفظ صرف قتال مع الکفار ہی کے لیے مخصوص ہے؛ لہٰذا اس کو اس جد و جہد کے معنے میں لینا غلط ہے۔

ان لوگوں کی یہ بات اگر اس معنی کر ہے کہ جہاد کا لفظ عموماً قتال کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور یہ کہ اس کا اطلاق عام طور پر اسلامی معاشرے میں اسی معنے کی طرف مشیر ہوتا ہے، تو یہ بات درست ہے؛ مگر اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ جہاد کا لفظ مجازاً بھی جد و جہد کے معنے میں استعمال نہیں کیا جاتا؟ جب کہ ہم نے اوپر یہ ثابت کر دیا ہے کہ خود قرآنی نصوص اور حدیثی بیانات میں یہ معنی مراد لیا گیا ہے، جیسا کہ اوپر گزرا اور اگر ان کی مراد اس سے یہ ہے کہ جہاد کا لفظ کہیں بھی اور کبھی بھی جد و جہد کے معنے میں استعمال نہیں ہوتا، تو یہ بات بداہۃً غلط ہے۔

اور اس سلسلے میں غلو کرنے والے دوسرے وہ لوگ ہیں، جو اس کے برعکس جہاد کو قتال کے معنے میں لینے سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جہاد کا لفظ جہاں استعمال کیا جاتا ہے، وہ دینی جد و جہد ہی کے معنی میں ہوتا ہے اور ان میں سے بعض لوگ تو اس سلسلے میں تاویل سے کام لیتے ہوئے مطلقاً جہاد ہی سے اعراض کا سبق

---

(۱) معارف القرآن: ۴/۳۷۲

دیتے ہیں اور جہاں جہاں ”جہاد“ کا لفظ آیا ہے، اس کو محض دینی جدو جہد کے معنی میں لے کر جہاد کے تمام فضائل اور اس پر ملنے والے اجر وثواب کو دینی جدو جہد پر منطبق کرتے ہیں؛ مگر یہ بھی غلط ہے؛ کیوں کہ لفظ ”جہاد“ کا لغوی معنی اگر چہ کہ جدو جہد کا ہے؛ مگر شرعی اصطلاح میں عموماً اس کا استعمال قتال وحرب و جنگ ہی کے معنے میں ہوتا ہے؛ لہٰذا اس کا انکار یا خواہ مخواہ کی تاویل اصطلاحِ شرع میں وہی تبدیلی کا غلو ہے، پھر جہاد کے تمام فضائل و برکات کو ان دینی کاموں پر منطبق کرنا بھی اسی غلو پسندی کا ثمرہ ہے۔

اور ان دو قسم کے لوگوں سے ہٹ کر ایک وہ لوگ بھی دیکھنے میں آتے ہیں، جن کا طرزِ عمل دونوں سے زیادہ حیران کن ہے، وہ لوگ ایک جانب ”جہاد“ کو عام کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”جہاد“ کے معنے دینی جدو جہد کے ہیں اور ظاہر ہے کہ اگر اس کو عام معنی میں لیا جائے، تو اس میں تمام دینی محنتیں و دینی جدو جہد کی صورتیں وطریقے داخل ہونا چاہیے؛ لہٰذا مدارسِ اسلامیہ میں پڑھنے والے و پڑھانے والے طلبہ و اساتذہ، خانقاہوں میں اصلاح وتزکیے کی جدو جہد کرنے والے مشائخ؛ نیز زبان وقلم کو آلۂ دعوت وتبلیغ بنا کر کام کرنے والے واعظین ومقررین، مصنفین ومؤلفین وغیرہ بھی اسی جہادی تحریکات کے افراد شمار کیے جانے چاہئیں؛ مگر یہ لوگ ایسا نہیں سمجھتے؛ بل کہ یہ اس عام کو صرف اس دینی جدو جہد کے لیے خاص کرتے ہیں، جس کو انھوں نے اپنایا ہے اور مدارس کے اساتذہ وطلبہ، خانقاہوں کے مشائخ وصوفیا اور دیگر ذرائع سے دینی جدو جہد میں لگے ہوئے لوگ، ان کی نظر میں جہاد کے اس راستے پر نہیں ہیں۔

حال آں کہ جب اس کو عام معنی میں لیا جائے، تو یہ سب کے سب افراد و خدمات اس میں داخل ہوتے ہیں۔ الغرض غلو کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ شرعی اصطلاحات کے معانی ومفاہیم میں کمی وزیادتی کردی جائے۔

اختلافات کی صورت میں حدود سے تجاوز

غلو کی ایک صورت عموماً یہ بھی پیش آتی ہے کہ اختلافات کی صورت میں حدود کی رعایت نہیں کی جاتی ہے، کبھی افراط سے کام لیا جاتا ہے؛ تو کبھی تفریط کی جاتی ہے۔

اختلاف کی دو قسمیں

سب سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ اختلاف دو قسم کا ہوتا ہے، ایک اصول میں اختلاف، دوسرے فروع میں اختلاف۔ پھر اصول میں اختلاف بھی دو قسم پر ہے: ایک وہ جس سے اسلام و کفر کا اختلاف پیدا ہوتا اور ایک جانب والا مسلمان، تو دوسری جانب والا کافر ٹھیرتا ہے۔ جیسے قادیانی فرقے کا اختلاف۔ ظاہر ہے کہ اس فرقے کا اختلاف معمولی اور جزوی و فروعی اختلاف نہیں ہے؛ بل کہ اتنا سخت اختلاف ہے کہ اس اختلاف کی بنا پر اس کا رشتہ اسلام سے یکسر کٹ جاتا اور ختم ہو جاتا ہے؛ کیوں کہ اسلام کی تعلیم کے مطابق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین و آخر النبیین ہیں اور آپ کے بعد نبوت کا باب کلیۃً مسدود و بند کر دیا؛ لیکن قادیانی فرقہ اس مسئلے اور بنیادی عقیدے کے خلاف پنجاب کے کذاب و دجّال ایک جھوٹے دعوے دارِ نبوت کو نبی مانتا ہے۔ لہٰذا یہ اختلاف معمولی اختلاف نہیں۔

اسی طرح شیعہ میں سے اس فرقے کا اختلاف جو موجودہ قرآن کو اللہ کی کتاب نہیں مانتا اور اللہ کے بارے میں ''بداء'' (یعنی اللہ کے دھوکہ کھانے اور اللہ کو غلطی لگنے) کا عقیدہ رکھتا ہے، یہ بھی بنیادی عقائد اور مسلمہ مسائل میں اختلاف ہے، جس سے اسلام و کفر کا اختلاف پیدا ہوتا ہے۔

اور دوسرا اصولی اختلاف وہ ہے، جس سے سنت و بدعت کا اختلاف پیدا ہوتا ہے اور ایک طرف کا حامل اہلِ سنت میں سے ہوتا ہے، تو دوسرا بدعتی کہلاتا ہے۔ جیسے

بہت سے اسلامی فرقوں ''قدریہ''، ''جبریہ''، ''معتزلہ'' وغیرہ کا حال ہے کہ یہ فرقے اہلِ سنت سے ہٹ گئے اور ان کے اختلاف سے شاہ راہِ سنت سے وہ الگ ہو گئے۔ اسی طرح بعض لوگوں کا حضرت نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اور دیگر انبیا اور اولیا کو عالم الغیب وحاضر وناظر اور مشکل کشا وغیرہ ماننا، اسلام کے بنیادی عقائد کے خلاف ہے، اسی طرح اسلام میں نئی نئی باتوں کو پیدا کرنا اور دین کے نام پر رواج دینا اور ان بدعات وخرافات کے لیے آیات واحادیث میں بے جا تاویل؛ بل کہ تحریف سے کام لینا بھی اختلاف کی اسی قسم میں سے ہے، جو انسان کو سنت وشریعت کی شاہ راہ سے ہٹا دیتا ہے۔

اور دوسرا اختلاف وہ ہے، جو اجتہادی مسائل میں دلائلِ شرعیہ کی روشنی میں ہوتا ہے اور ایسا اختلاف صدرِ اول صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانے سے برابر چلا آ رہا ہے؛ بل کہ اس قسم کا اختلاف خود دورِ رسالت میں بھی حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان ہوا ہے اور اللہ کے نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے اختلاف کی دونوں جہتوں کی تصویب فرمائی ہے؛ (اس کی تفصیل آگے آئے گی) کیوں کہ خود دلائل میں دونوں جہتوں اور شقوں کی گنجائش ہوتی ہے، ایک بات منصوص اور فیصل نہیں ہوتی، ایسے اختلاف کو اجتہادی وفروعی اختلاف کہا جاتا ہے، یہ اختلاف نہ مذموم ہے، نہ ممنوع ہے؛ بل کہ یہ فطری و طبعی ہونے کے ساتھ باعثِ رحمت بھی ہے۔

نہ ہر اتفاق محمود ہے، نہ ہر اختلاف برا و مذموم

اس سے معلوم ہوا کہ ہر اختلاف مذموم و برا نہیں ہوا کرتا اور نہ ہر اتفاق محمود و قابلِ تعریف ہوتا ہے؛ بل کہ ان میں الگ الگ درجات ہیں۔ مگر بعض لوگ شدید سے شدید اختلاف و اصولی اختلاف کو بھی یہ کہہ کر ہلکا و معمولی قرار دینے کی کوشش

کرتے ہیں کہ اس میں دو رائیں ونظریے ہیں؛ لہٰذا کوئی بڑی بات نہیں، حتی کہ ان اصولی و شدید اختلافات کو حضرات صحابہ وائمہ کے درمیان رونما ہونے والے اختلافات سے تشبیہ دیتے ہیں، حالانکہ صحابہ و ائمہ میں جو اختلاف تھا، وہ فروعی مسائل میں تھا، اصولی مسائل میں نہیں تھا۔

دوسری جانب کچھ حضرات وہ ہیں، جو ہر اختلاف کو اصولی اختلاف اور ایمان و کفر کے اختلاف کا ہم پلہ سمجھتے ہیں اور اس سے وہی معاملہ کرتے ہیں، جیسے اصولی اختلاف سے ہونا چاہیے؛ حال آں کہ یہ اختلاف نہ کوئی مذموم ہے، نہ ممنوع۔

فروعی اختلاف، نہ مذموم ہے، نہ ممنوع

اب ہم آگے بڑھتے ہوئے یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ان دونوں قسم کے اختلاف کا حکم و درجہ یکساں نہیں ہے؛ بل کہ دونوں کے درجے میں ایسا ہی فرق ہے جیسے زمین وآسمان میں اور حق و باطل میں اور حرام وحلال میں ہے۔ مگر بعض لوگ اس فرق کو نظر انداز کر کے دونوں اختلافات کے ساتھ یکساں سلوک کرتے ہیں اور دونوں کو مذموم وحرام قرار دیتے ہیں اور ان آیات و احادیث سے استدلال کرتے ہیں، جو اختلاف کی قسم اول کے متعلق وارد ہوئی ہیں۔

مگر ظاہر ہے کہ ان آیات واحادیث سے صرف اس اختلاف کی مذمت و برائی ثابت ہوتی ہے، جو بغیر دلیل شرعی نفسانیت وشرارت سے کیا جائے اور بنیادی و مسلمہ عقائد و مسائل میں ہو؛ لیکن دوسری قسم کا اختلاف جو دلائل کی روشنی میں کیا جائے اور اجتہادی وفروعی مسائل میں ہو، ان سے اس کا مذموم ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

مثال کے طور پر قرآن میں متعدد جگہ فرمایا:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ (آل عمران: ۱۰۳)

(اللہ کی رسی کو مضبوط تھام لو اور آپس میں اختلاف نہ کرو!)

ایک جگہ فرمایا:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (آل عمران: ۱۰۵)

(تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ، جنھوں نے اختلاف کیا اور متفرق ہو گئے)

ان آیات میں جس اختلاف سے ممانعت کی گئی ہے، وہ وہ اختلاف ہے، جو کفاّر کی طرح عقائد و مسلمات میں کیا جائے، جس سے انسان اسلام سے خارج ہو جاتا یا کم از کم سنت کی شاہ راہ سے ہٹ کر بدعت کی گمراہی میں ملوث ہو جاتا ہے۔

چناں چہ مذکورہ بالا آیات میں سے ﴿سورۃ آل عمران﴾ کی آیت (۱۰۳) کی تفسیر میں مشہور اہلِ حدیث عالم مولانا جوناگڑھی کے ترجمۂ قرآن پر حواشی میں مولانا صلاح الدین یوسف صاحب لکھتے ہیں:

"﴿وَلَا تَفَرَّقُوا﴾ اور پھوٹ نہ ڈالو کے ذریعے فرقہ بندی سے روک دیا گیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مذکورہ دو اصولوں (تقوی اور اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑنا) سے انحراف کرو گے، تو تمھارے درمیان پھوٹ پڑ جائے گی اور تم الگ الگ فرقوں میں بٹ جاؤ گے، چناں چہ فرقہ بندی کی تاریخ دیکھ لیجیے، یہی چیز نمایاں ہو کر سامنے آئے گی۔ قرآن و حدیث کے فہم اور اس کی توضیح و تعبیر میں کچھ باہم اختلاف یہ فرقہ بندی کا سبب نہیں ہے، یہ اختلاف تو صحابہ و تابعین کے عہد میں بھی تھا؛ لیکن مسلمان فرقوں اور گرہوں میں تقسیم نہیں ہوئے۔"

مذکورہ تشریح سے اتنی بات واضح ہو گئی کہ ہر اختلاف مذموم نہیں ہے؛ بل کہ قرآن و حدیث کے فہم اور تشریح و توضیح اور تفسیر و تعبیر میں صحابہ ﷺ میں بھی اختلاف

ہوا ہے اور ایسا اختلاف گروہ بندی و فرقہ بندی کا سبب بھی نہیں، جس سے قرآن نے روکا ہے۔

ہاں! جنھوں نے ان اختلافاتِ فرعیہ کی بنیاد پر فرقہ بندیاں کیں ہیں، وہ ضرور ماخوذ ہوں گے۔ معلوم ہوا کہ اجتہادی مسائل کا اختلاف ان آیات میں مراد نہیں ہے؛ بل کہ ان سے مراد اصولی اختلاف ہے۔

اسی طرح حدیث میں جس اختلاف و افتراق سے منع کیا گیا ہے، اس سے مراد بھی یہی پہلی قسم کا اختلاف ہے۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> ''بنی اسرائیل بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے اور میری اُمت تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی اور یہ سارے فرقے دوزخ میں جائیں گے، سوائے ایک فرقے کے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! وہ ایک فرقہ کون ہے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ جو اس طریقے پر قائم ہو، جس پر میں اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم قائم ہیں۔''

اس حدیث میں جو اُمت کے اختلاف و افتراق کا ذکر کر کے سارے فرقوں کو جہنمی اور صرف ایک فرقے کو جنتی قرار دیا گیا ہے، اس سے بھی یہ مسائل کا اختلاف مراد نہیں ہے؛ بل کہ عقائد و اصول میں اختلاف مراد ہے، بعض لوگ اس حدیث کو پیش کر کے ان فرقوں سے حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی مکاتبِ فکر مراد لیتے اور ان مکاتبِ فکر کے لوگوں کو (نعوذ باللہ) جہنمی قرار دیتے ہیں؛ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا، اس حدیث سے یہ اختلاف ہرگز مراد نہیں۔

چناں چہ اہلِ حدیث کے مشہور عالم علامہ عبید اللہ مبارکپوری رحمہ اللہ نے ''مرعاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح'' میں مذکورہ حدیث کی شرح میں لکھا ہے:

”حدیث میں افتراق سے مراد مطلق افتراق نہیں ہے کہ اس میں وہ اختلاف بھی داخل ہو جائے، جو فروعی مسائل میں خلفائے راشدین پھر دیگر صحابہ پھر تابعین پھر ائمۂ مجتہدین کے زمانے میں واقع ہوا؛ بل کہ مراد اس سے ایک خاص اختلاف وافتراق ہے اور وہ اختلاف و تفرق ہے، جس سے پارٹیاں اور جماعتیں بن گئیں اور بعض نے بعض سے جدائی اختیار کی، جو آپسی محبت والفت اور تعاون وتناصر پر قائم نہیں ہیں؛ بل کہ اس کی ضد یعنی ہجر، قطع تعلق، عداوت اور بغض اور ایک دوسرے کی تضلیل وتکفیر وتفسیق پر قائم ہیں۔ (پھر فرمایا) کہا گیا ہے کہ اس اختلاف سے مراد اصول اور عقائد میں بدعتیں پیدا کرنا ہے۔ نہ کہ فروعات اور عملیات میں۔“(۱)

علامہ عبید اللہ صاحب رحمہ اللہ کی مذکورہ عبارت سے واضح ہوا کہ اس حدیث میں وہ اختلاف مراد نہیں ہے، جو فروعی واجتہادی مسائل میں صحابہ وتابعین و ائمۂ مجتہدین، جیسے امام شافعی وامام مالک وامام ابوحنیفہ وامام احمد وامام اوزاعی وامام سفیان ثوری رحمہم اللہ وغیرہ کے زمانوں میں واقع ہوا۔

الغرض آیات واحادیث میں جس اختلاف کی مذمت وبرائی آئی ہے، اس سے پہلی قسم کا اختلاف مراد ہے یا اس سے مراد گروہ بندی و پارٹی بازی ہے، جس کی بنا پر ایک دوسرے کی تکفیر وتفسیق وتضلیل کی جائے اور ان جزوی مسائل کی بنا پر حسد و بغض رکھا جائے، یہ بلاشبہ سخت قبیح چیز ہے۔

رہا فروعی مسائل میں آرا کا اختلاف، جو قرآن وحدیث کے فہم اور ان کی تعبیر و تشریح میں تفاوت کی بنا پر واقع ہوا، وہ نہ قرآن وحدیث میں مذموم ٹھہرایا گیا، نہ

---

(۱) مرعاۃ المفاتیح: ۱/ ۲۷۰

ممنوع قرار دیا گیا۔

فروعی اختلاف رکھنے والوں کے ساتھ سلوک

اور اسی لیے فروعی اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے عداوت و دشمنی یا ایک دوسرے پر ملامت و مذمت یا طعن و تشنیع کا رویہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہے؛ بل کہ تمام ائمہ وعلما کا احترام اور عظمت کرنا چاہیے اور ان سے محبت والفت کا طریق اپنانا چاہیے۔

چناں چہ سلفِ صالحین کے یہاں یہی نقشہ نظر آتا ہے۔امام یحییٰ بن سعید تابعی رَحِمَہُ اللہُ نے بڑی حقیقت افروز بات بیان فرمائی:

”أهل العلم أهل توسعة ، و ما برح المفتون يختلفون، فيحلل هذا ، و يحرم هذا ، فلا يعيب هذا على هذا ، و لا هذا على هذا “.(۱)

(اہل علم توسع رکھنے والے ہیں اور ہمیشہ سے حضراتِ مفتیان کے مابین مسائل میں اختلاف رہا ہے کہ یہ مفتی کسی چیز کو حلال کہتے ہیں،تو دوسرے مفتی اس کو حرام قرار دیتے ہیں؛ لیکن نہ یہ ان پر کوئی عیب لگاتے ،نہ وہ ان پر کوئی نکتہ چینی کرتے ہیں۔)

لہٰذا ائمہ کے درمیان ہونے والے اختلاف کو اسی حد میں رکھنے کی کوشش ہونی چاہیے؛ لیکن اب بعض لوگوں نے اسی کو حق و باطل کا معیار قرار دے کر امت کے شیرازے کو منتشر کرنا شروع کر دیا ہے اور خود کے اختیار کردہ مسئلے و مسلک کو صحیح و درست اور دوسرے کے مسلک کو باطل قرار دینے کی مذموم کوشش کی جاتی ہے، یہاں

---

(۱) تذكرة الحفاظ:۱/۱۲۴

تک کہ ائمہ وفقہا کی توہین وتذلیل کو دین سمجھنے وسمجھانے کی فکر کی جاتی ہے، یہ غلو کی وہ صورت ہے، جس سے امت میں انتشار کا رونما ہونا یقینی بات ہے۔ حال آں کہ ہمارے خلاف ایک جانب عیسائی مشنریاں سرگرم عمل ہیں اور مسلمانوں کو دین و ایمان سے محروم کرنے اور عیسائی بنانے کی زبردست پیمانے پر کوششیں کر رہی ہیں، دوسری جانب قرآن وسنت اور اس کے علوم کو مٹانے کی سازشیں بھی مال و دولت کا ایک بڑا حصہ لگا کر کی جارہی ہیں، پھر ایک طرف دیکھو تو مختلف باطل عقائد ونظریات کے حامل مذاہب اپنے اپنے نظریات وعقائد کو پھیلانے میں لگے ہوئے ہیں، جس سے مسلمانوں کے عقائد برباد ہوتے جارہے ہیں، تو دوسری جانب تجدد پسندی و موڈرنیزم نے مسلمانوں میں کھلے عام اباحیت پسندی و آزادیٔ فکر کے جراثیم پیدا کردیے ہیں، ان سب حالات کے تناظر میں اگر ہم اپنا جائزہ لیں، تو کیا ہمارے لیے کوئی گنجائش اس کی ہوسکتی ہے کہ ہم فروعی و اجتہادی مسائل میں جن میں خود صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور سے اختلاف چلا آرہا ہے، بحث ومباحثے کا دروازہ کھولیں؟ اور ان اختلافات کو اس حد تک پہنچادیں جیسے کوئی کفر وایمان کا اختلاف ہو؟

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے اسی حالت زار پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

> ”میرے نزدیک اس جنگ وجدل کا ایک بہت بڑا سبب فروعی اور اجتہادی مسائل میں تحزب وتعصب اور اپنی اختیار کردہ راہ عمل کے خلاف کو عملاً باطل اور گناہ قرار دینا اور اس پر عمل کرنے والوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا ہے، جو اہلِ باطل اور گمراہوں کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اس پر تمام امت کا اتفاق بھی ہے اور عقلاً اس کے سوا کوئی صورت بھی دین پر عمل کرنے کی نہیں ہے کہ جو لوگ خود درجہ اجتہاد کا نہیں رکھتے، وہ

اجتہادی مسائل میں کسی امامِ مجتہد کا اتباع کریں اور جن لوگوں نے اپنے نفس کو آزادی و ہواپرستی سے روکنے کے لیے دینی مصلحت سمجھ کر ایک امامِ مجتہد کا اتباع اختیار کرلیا ہے، وہ قدرتی طور پر ایک جماعت بن جاتی ہے، اسی طرح دوسرے امامِ مجتہد کا اتباع کرنے والے ایک دوسری جماعت کی صورت اختیار کرلیتے ہیں، اگر جماعت بندی مثبت انداز میں صرف اجتہادی مسائل کی حد تک اپنی تعلیمی و عملی آسانیوں کے لیے ہو، تو نہ اس میں کوئی مضائقہ ہے، نہ کوئی تفرقہ، نہ ملت کے لیے اس میں کوئی مضرت۔

مضرت رساں اور تباہ کن ایک تو اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ اپنی رائے اور اختیار سے اختلاف رکھنے والوں کے ساتھ جنگ و جدل اور دوسرے ان فروعی مسائل کی بحثوں میں غلو کہ سارے علم و تحقیق کا زور اور بحث و تمحیص کی طاقت اور عمر کے اوقاتِ عزیز ان ہی بحثوں کی نذر ہو جائیں ....آگے چل کر فرماتے ہیں........اسی کے ساتھ دوسری بھاری غلطی ان اجتہادی مسائل میں اختلاف کے حدود کو توڑ کر تفرق و تشتت اور جنگ و جدل اور ایک دوسرے کے ساتھ استہزا و تمسخر تک پہنچ جانا ہے، جو کسی شریعت و ملت میں روا نہیں، افسوس کہ یہ سب کچھ خدمتِ علمِ دین کے نام پر کیا جاتا ہے اور جب یہ معاملہ ان علما کے متبعین عوام تک پہنچتا ہے، تو وہ اس لڑائی کو جہاد قرار دے کر لڑتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جس قوم کا جہاد خود اپنے ہی دست و بازو سے ہونے لگے، اس کو کسی غنیم کی مدافعت اور کفر و الحاد کے ساتھ جنگ کی فرصت کہاں؟'' (۱)

---

(۱) وحدتِ امت: ۱۷-۲۱

الحاصل اختلاف کی وہ قسم جس میں صرف فروعی و اجتہادی مسائل میں آرا مختلف ہوتی ہیں، اس میں نہ تشدد جائز ہے، نہ ایک دوسرے کو غلط قرار دینے کی کوشش کوئی محمود کام ہے؛ بل کہ اس میں ہمیشہ سے امت کا یہی طرزِ عمل رہا اور ہونا چاہیے کہ ایک دوسرے کا احترام وادب، ان کی خدمات وکوششوں کا اعتراف، ان کی خدمات وکارناموں سے استفادہ جاری رہے؛ ورنہ یہ وہ غلو پسندی ہے، جس کا وبال آج امت اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہی ہے۔

محض طریقِ کار کا اختلاف کوئی اختلاف نہیں

یہاں بہ طور تتمیم فائدہ ایک بات مزید عرض کر دینا مناسب ہے، وہ یہ کہ ایک اختلاف وہ ہوتا ہے، جو محض کسی کام کے طریقِ کار کے لحاظ سے پیدا ہوتا ہے کہ ایک شخص یا ایک جماعت یا ایک انجمن ایک دینی کام کے لیے اپنی سوچ وفکر سے کسی اپنی سہولت یا مصلحت یا ضرورت کے تقاضے سے ایک طریقِ کار منتخب کر لیتی ہے اور دوسرے لوگ یا دوسری جماعت اسی کام کے لیے ایک دوسرا طریقِ کار تجویز کر لیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اختلافِ طریقِ کار کو حقیقت میں اختلاف ہی نہیں کہہ سکتے، یہ ظاہراً وصورۃً اختلاف ہے، حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں؛ اس لیے اس کو اختلاف نہیں؛ بل کہ تعدد سے تعبیر کرنا مناسب ہے، جیسے تعلیم کے لیے یا اصلاح وتربیت کے لیے یا دعوت وتبلیغ کے لیے مختلف صورتوں وشکلوں سے کام کیا جا سکتا ہے اور کیا جاتا ہے؛ مگر یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ اختلافِ مذاق درحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہے؛ لہٰذا ایسے اختلاف کو اختلاف قرار دے کر اپنے طریقِ کار سے الگ دوسرا طریقِ کار رکھنے والوں کو برا بھلا کہنا یا مطعون سمجھنا یا کرنا یا ان سے نفرت وکدورت ظاہر کرنا، یہ سب غلو وتجاوز کی ناپاک شکلیں ہے، جس سے نہایت درجہ پرہیز کرنا

چاہیے؛ مگر عجیب بات ہے کہ آج امت میں اس سلسلے میں بے حد غلو وتجاوز کیا جا رہا ہے، حتی کہ بعض لوگ محض اس طریقِ کار کے اختلاف و تعدد کو یہاں تک پہنچا دیتے ہیں کہ سلام و کلام تک ایک دوسرے سے بند ہو جاتا ہے اور دوسرے طریق پر کام کرنے والوں کے ساتھ وہ رویہ اپنایا جاتا ہے، جو کسی ناجائز و حرام کام کے مرتکب لوگوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والوں کو اولاً یہ سوچنا چاہیے کہ اگر دوسرا فریق بھی ان کے بارے میں یہی رویہ اختیار کرے، تو کیا وہ اس کو گوارا کرتے ہیں؟ اور کیا دوسرے فریق کا یہ الزام کوئی حیثیت ان کے پاس رکھتا ہے کہ وہ ہمارے طریقے پر کام نہیں کرتے؟ نہیں اور ہرگز نہیں! تو پھر ان حضرات کو اس کا جواز کہاں سے مل گیا کہ اپنے نظامِ عمل و طریقِ کار پر دوسروں کو اصرار کریں اور اس کے خلاف کسی اور طریقِ کار کو قبول و برداشت نہ کریں؟ کیا اسی کا نام غلو فی الدین نہیں؟ غور کیا جائے!!!

اصولی اختلاف مذموم و ممنوع ہے

اب دیکھیے! اصولی اختلاف کا شرعی حکم کیا ہے؟ جس طرح فروعی اختلاف کو بعض لوگ اصولی اختلاف کے درجے میں رکھ کر اس کو حرام و ناجائز کہتے اور ان آیات و احادیث سے استدلال کرتے ہیں، جن میں اختلاف کی مذمت آئی ہے، اسی طرح بعض لوگ اصولی اختلاف کو فروعی اختلاف کا درجہ دے کر عجیب منطق سے کام لیتے اور اس اختلاف کو بھی جائز و روا رکھتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح فروعی اختلاف کو اصولی اختلاف کا درجہ دینا غلط و بے اعتدالی کی بات ہے، اسی طرح اصولی اختلاف کو جزئی و فروعی اختلاف کا درجہ دے کر اس کو روا رکھنا بھی صحیح نہیں؛ بل کہ ایک بنیادی غلطی ہے۔

کیوں کہ نصوص شرعیہ میں اصولی اختلاف کی دونوں قسموں کو مذموم وحرام قرار دیا گیا ہے اور اس قسم کے اختلاف پر قرآن و حدیث میں سخت وعید بھی آئی ہے۔ یہاں محض نمونے کے طور پر چند دلائل کی جانب اشارہ کرتا ہوں:

پہلی قسم کے اختلاف کے بارے میں یہ آیت وارد ہوئی ہے:

﴿وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتٰبِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ﴾ (البقرۃ: ۱۷۶)

(اور بلاشبہ وہ لوگ جنھوں نے کتاب اللہ میں اختلاف کیا، وہ بڑے دور کے جھگڑے میں پڑے ہوئے ہیں۔)

اسی طرح یہ آیت بھی اصولی اختلاف کے متعلق ہے:

﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَ أَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ إِلَّا الَّذِيْنَ أُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (البقرۃ: ۲۱۳)

(لوگ ایک ہی امت تھے پھر، اللہ نے حضراتِ انبیا خوش خبری دینے و ڈرانے والے ان کے پاس بھیجے اور ان کے ساتھ حق والی کتابیں نازل کی؛ تاکہ وہ لوگوں کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کریں، جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور اس میں اختلاف نہیں کیا؛ مگر ان ہی لوگوں نے جن کو وہ کتاب دی گئی تھی، محض آپسی ضد کی وجہ سے، جب کہ ان کے پاس واضح نشانیاں آچکی تھیں، پس اللہ نے وہ امرِ حق جس میں وہ اختلاف کرتے تھے، ان لوگوں کو بتا دیا، جو ایمان والے تھے، اللہ جس کو

چاہتا ہے؛ اسے راہ راست کی ہدایت دے دیتا ہے۔)

نیز یہ آیتِ کریمہ بھی اسی اصولی اختلاف کی مذمت بیان کر رہی ہے:

﴿وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ﴾ (البقرۃ:۲۵۳)

(اور لیکن ان لوگوں نے اختلاف کیا، پس ان میں سے کچھ ایمان لائے اور کچھ لوگوں نے کفر کیا۔)

ان آیات میں ظاہر ہے کہ وہ اختلاف مراد ہے، جس سے اسلام و کفر کا اختلاف پیدا ہوتا ہے، اس سے منع کیا گیا، اس پر وعید سنائی گئی اور اس کا رد کیا گیا ہے۔

اور اصولی اختلاف میں سے دوسری قسم: جس سے سنت و بدعت کا اختلاف پیدا ہوتا ہے، وہ بھی مذموم ہے، اس سلسلے میں احادیث وارد ہیں اور وہ مشہور حدیث، جو افتراقِ امت کے بارے میں آئی وہ سب کے سامنے ہے۔

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"افترقت اليهود على إحدى أو ثنتين، و سبعين فرقةً و تفرقت النصارى على إحدى أو ثنتين، و سبعين فرقةً و تفترق أمتي على ثلاث، و سبعين فرقةً."

(یہود اکہتر یا بہتر فرقوں میں بٹ گئے اور نصاریٰ بھی اکہتر یا بہتر فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔)

(۲) حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) سنن أبي داود: ۴۵۹۶، السنن الكبرى للبيهقي: ۱۰/۲۰۸، المستدرك للحاكم: ۱/۲۱۷، السنة لابن أبي عاصم: ٦٦

”لیأتین علی أمتي ما أتی علی بني اسرائیل حذو النعل بالنعل حتی إن کان فیهم من أتی أمه علانیة لکان في أمتي من یصنع ذلک ، وإن بني اسرائیل تفرقت علی ثنتین و سبعین ملة و تفترق أمتي علی ثلاث و سبعین ملة ، کلهم في النار إلا ملة واحدة ، قالوا: و من هي یا رسول الله ! قال: ما أنا علیه و أصحابي.“

(ضرور بالضرور میری امت پر وہ زمانہ آئے گا، جو بنی اسرائیل پر آیا تھا، جس طرح جوتا جوتے کے برابر ہوتا ہے، یہاں تک کہ اگر ان لوگوں میں کوئی ایسا تھا، جس نے اپنی ماں سے علانیہ منہ کالا کیا تھا، تو میری امت میں بھی ایسا کرنے والا ہوگا اور بلاشبہ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، جن میں سے ایک کے سوا سب کے سب جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! وہ کونسا فرقہ ہے؟ فرمایا کہ وہ فرقہ جو میرے اور صحابہ کے طریقے پر ہے۔)(۱)

(۳) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

” تفترق هذه الأمة علی ثلاث و سبعین فرقة ، کلهم في النار إلا واحدة ، قالوا: وما هي تلک الفرقة ؟ قال: ما أنا علیه و أصحابي.“

(یہ امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، سوائے ایک کے وہ سب

(۱) سنن الترمذي:۲۶۴۱، المستدرک للحاکم:۱/۲۱۸

کے سب جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ نے معلوم کیا کہ وہ کونسا فرقہ ہے؟ تو فرمایا کہ جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقے پر قائم ہے)(۱)

(۴) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ألا إن من كان قبلكم من أهل الكتاب افترقوا على ثنتين و سبعين ملة و إن هذه الأمة ستفترق على ثلاث و سبعين ملة ، ثنتان و سبعون في النار و واحدة في الجنة وهي الجماعة'' - وفي رواية زيادة - و إنه سيخرج من أمتي أقوام تجارى بهم تلك الأهواء كما يتجارى الكلب لصاحبه ، لا يبقى منه عرق ، و لا مفصل إلا دخله.''

(خبردار رہو! تم سے پہلے جو اہلِ کتاب گزرے ہیں، وہ بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے اور یہ امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، بہتر جہنم میں جائیں گے اور ایک جنت میں اور وہ جماعت ہے.....ایک روایت میں یہ اضافہ ہے.....اور میری امت میں ایسے لوگ ظاہر ہوں گے، جن میں یہ خواہشات اس طرح رچی وبسی ہوئی ہوں گی، جیسے کہ کتے کاٹے کا زہر کہ کوئی رگ اور کوئی جوڑ ایسا نہیں رہتا، جس میں یہ بیماری نہ گھس جائے۔)(۲)

---

(۱) المعجم الأوسط للطبراني:۵/۱۳۷، المعجم الصغير للطبراني:۲/۳۰

(۲) سنن أبي داود:۴۵۹۷، السنة لابن أبي عاصم:۲،مسند الشاميين:۲/۱۰۸، مسند أحمد: ۱۶۹۷۹، المستدرك للحاكم: ۱/۲۱۸، المعجم الكبير للطبراني: ۱۴/۳۰۱

(۵) نیز ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" أوصيكم بتقوى الله ، والسمع والطاعة ، وإن كان عبدا حبشيا ، فإنه من يعش منكم بعدي ، فسيرى اختلافا كبيرا فعليكم بسنتي و سنة الخلفاء الراشدين المهديين ، تمسكوا بها و عضوا عليها بالنواجذ ، و إياكم و محدثات الأمور ، فإن كل محدثة بدعة ، و كل بدعة ضلالة ."

(میں تمھیں اللہ سے ڈرنے اور امیر کی سمع و طاعت کی وصیت کرتا ہوں، اگر چہ کہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو؛ کیوں کہ میرے بعد تم میں سے جو رہے گا، وہ بڑا اختلاف دیکھے گا، پس تم پر میرا اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کا طریقہ لازم ہے، اس کو مضبوط تھام لو اور اپنے دانتوں سے کس کے پکڑ لو اور نئی نئی باتوں سے بچو؛ کیوں کہ (دین میں) ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔)(۱)

(٦) اور امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے اور امام ترمذی و امام بزار و امام ابویعلی رحمہم اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور امام ابویعلی رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک بار اللہ کے رسول ﷺ باہر نکلے اور ہم لوگ تقدیر کے بارے میں بحث کر رہے تھے، پس آپ غصہ ہو گئے، یہاں تک کہ آپ کا چہرہ ایسا سرخ ہو گیا، گویا کہ

---

(۱) سنن ابن ماجة:۴۲، مسند بزار: ۴۲۰۱، المستدرک للحاکم: ۳۲۹، مسند أحمد:۱۷۱۸۴، السنة للمروزي:٦۹، المعجم الكبير:۱۵۰۲۱، السنة لابن أبي عاصم: ۵۴، شعب الإيمان:۷۱۱۰

آپ کے گالوں میں انار کے دانوں کا رس نچوڑ دیا گیا ہے۔ پس آپ نے فرمایا:

"أبهذا أمرتم ، أم بهذا أرسلت إليكم ؟ إنما هلك من كان قبلكم حين تنازعوا في هذا الأمر ، عزمت عليكم عزمت عليكم ألا تنازعوا فيه."

(کیا اسی کا تمھیں حکم دیا گیا؟ یا میں اسی کو دے کر تمھارے پاس بھیجا گیا ہوں؟ تم سے پہلے لوگ اسی وقت ہلاک ہوئے، جب انھوں نے اس معاملے میں جھگڑا کیا، میں تم کو قسم دیتا ہوں، میں تم کو قسم دیتا ہوں کہ اس میں جھگڑا نہ کرو۔)(۱)

(۷) اور حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے کے پاس قرآن میں بحث کر رہے تھے، ایک شخص ایک آیت نکال رہا تھا اور دوسرا دوسری آیت، پس آپ باہر نکلے (اور غصے کی وجہ سے ایسے سرخ ہو رہے تھے) گویا آپ کے گالوں میں انار کے دانے کا رس گھول دیا گیا ہو، پھر فرمایا: اے لوگو! کیا اسی لیے تم پیدا کیے گئے ہو یا اسی کا تم کو حکم دیا گیا ہے؟ میرے بعد کافر بن کر ایک دوسرے کی گردن نہ مارو۔"(۲)

ان احادیث میں جس اختلاف و افتراق کا ذکر ہے، اس سے مراد وہ اختلاف ہے، جس سے انسان سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم واصحابِ رسول رضی اللہ عنہم کی شاہ راہ سے کٹ جاتا اور خواہشات و بدعات کے دلدل میں گر جاتا ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ اس قسم کے اختلاف کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں؛ بل کہ یہ

---

(۱) مسند أحمد: ۶۸۴۵، سنن الترمذي: ۲۱۳۳، مسند بزار: ۱۰۰۶۳، مسند أبي يعلى: ۳۱۲۱

(۲) المعجم الأوسط للطبراني: ۸/۲۲۵

ممنوع و مذموم ہے، جس سے بچنا واجب و لازم ہے؛ مگر یہاں بھی بعض لوگوں کا رویہ انتہائی حیرت ناک یہ ہے کہ وہ اس قسم کے اختلاف کو ہلکا و خفیف ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کو فروعی اختلاف کے درجے میں رکھتے ہیں۔

اس قسم کی ذہنیت ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقے میں یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ایک مرتبہ بنگلور کی ایک مسلم کالج میں کسی تقریب کے موقعے سے ایک مشہور و معروف ہندو سادھو کو مدعو کیا گیا اور کالج کے طلبہ کے سامنے ان کی تقریر کرائی گئی، پھر کالج کے ایک ذمے دار نے اپنے خطاب میں ان سے کہا: ''ہمارے مذہب اور آپ کے مذہب کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہیں ہے، صرف عبادت کے طریقے کا فرق ہے'' جب اس جلسے کی رپورٹ اخبارات میں شائع ہوئی، تو احقر نے اسی وقت اس کا نوٹس لیا اور اس کا جواب لکھ کر اخبارات کو بھیجا، بعض اخبارات نے شائع کیا اور بعض جو اس قسم کی ذہنیت کے مؤید ہیں، انھوں نے شائع نہیں کیا۔ اس واقعے سے اندازہ کیجیے کہ اس قسم کی ذہنیت اسلام و کفر کے مابین بھی اتحاد و اتفاق کی قائل ہو گئی، کیا کوئی معمولی سے معمولی مسلمان سے بھی یہ بات پوشیدہ ہے کہ اسلام اور بتوں کی پرستش کا کوئی جوڑ و اتحاد ممکن نہیں؟ اور یہ کہ توحید و رسالت و آخرتِ اسلام کے وہ بنیادی عقائد ہیں، جن کو مانے بغیر کوئی نجات کا تصور نہیں کر سکتا اور یہ بھی معلوم ہے کہ ہندو لوگوں میں ان عقائد کا کوئی تصور نہیں، تو پھر دونوں ایک کیسے ہو سکتے ہیں؟ یہ بات تو کوئی بے عقلی کا شکار مریض کہہ سکتا ہے یا کوئی دین اسلام سے یک لخت جہالت کا بیمار۔ بہ ہر حال اس سے اس قسم کے لوگوں کا غلو، جو دین میں انتہائی درجے کا فساد پیدا کرتا ہے، ظاہر ہوتا ہے۔

لہٰذا اس قسم کے اختلاف کو معمولی کہا جا سکتا ہے، نہ قابلِ قبول ٹھہرایا جا سکتا ہے؛ بل کہ یہ شدید و قبیح اختلاف ہے، جس سے اختلاف کرنا واجب و لازم ہے؛ اسی لیے

سلفِ صالحین نے ہمیشہ سے اس قسم کے اختلاف کا رد کیا، جس کی تفصیل میری کتاب ''امت میں اعتقادی و عملی بگاڑ اور علمائے امت کی ذمے داری'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اصول میں اختلاف کرنے والوں کے ساتھ کیا رویہ ہو؟

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ اصولی اختلاف مذموم ہے، تو سوال یہ ہے کہ اصولی اختلاف کرنے والوں کے ساتھ ہمارا کیا سلوک ہونا چاہیے؟ کیا ان سے ہم نوائی کرتے ہوئے ان کے اختلاف کو معمولی قرار دینا چاہیے یا یہ کہ اس اختلاف کا نوٹس لینا چاہیے؟ اور یہ کہ رواداری کے حدود کیا ہیں؟

خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک عقیدے و مسلکِ اہلِ سنت کا تعلق ہے، اس میں ہمارے اکابر و سلف نے کوئی تساہل و تغافل یا مداہنت کو روا نہیں رکھا؛ البتہ آپسی معاملات و معاشرت کی حد تک رواداری کو اس شرط کے ساتھ روا رکھا کہ اس سے کوئی دینی نقصان نہ ہو۔ یہاں اجمالاً چند دلائل کی جانب اشارہ کردینا کافی ہوگا۔

اس سلسلے میں قرآن کریم نے ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ إِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ﴾ (المجادلۃ: ۲۲)

(جو لوگ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، آپ ان کو نہیں پائیں گے کہ وہ ایسوں سے دوستی رکھیں، جو اللہ اور اس کے رسول کے مخالف ہیں، اگرچہ کہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا کنبے کے لوگ ہی کیوں نہ ہوں۔)

ایک جگہ فرمایا ہے:

﴿وَلَا تَرْكَنُوٓا إِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ أَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ﴾ (هُوْدٌ :١١٣)

(اور مت جھکو ان لوگوں کی جانب جو ظالم ہیں، کہیں تم کو بھی دوزخ کی آگ نہ چھو لے؟)

امام قرطبی رَحِمَہُ اللّٰہُ اس کے تحت لکھتے ہیں:

"والصحيح في معنى الآية أنها دالة على هجران أهل الكفر والمعاصي من أهل البدع وغيرهم فإن صحبتهم كفر أو معصية إذ الصحبة لا تكون إلا عن مودة."

(اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں صحیح قول یہ ہے کہ یہ آیت اہلِ کفر و اہلِ معصیت، بدعتی وغیرہ لوگوں سے الگ رہنے پر دلالت کرتی ہے؛ کیوں کہ ان لوگوں کی صحبت یا تو کفر ہے یا معصیت؛ کیوں کہ کسی کی صحبت اس کی محبت کی وجہ ہی سے ہوتی ہے۔)(١)

نیز احادیث میں اس کو ایمان کا کمال قرار دیا گیا ہے کہ محبت و بغض اللہ کے لیے رکھا جائے۔

حضرت ابو امامہ باہلی اور حضرت معاذ بن انس جہنی رضی اللہ عنہما سے ایک حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"من أعطى للّٰه و منع للّٰه و أحب للّٰه و أبغض للّٰه فقد استكمل إيمانه."

(جو اللہ کے لیے دے اور اللہ ہی کے لیے منع کرے اور اللہ ہی کے

---

(١) تفسير القرطبي:١٠٨/٩

لیے کسی سے محبت رکھے اور اللہ ہی کے لیے کسی سے بغض رکھے؛ تو اس کا ایمان مکمل ہو گیا۔)(۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ کفر و شقاق سے محبت نہیں رکھی جا سکتی؛ بل کہ ان سے بغض رکھنا لازمی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ان کے ساتھ معاملات و معاشرت میں رواداری و اخلاق کا برتاؤ رکھا جائے گا۔

اسی لیے علمائے اہلِ سنت نے تصریح کی ہے کہ اہلِ بدعت و گمراہ لوگوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی گنجائش نہیں۔

امام محی السنۃ بغوی رَحِمَہُ اللّٰہُ کہتے ہیں:

”وَ قَدْ مَضَتِ الصَّحَابَةُ وَالتَّابِعُوْنَ وَ أَتْبَاعُهُمْ وَ عُلَمَاءُ السُّنَنِ عَلٰى هٰذَا مُجْمِعِيْنَ مُتَّفِقِيْنَ عَلٰى مُعَادَاةِ أَهْلِ الْبِدَعِ وَمُهَاجَرَتِهِمْ.“(۲)

(حضراتِ صحابہ و تابعین و تبع تابعین اور علمائے اہلِ سنت سب کے سب اہلِ بدعت سے عداوت و دوری رکھنے پر متفق و متحد ہیں۔)

امام شاطبی رَحِمَہُ اللّٰہُ کہتے ہیں:

”إِنَّ فِرْقَةَ النَّجَاةِ وَ هُمْ أَهْلُ السُّنَّةِ مَأْمُوْرُوْنَ بِعَدَاوَةِ أَهْلِ الْبِدَعِ ، وَ التَّشْرِيْدِ بِهِمْ ، وَ التَّنْكِيْلِ بِمَنْ انْحَاشَ إِلٰى جِهَتِهِمْ ، وَ نَحْنُ مَأْمُوْرُوْنَ بِعَدَاوَتِهِمْ ، وَ هُمْ مَأْمُوْرُوْنَ بِمُوَالَاتِنَا ، وَ الرُّجُوْعِ إِلَى الْجَمَاعَةِ.“(۳)

(۱) سنن الترمذي: ۲۵۲۱، سنن أبي داود : ۴۶۸۱، المستدرک للحاکم: ۲۶۹۴، المعجم الكبير للطبراني: ۱۸۸/۲۰

(۲) شرح السنة: ۲۲۷/۱

(۳) الاعتصام: ۱۲۰/۱

(نجات پانے والا فرقہ، وہ اہلِ سنت ہیں، اہلِ بدعت سے عداوت رکھنے، ان سے علاحدگی اختیار کرنے اور جو لوگ ان کی جانب مائل ہیں، ان کو سزا دینے کے مأمور ہیں اور ہمیں ان سے عداوت رکھنے کا اور ان کو ہم سے دوستی رکھنے اور اہلِ سنت والجماعت کی جانب رجوع کرنے کا حکم ہے۔)

امام ابوعثمان اسماعیل الصابونی ''عقیدۃ السلف'' میں لکھتے ہیں:

''وَ اتَّفَقُوْا مَعَ ذٰلِکَ عَلَی الْقَوْلِ بِقَهْرِ أَهْلِ الْبِدَعِ ، وَ إِذْلَالِهِمْ ، وَ إِخْزَائِهِمْ ، وَ إِبْعَادِهِمْ ، وَ إِقْصَائِهِمْ ، وَ التَّبَاعُدِ مِنْهُمْ ، وَ مِنْ مُصَاحَبَتِهِمْ ، وَ مُعَاشَرَتِهِمْ ، وَالتَّقَرُّبِ إِلَی اللّٰهِ تَعَالٰی بِمُجَانَبَتِهِمْ وَ مُهَاجَرَتِهِمْ.''(۱)

(اسی کے ساتھ اہلِ سنت نے اہلِ بدعت کے مقہور و ذلیل و رسوا کرنے اور اپنے سے دور کرنے اور ان کو دور رکھنے، ان کے ساتھ مصاحبت و معاشرت اختیار نہ کرنے اور ان سے علاحدگی کے ذریعے اللہ کا قرب پانے پر اتفاق کیا ہے۔)

ان تمام حوالجات سے مسلکِ اہلِ سنت کی یہ وضاحت سامنے آگئی کہ اصولی اختلاف رکھنے والوں سے اختلاف کیا جائے گا اور ان سے اتفاق کرنا جائز نہیں؛ بل کہ قرآن وحدیث کے خلاف ہے۔

اختلاف تو ہو؛ مگر بہ طریقِ احسن

البتہ یہاں ایک اور بات پر توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں، وہ یہ کہ مختلف فرقوں اور ان کے باطل و غلط نظریات سے اختلاف کرنا اور ان سے اتفاق نہ کرنا، تو لازم

(۱) عقیدۃ السلف:۳۹

ہے؛ لیکن اس تردید واختلاف میں وہ صورت اختیار کرنا چاہیے، جو قرآن وسنت نے ہمیں تعلیم دی ہے اور اسوۂ نبوی نے فراہم کیا ہے؛ کیوں کہ قرآنِ کریم نے ہمیں ایسے وقت کے لیے ﴿ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ﴾ کی تعلیم دی ہے کہ اگر بحث ومباحثے ومناظرے کی نوبت آجائے تو اچھے انداز سے مناظرہ ومباحثہ کرو۔ اس آیت کی تفسیر میں علمائے تفسیر نے لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ مباحثہ نرمی و خیر خواہی اور عمدہ خطاب سے ہونا چاہیے۔

مفسرِ قرآن علامہ ابو حیان رَحِمَہُ اللّٰہُ نے " البحر المحیط" میں اس کی تفسیر ان الفاظ سے لکھی ہے:

"و جادلهم بالتي هي أحسن طرق المجادلة من الرفق واللين من غير فظاظة ولا تعنيف."

(اور ان سے مباحثہ کرو! اس عمدہ و بہتر طریقے سے جس میں بجائے سختی و درشتی کے نرمی وملاطفت ہو۔) (۱)

اور یہی بات علامہ بیضاوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے بھی مزید وضاحت سے اس کی تفسیر میں بیان کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"بالطريقة التي هي أحسن طرق المجادلة من الرفق واللين وإيثار الوجه الأيسر والمقدمات التي هي أشهر فإن ذلک أنفع في تسكين لهبهم و تبيين شغبهم."

(اور ان سے مباحثہ کرو اس عمدہ و بہتر طریقے سے جس میں نرمی و ملاطفت ہو اور آسان صورت اور مشہور مقدمات اختیار کیے جائیں؛ کیوں کہ یہ ان (مخالف لوگوں) کے بھڑکاؤ کی تسکین اور ان کے ہنگامے

(۱) البحر المحیط: ۶/۶۱۳

کوواضح کرنے میں زیادہ نفع بخش ہے۔)(۱)

الغرض! اصولی اختلاف کرنے والوں سے اختلاف تو کیا جانا چاہیے، مگر ایسا نہیں کہ ان کو گالی دی جائے یا طعن و تشنیع سے کام لیا جائے یا گری ہوئی زبان استعمال کی جائے؛ بل کہ قرآن اور انبیا کی تعلیم کے مطابق نرمی و سنجیدگی، علمی دلائل و محکم براہین سے کام لیا جائے؛ ورنہ یہ بھی ایک قسم کا غلو فی الدین ہوگا۔

دین میں تشدد کا مظاہرہ

چھٹی صورت غلو فی الدین کی یہ ہے کہ دین میں تعمق و تشدد کا مظاہرہ کیا جائے، جیسے شریعت نے جن امور کی اجازت دی اور ان کو مباح و حلال قرار دیا، ان میں تشدد کیا جائے اور ان سے حرام کی طرح بچنے کی کوشش کی جائے۔

حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" لا تشددوا على أنفسكم ، فيشدد عليكم ، فإن قوما شددوا على أنفسهم فشدد الله عليهم ، فتلك بقاياهم في الصوامع والديار."(۱)

(اپنی جانوں پر سختی نہ کرو کہ تم پر سختی نہ کر دی جائے؛ کیوں کہ ایک قوم نے اپنی جانوں پر سختی کی، تو اللہ نے اس پر بھی سختی کر دی، پس یہ ان ہی کے بقایا ہیں جو ان گرجاؤں اور کٹیوں میں ہیں۔)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے "حجة الله البالغة" میں فرمایا: دین میں تحریف کا ایک سبب یہ تشدد بھی ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ

---

(۱) تفسير البيضاوي:۳/۴۲۷

(۲) سنن أبي داود:۴۹۰۶، مسند أبي يعلى:۳۶۹۴

عبادات شاقہ کو اختیار کیا جائے، جس کا شارع نے حکم نہیں دیا، جیسے ہمیشہ روزہ رکھنا یا ہمیشہ رات بھر نماز میں کھڑے رہنا یا نکاح نہ کرنا اور آداب وسنن کا واجبات کی طرح التزام کرنا، حدیث میں اللہ کے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہما کو اس سے منع کیا اور فرمایا: جو دین پر غالب آتا ہے، اس پر دین غالب ہو جاتا ہے" اور اگر یہ تشدد تعلق کرنے والا کوئی استاذ و سردار ہوتا ہے؛ تو لوگ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ شرع کا حکم ہی یہ ہے اور یہ تشدد یہود و عیسائیوں کے رہبان کی بیماری ہے۔(۱)

یہی وہ تشدد تھا، جس نے عیسائی قوموں کو رہبانیت کی غلو آمیز شکلوں و صورتوں کو اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا، اسی طرح ہندو جوگیوں و سادھوؤں نے بھی اسی غلو کی وجہ سے بہت سی بے حقیقت و بے جان رسومات اور خلافِ عقل مجاہدات کو اختیار کر کے خود کو ایک عذاب میں مبتلا کر لیا تھا۔کبھی سایہ لینے سے گریز ہے، تو کبھی کھانے پینے سے احتراز، کوئی کپڑوں کو خیر باد کہہ چکا ہے، یہاں تک کہ مادرزاد ننگا بنا ہوا ہے، تو کوئی الٹا لٹک رہا ہے، کوئی کھڑا ہے، تو وہ کھڑا ہے، کوئی پڑا ہے، تو پڑا ہے، کوئی ایک پیر پر کھڑا ہوا ہے، کوئی گھٹنوں کے بل کھڑا ہوا ہے۔

جاہل و غالی صوفیوں و زاہدوں کی رہبانیت

یہی حال ان جاہل و غالی صوفیوں کا ہے، جنھوں نے ان کی دیکھا دیکھی اسی قسم کی ریاضتوں و مجاہدات کو اپنا لیا ہے اور اس کو عین دین سمجھتے اور قرار دیتے ہیں اور جاہل عوام بھی ان جاہل صوفیا کو دیکھ کر اسی کو دین سمجھتے اور اس کے خلاف کو دین سے خارج قرار دیتے ہیں۔

(۱) حجة الله البالغة:۱/۲۵۴

حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''طریقِ سنت سے ہٹ کر جو ریاضتیں و مجاہدے لوگ کرتے ہیں، ان کا کچھ وزن و اعتبار نہیں، ایسی ریاضتیں یونان کے فلسفی اور ہندوستان کے برہمن اور جوگی بھی کرتے ہیں؛ لیکن سوائے خسارے اور گمراہی کے ان کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔'' (۱)

ایک اور مکتوب میں آپ تحریر کرتے ہیں:

''باطل لوگوں کی وہ ریاضتیں اور مجاہدے، جو شریعتِ روشن کے موافق نہیں ہیں، سوائے خسارے کے کچھ فائدہ نہیں دیتیں اور ان سے سوائے حسرت و ندامت کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔'' (۲)

لٰہذا طریقِ سنت و دائرۂ شریعت میں مجاہدہ ہونا چاہیے، غیر شرعی مجاہدات و ریاضات خود کو مشقت میں ڈالنے کے مترادف ہے، جس کو اسلام نے غلو قرار دیا ہے۔

حلال سے پرہیز کا غلو

اسی تشدد میں یہ بھی داخل ہے کہ حلال چیزوں سے پرہیز و احتیاط کی جائے، جیسا کہ خود قرآنِ کریم میں اس کا رد کرتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴾ (المائدۃ: ۲)

(اے ایمان والو! تم ان پاک چیزوں کو حرام نہ ٹھیرالو، جن کو اللہ نے

---

(۱) دفتر اول: مکتوب: ۲۲۱

(۲) مکتوبات: مکتوب نمبر: ۲۰۶

تمھارے لیے حلال کیا ہے اور حد سے آگے نہ بڑھو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ حد سے گزر جانے والوں کو پسند نہیں کرتے اور تم ان چیزوں میں سے کھاؤ جو اللہ نے تم کو حلال و پاک عطا کی ہیں اور اللہ سے ڈرو، جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔)

اس آیت کی تفسیر ہم نے اوپر کردی ہے، جس میں یہ بھی ذکر کیا گیا کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے اوپر بعض چیزوں کے پرہیز کو لازم کرلیا، تو یہ آیت نازل ہوئی، اور اس سے ان حضرات کو منع کیا گیا۔

لیکن اس میں تھوڑی سی تفصیل ہے، جس کو حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ نے ''معارف القرآن'' میں لکھا ہے، وہ یہ ہے:

''کسی چیز کو حرام قرار دینے کے تین درجے ہیں: ایک یہ کہ اعتقاداً اس کو حرام سمجھ لیا جائے، دوسرے یہ کہ قولاً کسی چیز کو اپنے لیے حرام کرلے، مثلاً قسم کھالے کہ ٹھنڈا پانی نہ پیوں گا یا فلاں قسم کا حلال کھانا نہ کھاؤں گا یا فلاں جائز کام نہ کروں گا، تیسرے یہ کہ اعتقاد و قول تو کچھ نہ ہو، محض ہمیشہ کے لیے کسی حلال چیز کو چھوڑ دینے کا عزم کرلے۔

(۱) پہلی صورت میں اگر اس چیز کا حلال ہونا قطعی دلائل سے ثابت ہو، تو اس کا حرام سمجھنے والا قانونِ الٰہی کی صریح مخالفت کی وجہ سے کافر ہو جائے گا۔

(۲) اور دوسری صورت میں اگر الفاظِ قسم کھا کر اس چیز کو اپنے اوپر حرام قرار دیا ہے، تو قسم ہو جائے گی اور اس کا حکم یہ ہے کہ بلاضرورت ایسی قسم کھانا گناہ ہے، اس پر لازم ہے کہ اس قسم کو توڑ دے اور کفارۂ قسم ادا کرے۔

(۳) تیسری قسم جس میں اعتقاد وقول سے کسی حلال کو حرام نہ کیا ہو؛ بل کہ عمل میں ایسا معاملہ کرے جیسا حرام کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ دائمی طور پر اس کے چھوڑنے کا التزام کرے، اس کا حکم یہ ہے کہ حلال کو چھوڑنا ثواب سمجھتا ہے، تو یہ بدعت ورہبانیت ہے، جس کا گناہِ عظیم ہونا قرآن وسنت میں منصوص ہے، اس کے خلاف کرنا واجب اور ایسی پابندی پر قائم رہنا گناہ ہے، ہاں اگر ایسی پابندی بہ نیتِ ثواب نہ ہو؛ بل کہ کسی دوسری وجہ سے ہو، مثلاً کسی جسمانی یا روحانی بیماری کے سبب سے کسی خاص چیز کو دائمی طور پر چھوڑ دے، تو اس میں کوئی گناہ نہیں، بعض صوفیائے کرام اور بزرگوں سے حلال چیزوں کے چھوڑنے کی جو روایات منقول ہیں، وہ سب اسی قسم میں داخل ہیں کہ انھوں نے ان چیزوں کو مضر سمجھا یا کسی بزرگ نے مضر بتلایا؛ اس لیے بہ طور علاج چھوڑ دیا، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔" (۱)

تقوے کے نام پر ہر چیز کو مشکوک سمجھنے کی بیماری

اسی تعمق وتشدد میں یہ بھی داخل ہے کہ تقوے کے نام پر ہر چیز کو مشکوک یا حرام سمجھنے لگے اور ان سے پرہیز کرنے لگے۔

جیسے ایک صاحب کا قصہ لکھا ہے کہ وہ حلال روزی کی تلاش میں نکلے اور ایک ایسے شخص کے پاس پہنچے، جن کے بارے میں ان کو خبر ملی تھی کہ ان کے پاس حلال روزی ہے۔ جب ان کے پاس گئے اور کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے پاس حلال روزی ہے، کسی اور کے پاس حلال نہیں ہے؛ اس لیے آپ کے پاس آیا ہوں، تو وہ صاحب کہنے لگے کہ ہاں! میرے پاس حلال روزی تھی؛ لیکن چند روز سے حلال

(۱) معارف القرآن: ۲۲۰/۳

میرے پاس بھی نہیں ہے؛ کیوں کہ اتفاق سے میرا بیل دوسرے کے کھیت میں بلا اجازت چلا گیا اور اس کے پیروں میں اس کھیت کی مٹی لگ کر میرے کھیت میں آ گری، اس لیے میرا یہ کھیت بھی حرام کا ہو گیا ہے۔

دنیا کی سب چیزوں کو حرام سمجھنا ایک خبط تو ہو سکتا ہے، اس کا نام تقوی واحتیاط نہیں؛ لہٰذا اس قسم کا تعمق وتشدد اسلام میں روا نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کے واقعات ان لوگوں کے ہیں، جو مغلوب الحال تھے؛ اس لیے وہ معذور تھے؛ لیکن معذوروں ومغلوب الحال لوگوں کی اتباع کا حکم نہیں ہے۔

توکل کا غلط مفہوم اور اس کے مفاسد

اسی طرح تشدد وتعمق کی ایک صورت یہ ہے کہ بعض لوگ اسباب وتدابیر کے ترک کرنے کو توکل سمجھتے اور اسباب وتدابیر سے پرہیز کرتے ہیں؛ بل کہ بعض دین دار حلقوں میں یہاں تک کہا وسنا جاتا ہے کہ اسباب کی نفی کرو، اسباب کی جانب نظر نہ کرو اور یہ کہا جاتا کہ جب تک اسباب سے نظر نہیں ہٹیں گے، اس وقت تک انسان کا ایمان کامل نہیں ہوتا، نیز اس قسم کے حلقوں میں اسباب کو اختیار کرنے اور اس کا اہتمام کرنے کو خلافِ توکل اور ان لوگوں کو دنیا دار سمجھنے وسمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

توکل کے اس غلط مفہوم کے دلوں میں سما جانے کی وجہ سے ایک جانب بعض لوگوں میں بطالت وبیکاری کو دین داری سمجھنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے، یہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسباب کو ترک کر کے وہ بہت بڑی نیکی وعبادت سر انجام دے رہے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ بطالت وتعطل کو دین داری سمجھنا عین بے دینی کی بات ہے۔

میں نے ایک نوجوان کو دیکھا، جو اپنا سارا کام وکاروبار چھوڑ کر مسجد میں رہنے لگا تھا اور مسجد کے حوض سے پانی اور دکان سے بریڈ لے کر زندگی گزار رہا تھا، اس کے ماں باپ اور اہلِ خاندان اس کو سمجھاتے تھے کہ کاروبار میں لگ جائے؛ مگر وہ یہ جواب

دیتا تھا کہ کام دھندے میں لگنا دنیا داری ہے اور توکل کے خلاف ہے، اللہ کا حکم نہیں ہے، اللہ کا حکم یہ ہے کہ تم اللہ پر بھروسہ کرو، وہ تم کو کھلائے گا، پلائے گا اور سارے کام بنا دے گا۔ اس نوجوان کے والد میرے سے تعلق رکھتے تھے، انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ اس کو ذرا سمجھائیں۔ میں نے بھی اس کو سمجھانا چاہا؛ مگر اس کے ذہن میں کسی نے اس قدر پختگی کے ساتھ توکل کا غلط مفہوم بٹھا دیا تھا کہ وہ اس کے خلاف کسی بات کو اور کسی کی بات کو سننے بھی تیار نہیں ہوا اور ہم سب کو گمراہ قرار دینے لگا۔

اور دوسری جانب اسباب کو اختیار کرنے والوں کے خلاف ذہن بنتا جاتا ہے اور یہ لوگ ان سے نہ صرف بدگمان ہوتے ہیں؛ بل کہ ان کو گمراہ سمجھتے اور قرار دیتے ہیں اور اس کی زد میں بڑے بڑے علما و اکابرینِ امت بھی آجاتے ہیں۔ ہم نے بعض ایسے متوکلین کو دیکھا ہے، جو علمائے کرام و مشائخِ عظام کو اس لیے دنیا پرست ٹھیراتے ہیں کہ وہ حضرات مدارس و دینی مناصب پر تنخواہ لیتے ہیں؛ حال آں کہ نہ تنخواہ لینا توکل کے خلاف ہے اور نہ اسباب کا اختیار کرنا، اس کے منافی ہے؛ مگر کیا کیا جائے کہ لوگوں کو غلو کی بیماری نے اس روش پر ڈال دیا ہے۔

اور تیسری جانب یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض حضرات دینی دعوت کے نام پر لوگوں کو اس بات کے لیے ابھارتے ہیں کہ وہ اپنا کاروبار و مصروفیات کو ترک کر دیں اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ کوئی کاروبار سنبھالنے والا نہیں ہے، تو کہہ دیتے ہیں کہ کیا اسباب پر ایمان رکھتے ہو یا اللہ پر؟ اس سے وہ سمجھتا ہے کہ اسباب کا اختیار کرنا خلافِ توکل و خلافِ ایمان ہے؛ لہٰذا وہ کاروبار چھوڑ کر جاتا ہے اور اس کے بیوی بچے یہاں پریشانی کی حالت میں کبھی بے ایمانی کی باتیں کرنے لگتے ہیں؛ حتی کہ خود دین ہی کو یا دین داروں کو غلط خیال کر بیٹھتے ہیں۔

یہ ساری خرابیاں توکل کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے اور دین کے بارے میں تشدد و تعلق

اور غلو کا نتیجہ ہے۔

توکل کی حقیقت

لہٰذا توکل کی حقیقت سمجھ لینا چاہیے ۔ یاد رہے کہ توکل علی اللہ، جس کی اسلام نے تعلیم دی اور اس کو فرض قرار دیا اور اسے مسلمانوں کا ایک امتیازی وصف ٹھہرایا ہے، اس کی حقیقت مطلقاً ترکِ اسباب وترکِ تدابیر نہیں ہے؛ بل کہ توکل کی حقیقت یہ ہے کہ اپنے کاموں کا اللہ تعالیٰ کو کارساز حقیقی سمجھتے ہوئے ان کو اسی کے حوالے کر دیا جائے اور اسی پر بھروسہ رکھا جائے کہ وہی سب کاموں کو بنانے والا ہے ۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے توکل کی تعریف یہ کی ہے: "اعتماد القلب علی الوکیل وحدہ" (دل کا صرف اپنے وکیل پر بھروسا کرنا۔)

لہٰذا توکل یہ ہے کہ جن مواقع میں اسباب ہمارے اختیار میں نہیں، وہاں بلا اسباب اللہ پر بھروسہ کیا جائے اور جن مواقع پر اسباب و تدابیر اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے، وہاں اپنی بساط بھر کوشش کے ساتھ اسباب و تدابیر اختیار کر کے اس کے اوپر مرتب ہونے والے اثرات و نتائج کو اللہ کے حوالے کر دے اور یہ سمجھے کہ جو ہوتا ہے وہ اللہ کی مشیت و ارادے سے ہوتا ہے، محض اسباب و تدابیر سے نہیں ہوتا ؛ کیوں کہ بہت سارے مواقع پر انسان اسباب و تدابیر اختیار کرتا ہے؛ مگر اس کو کوئی کامیابی نہیں ہوتی اور بعض وقت ایک انسان کو ان میں کامیابی ہو جاتی ہے اور دوسرے کو ان ہی اسباب میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

الغرض توکل ترکِ اسباب کا نام نہیں ؛ بل کہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اسباب کو اختیار کرنے کے بعد یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ ہی اسباب کو کامیابی کی منزل سے ہمکنار کرتے ہیں اور اگر وہ چاہیں، تو یہ اسباب ناکام بھی ہو سکتے ہیں، کیوں کہ وہی

موثرِ حقیقی ہیں۔

اسباب کو اختیار کرنے کی تعلیم

قرآن وسنت اور سیرت نبوی واحوالِ صحابہ، نیز اقوال وآثارِ سلف سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ اسلام نے جہاں ہمیں اللہ پر توکل کا حکم دیا ہے، وہیں اسباب کے اختیار کرنے کی بھی تعلیم دی ہے۔

مثلاً اللہ تعالیٰ نے نمازِ خوف میں جو جنگ وغیرہ کے موقعے پر پڑھی جاتی ہے، اس میں ایک جماعت کو نماز پڑھنے اور دوسری کو نگرانی وحفاظت کی ذمے داری اٹھانے؛ نیز ہتھیار پہن کر نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ اس سلسلے کی آیت کا ترجمہ سن لیجیے:

> ”اور جب آپ ان میں ہوں اور ان کے لیے نماز قائم کریں، تو چاہیے کہ ان میں کی ایک جماعت آپ کے ساتھ کھڑی ہو جائے اور وہ لوگ اپنے ہتھیار لیے رہیں، پھر جب وہ سجدہ کر چکیں، تو وہ تمھارے پیچھے ہو جائیں اور دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی ہے، وہ آ جائے اور آپ کے ساتھ نماز پڑھ لے اور یہ لوگ بھی اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار اٹھائے رکھیں، کافروں کی خواہش ہی یہ ہے کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اور اپنے سامان سے ذرا غافل ہو جاؤ، تو یہ تم پر یک بارگی ہی ٹوٹ پڑیں۔“ (النساء: ۱۰۲)

جہاد کے لیے سامان تیار کرنے اور قوت کو مضبوط کرنے کا حکم دیا۔ چناں چہ فرمایا:

﴿وَ أَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ

لَاتَعۡلَمُوۡنَهُمۡ اَللّٰهُ يَعۡلَمُهُمۡ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَيۡءٍ فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ﴿ (الأنفال: ٦٠)

(اور ان کے مقابلے کے لیے تم سے جس قدر ہو سکے، سامان قوت اور پلے ہوئے گھوڑوں کو تیار رکھو، جس سے تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر رعب رکھ سکو اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی، جن کو تم نہیں جانتے، اللہ ان کو جانتا ہے اور اللہ کے راستے میں تم جو بھی خرچ کرو، اس کا پورا پورا اجر تم کو دے گا اور تم پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔)

اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے بچ کر نکلنے کے لیے راتوں رات مصر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ (الدخان: ۲۳)

اور حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کا حکم دیا۔ (هود: ۳۷)

اور حدیثوں میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار سے بچنے کے لیے ہجرت کے وقت تین دن تک غارِ ثور میں روپوشی اختیار کی۔ ایک دیہاتی نے اپنا اونٹ بغیر باندھے چھوڑ کر جب کہا کہ میں نے اللہ پر توکل کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو باندھو پھر توکل کرو۔ آپ نے متعدد مواقع پر دوا استعمال کی اور پرہیز بھی کیا؛ نیز آپ نے اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے جہاد کے لیے افرادی قوت کو جمع کیا اور ہتھیار وغیرہ کے ذریعے بھی تیاری فرمائی۔

یہ سب کیا اسباب نہیں تھے؟ اور کیا آپ نے ان کو اختیار نہیں کیا اور کیا ان کے اختیار کرنے کی تعلیم نہیں دی؟ معلوم ہوا کہ اسباب کا اختیار کرنا، نہ خلافِ توکل ہے اور نہ خلافِ سنت۔ لہٰذا جو لوگ اسباب کو مطلقاً ترک کرنے کی تعلیم دیتے ہیں، وہ غلو فی الدین کا شکار ہیں۔

اسباب کی قسمیں اور احکام

ہاں! اسباب میں کچھ تفصیل ہے، ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے احکام کو دیکھنا چاہیے۔

علما نے لکھا ہے کہ ان کی تین قسمیں ہیں اور ہر ایک کا حکم بھی الگ ہے: ایک اسبابِ قطعیہ۔ دوسرے: اسبابِ ظنیہ اور تیسرے اسبابِ وہمیہ۔

''فتاویٰ ہندیہ'' میں ہے:

" اعلم بأن الأسباب المزيلة للضرر تنقسم إلى مقطوع به كالماء المزيل لضرر العطش ، والخبز المزيل لضرر الجوع ، و إلى مظنون كالفصد ، والحجامة ، وشرب المسهل وسائر أبواب الطب..........وإلى موهوم كالكي والرقية ، أما المقطوع به فليس تركه من التوكل بل تركه حرام عند خوف الموت ، وأما الموهوم فشرط التوكل تركه إذ وصف به رسول الله - صلى الله عليه وسلم - المتوكلين . وأما الدرجة المتوسطة ، وهي المظنونة كالمداواة بالأسباب الظاهرة عند الأطباء ففعله ليس مناقضا للتوكل بخلاف الموهوم ، و تركه ليس بمحظور بخلاف المقطوع به ، بل يكون أفضل من فعله في بعض الأحوال ، و في حق بعض الأشخاص فهو على درجة بين الدرجتين . "(۱)

---

(۱) الفتاوى الهندية:۳۵۵/۵

اس کی تفصیل اپنے الفاظ میں یہاں پیش کی جاتی ہے:

اسباب قطعية: وہ اسباب ہیں، جو عادۃً مسبب کے مرتب ہونے کے لیے لازم وضروری اور عموماً ان کے اختیار کرنے سے مسبب کا ترتب بھی یقینی ہوتا ہے، یعنی اگر یہ اسباب نہ اختیار کیے جائیں، تو مسبب کا وجود نہ ہو اور اگر اختیار کیے جائیں تو ضرور ان کا وجود ہو جائے۔ ایسے اسباب وتدابیر کا حکم یہ ہے کہ ان کا ترک کرنا جائز نہیں؛ بل کہ ان کا اختیار کرنا لازم وضروری ہے۔ ان اسباب کی مثال میں بھوک لگنے پر کھانا کھانے اور پیاس لگنے پر پانی پینے سے دی جاسکتی ہے کہ اگر کسی کو بھوگ لگے، تو عادۃ اللہ یہی ہے کہ کھانا کھانا ہوگا اور پیاس لگے، تو پانی پینا ہوگا اور جب وہ کھانا کھائے گا اور پانی پیے گا، تو ضرور بھوک و پیاس ختم ہو جائے گی؛ لہٰذا ان اسباب کو ترک کرنا گناہ ہے اور اگر ان کو ترک کرنے کی وجہ سے موت ہو جائے، تو وہ خودکشی کا مرتکب شمار ہوگا۔

اسباب ظنية: ان اسباب کا نام ہے، جن پر مسبب کا حاصل ہونا یا پایا جانا یقینی نہ ہو؛ لیکن اکثر احوال میں ہو جاتا ہے، اس قسم کے اسباب کا ترک کر دینا جائز ہے؛ لیکن سنت اس میں یہ ہے کہ ان کو اختیار کیا جائے۔ اس کی مثال بیماری کو دور کرنے کے لیے دوا و علاج کرنا اور دشمن کے مقابلے کے لیے ہتھیار کا استعمال کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ بیماری کے دور کرنے میں دوا اثر انداز تو ہے؛ لیکن صرف اکثر مواقع پر مؤثر ہے اور بہت سے موقعوں پر اس کے خلاف بھی ہوتا رہتا ہے کہ آدمی بیماری کے دور کرنے علاج و معالجہ کراتا اور دوا کھاتا ہے؛ مگر دوا اثر نہیں کرتی اور علاج الٹا اثر کرنے لگتا ہے، اسی طرح دشمن کو زیر کرنے ہتھیار و آلات استعمال کرنے پر اکثر تو یہی ہوتا ہے کہ وہ زیر ہو جاتا ہے؛ مگر بسا اوقات اس کے خلاف بھی ہوتا ہے؛ لہٰذا بیماری میں علاج نہ کرنا اور اللہ کے بھروسے دشمن کا مقابلہ نہ کرنا جائز ہے؛ مگر

چوں کہ سنتِ رسول ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے خود علاج کیا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی اس کا حکم دیا اور کفار و مشرکین کے مقابلے کے لیے آپ نے حسبِ حیثیت ہتھیار و آلات کو جمع کیا اور ان کو استعمال کیا و کرایا؛ لہٰذا ان اسباب کا اختیار کرنا سنت ہوگا، اگر چہ ترک بھی جائز ہے۔

اسباب وھمیۃ: اور یہ وہ اسباب ہیں، جن پر مسبب کا حاصل ہونا اور پایا جانا ایک وہم کی درجے کی بات ہو کہ اتفاق ہوگیا، تو ہوگیا؛ ورنہ عموماً ایسا نہ ہوتا ہو۔ اس قسم کے اسباب کا ترک کرنا لازم و ضروری ہے اور یہ اسباب خلافِ توکل ہیں، جیسے جلانے سے علاج کرنا یا منتر سے علاج کرنا۔

الغرض توکل مطلقاً اسباب کے ترک کرنے کا نام نہیں؛ بل کہ توکل تو اللہ پر بھروسہ کرنے کا نام ہے، خواہ وہ اسباب کے ساتھ ہو یا بغیر اسباب کے ہو؛ مگر اسباب کے ترک کرنے کا اصول وہ ہے، جو عرض کیا گیا۔

نوٹ: حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ نے اپنے خطبات میں اس مسئلے پر کلام کیا ہے، وہاں دیکھا جائے۔(۱)

وساوس وخطرات کی بیماری

دین میں تشدد کی ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ وساوس وخطرات کو حقیقت سمجھ کر پرہیز واحتیاط کرنے لگتے ہیں، جیسے پانی رکھا ہوا ہے، اس کے بارے میں وسوسہ ہوگیا کہ اس میں کوئی گندگی ہوگی، حال آں کہ اس میں گندگی پڑنے کی بہ ظاہر کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ بھی غلو فی الدین ہے اور اس سے بھی بچنا چاہیے۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایک بار رسول اللہ

---

(۱) خطباتِ حکیم الامت:۲۱/۸۰-۸۲

صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ایک سفر میں نکلے اور رات میں چلتے ہوئے ایک شخص کے پاس سے گزرے، جس کے پاس پانی کا حوض تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو آپ کے ساتھ تھے، انھوں نے اس شخص سے پوچھا کہ اے گھڑے والے! کیا اس حوض میں رات کسی درندے نے منہ تو نہیں ڈال دیا؟ (ان کا مطلب یہ تھا کہ اگر کسی درندے نے منہ ڈال دیا ہو تو کہیں یہ پانی وضو کے قابل نہ رہا ہو) یہ سن کر اللہ کے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: اے گھڑے والے! یہ بات ان کو نہ بتانا، یہ تکلف ہے۔(۱)

الغرض تشدد و تعمق اسلام میں ناپسندیدہ امر ہے اور دین میں غلو کی ایک صورت ہے، اس سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔

تنبیہِ ضروری

یہاں ایک بہت ہی اہم و ضروری بات پر تنبیہ کر دینا مناسب ہے، وہ یہ کہ ان احادیث و علما کے بیانات میں جو تشدد و تعمق کو ناجائز قرار دیا گیا ہے، اس کا یہ مقصد نہیں کہ ہم دین میں من مانی کرتے ہوئے کسی بھی چیز کو سخت و شدید کہہ کر چھوڑ دیں اور یوں کہہ دیں کہ دین تو آسان ہے، دین میں کوئی سختی نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک طبقہ ان ہی حوالوں کو پیش کر کے نماز و روزے سے بھی دور ہو جاتا ہے اور تقوی و پرہیز گاری کو بھی تشدد قرار دے کر گناہوں و بدکاریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور بعض لوگ معمولی معمولی بہانوں سے دین کے فرائض و احکام کو یہ کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں کہ دین میں سختی نہیں ہے۔ یہ سب باتیں دراصل مقصد و منشائے کلام کو نہ سمجھنے اور دینی امور سے غفلت کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہیں؛ لہٰذا یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ایک تو دین و شریعت کے احکام اور ان کے ادا کرنے اور انجام دینے کے طریقے و اصول و ضوابط ہیں، یہ تو

(۱) الدار قطني: ۱/ ۲۶

ہمارے اوپر لاگو کیے گئے ہیں، ان میں ہم نہ تو ردو بدل کر سکتے ہیں، نہ کمی بیشی؛ لہٰذا ان کوتو بلا کسی تغیر وتبدیلی کے ادا کرنا لازم ہے۔ ان میں ہمیں اختیار نہیں کہ ہم کسی کو لیں اور کسی کو چھوڑ دیں؛ کیوں کہ دین تو خود اللہ نے آسان بنایا ہے اور حقیقت کے لحاظ سے دیکھا جائے، تو اس کا ہر حکم آسان ہے، اس کا ہر قانون معقول ہے اور اس کا ہر طریقہ دل کو اپیل کرنے والا ہے؛ لہٰذا جو بات دین وشریعت میں ہے، اس میں سختی ہے ہی نہیں؛ اس لیے اس کو سخت کہنا ہی غلط وجائز نہیں۔

اور دوسرے یہ کہ جو چیز دین وشریعت میں نہیں ہے، اس کو ہم دین کہہ کر اختیار کرلیں اور اپنے اوپر سختی کریں، یہ منع ہے؛ اس لیے کہ یہ دین ہی نہیں ہے، خلافِ دین ہے۔

لہذا یہاں جس تشدد کو ممنوع کہا گیا ہے، اس سے مراد ہمارا اپنا تراشیدہ طریقہ ہے، جیسا کہ راہبوں نے یا جاہل وغالی صوفیوں نے کیا تھا یا کرتے ہیں۔

ایک لطیفہ

یہاں ایک لطیفہ عرض کردوں کہ ایک مرتبہ ایک فقہی سمینار میں شرکت کر کے میری واپسی بہ ذریعے ٹرین ہو رہی تھی، ٹرین میں نماز کا وقت ہوا، تو میں اور میرے ساتھی نماز کی تیاری کرنے لگے اور قبلے کا رخ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے، وہاں ایک مولانا بھی تشریف رکھتے تھے، وہ کہنے لگے کہ ”کیا ضروت ہے قبلہ معلوم کرنے کی؟ آپ لوگ بس جدھر جی چاہے پڑھ لیجیے؛ کیوں کہ شریعت میں اتنا تشدد نہیں ہے۔“ دیکھیے! صرف قبلہ معلوم کرنے کو بھی تشدد قرار دے کر، اس کو بھی حذف کردینا چاہتے ہیں۔ یہ بات صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ ہمیں اتنا تو مکلّف کیا گیا ہے کہ ہم جس قدر معلوم کرسکتے ہیں، معلوم کریں، اس کو تشدد سمجھنا بھی ایک قسم کا غلو ہی

ہے۔ یہاں ہم نے اسی قسم کی ذہنیت کو پیشِ نظر رکھ کر یہ تنبیہ کی ہے۔

الہام وکشف وخواب سے استدلال

غلو فی الدین کی ایک بڑی صورت یہ ہوتی ہے کہ شرعی دلیل کے بہ جائے، استدلال ان اموروباتوں سے کیا جاتا ہے، جوشرعی دلیل نہیں ہیں۔

جیسے بعض لوگ خوابوں کو دلیل بنالیتے ہیں، اور کچھ لوگ الہام کو حجت قرار دیتے ہیں اور کوئی کشف سے دلیل لینے کی کوشش کرتا ہے، کوئی اپنے بزرگوں و بڑوں کے عمل سے مسئلہ اخذ کرتا ہے اور ان چیزوں سے وہ معاملہ کیا جاتا ہے، جو دلیلِ شرعی سے ہوا کرتا ہے، حال آں کہ یہ امور شرعی دلائل نہیں ہیں۔

دلائلِ شرعیہ چار ہیں

یاد رکھنا چاہیے کہ شرعی دلیل چار چیزوں میں سے ایک ہوسکتی ہے: قرآن، حدیث، اجماعِ امت اور قیاس۔ جو بات ان دلائلِ اربعہ سے ثابت ہو، وہ قابلِ اعتبار ہوتی ہے اور جو چیز ان سے ثابت نہ ہو، وہ شرعاً قابلِ لحاظ و لائقِ اعتبار نہیں ہوا کرتی۔

باقی غیر نبی کا خواب و الہام، کشف اور عملِ بزرگان علی الاطلاق حجت و دلیل شرعی نہیں ہے؛ بل کہ اس میں شرط یہ ہے کہ یہ دلائلِ شرعیہ کے موافق ہو یا کم از کم خلافِ شریعت نہ ہو۔

مگر اس کو کیا کہیے کہ مختلف طبقات نے محض تعصّبات سے یا جہالت سے ان چیزوں کو بھی شرعی دلیل کا مقام دے دیا ہے اور جب کوئی بات ان کی خلافِ شرع سامنے آئے اور ان سے دلیل کا مطالبہ کیا جائے، تو وہ ان چیزوں میں سے کوئی چیز بہ طورِ دلیل بیان کرتے ہیں؛ حال آں کہ یہ چیزیں علی الاطلاق دلیل بننے کی صلاحیت

ہی نہیں رکھتیں۔

''الہام'' حجتِ شرعیہ نہیں

امام ابن الہمام رَحِمَہُ اللّٰہُ نے '' التحریر'' میں، نیز اس کے شارحین جیسے علامہ ابن امیر الحاج رَحِمَہُ اللّٰہُ وغیرہ نے اس کی شروحات میں لکھا ہے کہ'' الہام'' کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ یہ حجت ہے اور یہ بعض صوفیہ اور رافضیوں کے ایک گروہ ''جعفریہ'' کی جانب منسوب ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ'' الہام'' خود صاحبِ الہام کے حق میں تو حجت ہے،؛ لیکن دوسروں پر حجت نہیں ؛ لیکن مختار و پسندیدہ قول یہ ہے کہ'' الہام'' نہ خود صاحبِ الہام پر حجت ہے اور نہ دوسروں پر ؛ کیوں کہ اس کا اللہ کی جانب سے ہونا یقینی طور پر معلوم نہیں۔(۱)

علامہ ابن تیمیہ رَحِمَہُ اللّٰہُ نے فرمایا:

''جو لوگ ''الہام'' کے علی الاطلاق حجت ہونے کا انکار کرتے ہیں، وہ خطا پر ہیں جیسے وہ لوگ بھی خطا پر ہیں، جو'' الہام'' کو علی الاطلاق حجت کہتے ہیں..............لیکن یہاں یہ بیان کرنا مقصد نہیں کہ تنہا'' الہام'' احکامِ شرعیہ کے لیے حجت ہے، بل کہ یہ'' الہام'' ایک طالبِ حق کے لیے دلائلِ شرعیہ میں اختلاف کی صورت میں ایک جانب کو ترجیح دینے کا فائدہ دے سکتا ہے۔''(۲)

نیز آپ نے '' درء تعارض العقل والنقل'' میں لکھا ہے:

''رہا'' الہام'' سے احکام پر استدلال کرنے کا مسئلہ: تو یہ ایک دوسرا

---

(۱) التقریر والتحریر:۳/۳۹۳،تیسیر التحریر:۴/۲۶۹

(۲) خلاصہ از مجموعۃ الفتاوی:۱۰/۴۷۳-۴۷۷

مسئلہ ہے............اور کلام اس ''الہام'' میں نہیں ہے، جس کا فاسد ہونا دلیلِ حسی یا عقلی یا شرعی کے خلاف ہونے کی وجہ سے معلوم ہے؛ کیوں کہ یہ ''الہام'' تو باطل ہے؛ بل کہ کلام اس ''الہام'' کے بارے میں ہے، جو ان دلائل کے موافق ہے، ان کے خلاف نہیں ہے۔'' (۱)

''خواب'' حجتِ شرعیہ نہیں

اسی طرح ''خواب'' بھی کوئی شرعی حجت نہیں ہے، علامہ القرافی المالکی رحمہ اللہ نے '' أنوار البروق '' میں لکھا ہے:

''خواب کے سچا ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس پر شرعی احکام میں بھی بھروسہ کیا جائے؛ کیوں کہ خواب دیکھنے والے کے یاد نہ رکھنے یا ٹھیک طور پر اخذ نہ کرنے کا احتمال موجود ہے۔'' (۲)

اسی طرح علامہ زرکشی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

'' والصحيح أن المنام لا يثبت حكما شرعيا، ولا بينة، و إن كانت رويا النبي - صلى الله عليه وسلم - حقا، والشيطان لا يتمثل به، ولكن النائم ليس من أهل التحمل، والرواية لعدم تحفظه.'' (۳)

(صحیح یہ ہے کہ خواب نہ کوئی حکم شرعی ثابت کرسکتا ہے اور نہ کوئی گواہ بن سکتا ہے، اگر چہ کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنا حق ہے اور شیطان آپ کی صورت اختیار نہیں کرسکتا؛ لیکن بات یہ

---

(۱) درء تعارض العقل والنقل: ۱۲۱/۴

(۲) أنوار البروق: ۳۹۴/۸

(۳) البحر المحيط: ۴۰۴/۴

ہے کہ سونے والا آدمی تحفظ نہ ہونے کی وجہ سے حدیث وروایت کو لینے
اور اس کو روایت کرنے کا اہل نہیں ہے۔)

خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص خواب میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں کوئی بات فرمائیں، تو اس سے کوئی شرعی حکم ثابت نہیں ہوتا اور نہ اس سے کوئی گواہی ثابت ہو سکتی ہے، وجہ یہ ہے کہ آپ کو خواب میں دیکھنا، تو حق ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ آپ کی شکل وصورت میں شیطان نہیں آسکتا؛ مگر یہ خواب اس لیے حجت و دلیل نہیں بن سکتا کہ خواب دیکھنے والا تو سو رہا ہے اور اس کے عقل و سمجھ کا محفوظ ہونا یقینی نہیں؛ اس لیے وہ آپ کی حدیث لینے اور روایت کرنے کا اہل نہیں ہے؛ لہٰذا خواب سے کوئی شرعی حکم ثابت نہیں ہو سکتا۔

ان حضرات نے یہ جو لکھا ہے، یہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کے بارے میں ہے اور اگر کوئی کسی اور کو دیکھے، تو اس کا ناقابلِ اعتبار ہونا واضح ہے۔

عظیم صوفی و بزرگ اور سلسلۂ نقشبندیہ کے جلیل القدر رہبر حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

> "احکامِ شرعیہ کے اثبات میں صرف کتاب وسنت ہی کا اعتبار ہے اور مجتہدوں کا قیاس اور اجماعِ امت بھی حقیقت میں مثبت احکام ہیں، ان چار شرعی دلیلوں کے سوا اور کوئی دلیل ایسی نہیں، جو احکام شریعت کو ثابت کر سکے۔ "الہام" کسی چیز کی حلت وحرمت کو ثابت نہیں کرتا اور اربابِ باطن کا کشف بھی کسی چیز کے فرض یا سنت ہونے کا اثبات نہیں کرتا، احکامِ اجتہادیہ میں مجتہدین کی تقلید کے سلسلے میں ولایتِ خاصہ والے اور عام مومنین برابر ہیں، حضرت ذوالنون، حضرت

بسطامی، حضرت جنید اور حضرت شبلی رحمهم اللہ احکامِ اجتہادیہ میں عام مؤمنین زید وعمرو وبکر اور خالد وغیرہ کے ساتھ مجتہدین کی تقلید میں مساوی ہیں۔"(۱)

الغرض کسی شرعی حکم وشرعی امر کے ثبوت کے لیے چار شرعی دلیلوں: قرآن، حدیث، اجماع وقیاس، میں سے کوئی پیش کرنا چاہیے، "کشف والہام" یا کسی بڑے کا قول وفعل کافی نہیں اور اگر وہ خلافِ شریعت ہو اور شرعی اصولوں وضوابط سے ٹکراتا ہو، تو کسی حال ان کو دلیل بنانے کی گنجائش نہیں۔

الغرض اس وقت امت کے اندر بگاڑ کا ایک اہم و بنیادی سبب غلو فی الدین کی یہ صورتیں وشکلیں ہیں۔

---

(۱) مکتوبات: دفتر دوم: مکتوب: ۵۵

خاتمہ

تنبیہات

ہر غلو کا حکم ایک نہیں ہے

غلو کی بیماری کا علاج

خاتمہ

تنبیہات

ہر غلو کا حکم ایک نہیں ہے

جب غلو کی یہ تفصیلات علم میں آ گئیں، تو اب سوال یہ ہے کہ غلو کا شرعاً کیا حکم ہے؟

اوپر جہاں ہم نے قرآن وحدیث سے ''غلو فی الدین'' کی مذمت و برائی بیان و ثابت کی تھی، اسی سے یہ بات بلاتردد آشکارا ہوگئی کہ ''غلو فی الدین'' اسلامی نقطۂ نظر سے انتہائی مذموم و بری بات ہے اور امت کے حق میں ایک رِستے ہوئے ناسور سے کچھ بھی کم نہیں اور اسی لیے اس سے منع بھی کیا گیا ہے اور اس پر سختی سے نکیر بھی کی گئی ہے؛ مگر یہاں ایک بات یہ سمجھ لینا چاہیے کہ غلو کی مختلف صورتوں کی وجہ سے سب کا حکم یکساں نہیں ہے، بعض غلو کفر تک پہنچا ہوا ہے، بعض فسق و گناہ ہے، پھر گناہ میں بھی بعض کا درجہ بعض سے الگ ہے۔ جیسا کہ اوپر کی تفصیلات کو بہ غور دیکھنے والے اس کو بہ آسانی جان سکتے ہیں۔

مثلاً غلو کی یہ صورت کہ نبی یا ولی کو خدا کے درجے تک پہنچا دینا، صریح طور پر کفر و شرک ہے، اسی طرح غلو میں نبیوں کے درجہ کو گھٹانا بھی واضح طور پر کفر ہے اور اگر اس درجے کا غلو نہ ہو، تو وہ کفر تو نہیں ہوگا؛ لیکن فسق و گناہ ہے، پھر اس میں بھی کوئی بڑے درجے کا فسق و گناہ ہے، تو کوئی اس سے کم درجے کا فسق و گناہ ہے۔

لہٰذا ہر غلو کا حکم الگ الگ ہوگا، ایک نہیں ہوگا؛ اس لیے اس سلسلے میں احتیاط رکھنا چاہیے کہ ہر غلو کو ایک درجہ کا نہ سمجھ لیا جائے، ورنہ یہ خود بھی ایک غلو ہو جائے گا۔

غلو کی بیماری کا علاج

اب آخری بحث یہ ہے کہ ''غلو فی الدین'' کی اس خطرناک روحانی بیماری اور امتِ اسلامیہ کے لیے ایک ناسور کی حیثیت رکھنے والے شدید مرض کا علاج اور تدارک کیا ہے؟

اس کے جواب کے طور پر عرض ہے کہ ہم نے اوپر غلو فی الدین کے جو اسباب و بواعث بیان کیے ہیں، وہ کل چھے ہیں: (۱) جہالت (۲) قلتِ تفقہ وعدم رسوخ فی العلم (۳) تعصب (۴) اتباعِ ہویٰ یعنی خواہشات کا اتباع (۵) تقلیدِ آبا و عادات (۶) عقل پرستی و اتباعِ ظن ۔ان اسباب کو ختم کرنے کی کوشش ہی اس کا علاج و تدارک ہے۔

اور یہ اہلِ علم واہلِ استقامت حضرات کا کام وذمے داری ہے؛ کیوں کہ حدیث میں ارشادِ نبوی ہے :

'' يَحمِلُ هَذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهُ يَنفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ وَ تَأْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ وَ انْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ.''

(اس علم دین کو ہر بعد کے لوگوں میں سے قابلِ اعتبار لوگ اٹھائیں گے، اس حال میں کہ وہ غلو کرنے والوں کی تحریف اور جاہلین کی تاویل اور باطل پرستوں کے دعوے کی نفی کرتے ہوں گے۔)(۱)

اس میں اہلِ علم کی تین اہم ذمے داریوں اور کاموں کی جانب اشارہ ہے اور ان میں سے ایک یہ بھی فرمایا: ''يَنفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ''(غالی لوگوں کی

---

(۱) مسند بزار:۹۴۲۳، مشكل الآثار للطحاوي:۳۸۸۴، مسند الشاميين: ۵۹۹،الأحكام الشرعية للأشبيلي:۳۴۲/۱

تحریف کا پردہ چاک کرنا) ''غالی'' سے مراد وہ لوگ ہیں، جو دین میں غلو کرتے ہوئے اپنے غلو پر قرآن وسنت سے دلیل لانے کی بے جا کوشش کرتے ہیں اور اپنے مقصد ومنشا کو ثابت کرنے کے لیے قرآن وسنت میں تحریف سے کام لیتے ہیں؛ لہٰذا اہلِ علم حضرات کا کام یہ ہے کہ وہ ان غالیوں و بدعتیوں کی ان تحریفات کا پردہ چاک کریں اور غلو پسند طبیعتوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش و محنت کریں اور یہ محنت ان اسباب کے ختم یا دور کرنے کے لیے ہوگی؛ تاکہ اسباب ختم ہو جائیں، تو ان اسباب سے پیدا ہونے والا غلو بھی ختم یا کم ہو جائے۔

مثلاً جہالت :غلو کا ایک اہم سبب ہے؛ لہٰذا امت میں علمِ دین کو عام کرنے کی فکر کی جانی چاہیے۔ اگر صحیح علم لوگوں میں آجائے، تو وہ خود غلو سے بچیں گے اور اگر دوسرے کی جانب سے غلو سامنے آئے، تو وہ اس کی اصلاح کر سکیں گے، یا کم از کم وہ خود اس غلو میں مبتلا نہ ہوں گے۔

اسی طرح دوسرا سبب غلو کا، عدم تفقہ و کم علمی بیان کیا گیا تھا؛ لہٰذا جو لوگ تفقہ کی کمی وعلم کی قلت کے باوجود دین میں رائے زنی کرتے ہیں، امت ان کو اس بات سے روک دے، یا ان کی جانب کان نہ دھرے۔

تیسرا سبب اتباعِ ہوی اور لذات وخواہشات کی پیروی ہے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ایسے لوگ دین میں رائے نہ دیں، جو اس بیماری میں مبتلا ہیں۔

اسی طرح تعصب سے دور رہنے اور احتراز کرنے کی کوشش ہونی چاہیے؛ تاکہ یہ غلو والی بات ہم میں نہ پیدا ہو۔

اسی طرح عقل پرستی کے بہ جائے لوگ دین وشریعت کا اتباع کرنے لگیں اور اپنی عقل کو اس کے دائرۂ کار تک محدود رکھیں، تو غلو کا یہ دروازہ بند ہو جائے گا۔

نیز تقلیدِ آبا کے بہ جائے اللہ کے دین کو ترجیح دیں اور جاہلین کی اقتدا و تقلید کو وبالِ جان سمجھیں، تقلید اہلِ دین و تقوی کی کریں۔

اگر اس طرح یہ اسباب ختم ہوں گے؛ تو غلو کے دروازے و راستے بند ہو جائیں گے اور غلو ختم یا کم ہو جائے گا۔ آمین، یا رب العالمین!!

فقط

محمد شعیب اللہ خان